۷۸۶

ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی

سوانح اقدس حضرت سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد پنجم

مشتمل بر منصب نبوت حصہ عبادات

جس میں پہلے عبادات کا مفہوم بتایا گیا ہے پھر نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر وغیرہ بدنی، مالی و قلبی عبادات کی تشریح اور ان کے احکام و مصالح کی توضیح کی گئی ہے

(تالیف)

(مولانا) سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد (پاکستان)

جملہ حقوق برائے پاکستان محفوظ بہ نیشنل بک فاؤنڈیشن

کوڈ نمبر آر-پی / ڈی ایم پی / آئی ۔ ۱۲۰ / ۳۷۹ / ۲۰۰۰
کاپی رائٹ ایکٹ جاری کردہ ۱۹۷۲ء کے تحت
نیشنل بک فاؤنڈ کی ذمہ داری پر
نظامی پرنٹرز ۱۸ ریٹیگن روڈ لاہور سے طبع ہوئی

فہرست مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد پنجم

مضمون	صفحہ
دیباچہ ۱ - ۵	
عمل صالح	۱-۷
ایمان کے بعد عمل صالح کی اہمیت	۱-۶
اعمال صالحہ کی قسمیں ،	۷
عبادات ،	،،
اخلاق ،	،،
معاملات ،	،،
عبادات ۸-۳۷	
اسلام اور عبادت ،	۸
اسلامی عبادات کی خصوصیات	۱۰
صرف ایک خدا کی عبادت	۱۴
خارجی رسوم کا وجود نہیں ،	۱۵
درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں ،	،،
خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں ،	۱۶
مکان کی قید نہیں ،	،،
انسانی قربانی کی ممانعت ،	۱۷
حیوانی قربانی میں اصلاح ،	،،
مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت	۱۹
تجرد، ترک لذائذ، ریاضات و تکالیف شاقہ عبادت نہیں ،	۲۰
عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں	۲۶
اسلام میں عبادت کا وسیع مفہوم	۲۸
عبادات چہارگانہ اعمال چہارگانہ کا عنوان ہیں ،	۳۶
نماز ۳۸ سے ۱۴۷	
توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم ،	۴۴
اسلام میں نماز کا مرتبہ ،	۴۶
نماز کی حقیقت	۴۸
نماز کی روحانی غرض و غایت ،	۵۰
نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت ،	۵۳
ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے ،	۵۵
نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے	،،
نماز میں نظام وحدت کا اصول ،	۵۶
نماز میں جسمانی حرکات	۵۷
ارکان نماز ،	۵۸
قیام ،	۵۹
رکوع ،	،،
سجدہ ،	۵۹
نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے	۶۴
نماز کی دعا ،	۶۵
ان دعائے محمدی کا موازنہ دوسرے انبیاء کی منصوص دعاؤں سے ،	۷۰
حضرت موسیٰ کی نماز کی دعا ،	،،
زبور میں حضرت داؤد کی نماز کی دعا	۷۱
انجیل میں نماز کی دعا ،	۷۳
نماز کیلئے تعیین اوقات کی ضرورت	۷۴
نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں	۷۵
نماز کیلئے مناسب فطری اوقات ،	۷۷
اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ ،	۷۹
اسلام میں طریق و اوقات نماز ،	۸۰
نمازوں کی پابندی و نگرانی ،	۸۱
نماز کے اوقات مقرر ہیں ،	۸۲
وہ اوقات کیا ہیں ،	،،
اوقات کی تکمیل ،	۸۶-۹۱
نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل ،	۸۶
ایک نکتہ	۹۱
جمع بین الصلوٰتین	۹۱

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
اوقات پنجگانہ اور آیت اسراء	۹۲	خدا کا خوف،	۱۳۰	انفاق،	۱۶۱
دلوک کی تحقیق،	۹۳	ہشیاری،	،،	زکوٰۃ،	،،
اوقات نماز کا ایک اور راز	۹۵	مسلمانوں کا امتیازی نشان	۱۳۱	نکتہ،	۱۶۳
اوقات پنجگانہ کی ایک اور آیت،	۹۸	جنگ کی تصویر	۱۳۲	جانوروں پر زکوٰۃ	۱۶۵
اطراف النہار کی تحقیق،	،،	دائم حضور اور بیداری،	۱۳۳	نصاب مال کی تعیین،	۱۶۶
ایک اور طریقہ ثبوت،	۹۹	الفت و محبت،	۱۳۴	زکوٰۃ کے مصارف دوراں میں	۱۶۹
نماز پنجگانہ اوقات ثلثہ و خمسہ میں	۱۰۰	غمخواری،	،،	اصلاحات،	
تہجد پہلے نفل ہوگئی پھر کیوں،	۱۰۲	اجتماعیت،	۱۳۵	دو مصرفوں میں ترجیح،	۱۷۳
نقشہ،	۱۰۳	کاموں کی تنویع،	۱۳۶	اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشتگانہ	۱۷۵
رکعتوں کی تعداد،	۱۱۳	تربیت،	،،	مسکینوں، فقیروں اور معذوروں	۱۷۵
نماز کے آداب باطنی،	۱۱۶	نظم جماعت،	۱۳۵	کی امداد،	
اقامت صلوٰۃ،	،،	مساوات،	،،	غلامی کا انسداد،	،،
قنوت،	،،	مرکزی اطاعت،	۱۳۸	مسافر،	،،
خشوع،	۱۱۷	معیار فضیلت	۱۳۹	جماعتی کاموں کے اخراجات کی صورت	۱۷۹
خشیت،	،،	روزانہ کی مجلس عمومی	،،	زکوٰۃ کے مقاصد فوائد اور مصالح	،،
تضرع،	۱۱۸	روح کی روحانی کایا پلٹ،	۱۴۰	تزکیۂ نفس،	۱۸۰
اخلاص،	۱۱۹	**زکوٰۃ**		باہمی اعانت کی عملی تدبیر،	۱۸۳
ذکر	،،	۱۴۸ - ۲۰۹		دولتمندی کی بیماریوں کا علاج،	۱۸۵
فہم و تدبر،	،،	زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم،	۱۴۸	اشتراکیت کا علاج،	۱۹۳
نماز کے اخلاقی تمدنی اور معاشرتی فائدے	۱۲۵	زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں،	،،	اقتصادی اور تجارتی فائدے	۱۹۵
ستر پوشی،	۱۲۵	اسلام کی اس راہ میں تکمیل،	۱۵۱	فقراء کی اصلاح،	۱۹۷
طہارت،	۱۲۶	اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت،	،،	صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصۃً لوجہ اللہ	۲۰۱
صفائی،	۱۲۷	زکوٰۃ کا آغاز اور مدینہ میں تکمیل،	۱۵۴	ادا کیا جائے،	
پابندی وقت،	۱۲۹	زکوٰۃ کی مدت کی تعیین	۱۵۹	صدقہ چھپا کر دیا جائے،	۲۰۳
صبح خیزی،	،،	زکوٰۃ کی مقدار،	۱۶۰	بلند ہمتی اور عالی خیالی،	۲۰۴

مضمون	صفحہ
فقراء اور مساکین کی اخلاقی اصلاح،	۲۰۵
روزہ ۲۱۰ - ۲۴۱	
روزہ کا مفہوم،	۲۱۰
روزہ کی ابتدائی تاریخ:	۲۱۰
روزہ کی مذہبی تاریخ	۲۱۱
روزہ کی حقیقت،	۲۱۳
رمضان کی اہمیت،	۲۱۶
فرضیت صیام کا مناسب موقع	۲۱۹
سنہ ۲ھ،	
ایام روزہ کی تحدید،	۲۲۰
ایک نکتہ،	۲۲۳
روزہ پر اعتراض اور اسکا جواب	۲۲۵
روزہ میں اصلاحات،	۲۲۶
روزہ کے مقاصد	۲۳۱
حاملِ قرآن کی پیروی،	۲۳۲
شکریہ،	،،
تقویٰ،	۲۳۳
حج ۲۴۲ - ۲۹۸	
مکہ	۲۴۲
بیت اللہ،	۲۴۴
حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی اور اسکے شرائط،	۲۴۶
ملت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے	،،

مضمون	صفحہ
اسلام قربانی ہے،	۲۴۰
یہ قربانی کہاں ہوئی،	۲۴۹
مکہ اور کعبہ،	۲۵۱
حج ابراہیمی یادگار ہے،	۲۵۵
حج کی حقیقت،	۲۶۰
حج کی اصلاحات،	۲۶۳
حج کے ارکان،	۲۶۹
احرام،	۲۶۹
طواف،	،،
حجر اسود کا استلام	۲۷۰
صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا	۲۷۱
وقوف عرفہ،	۲۷۳
قیام مزدلفہ،	۲۷۳
منیٰ کا قیام،	،،
قربانی،	۲۷۴
حلق راس	،،
رمی جمار،	۲۷۵
ان رسوم کی غایت،	۲۷۶
حج کے آداب،	۲۷۷
حج کی مصلحتیں اور حکمتیں،	۲۷۸
مرکزیت،	۲۸۱
رزق ثمرات،	۲۸۲
قربانی کی اقتصادی حیثیت،	۲۸۶
ابراہیمی دعا کی مقبولیت،	۲۸۸
تجارت،	،،

مضمون	صفحہ
روحانیت،	۲۸۹
تاریخیت،	۲۹۱
خالص روحانیت،	۲۹۲
حج مبرور،	۲۹۳
جہاد ۲۹۹ - ۳۰۹	
لفظ جہاد کی تشریح	۲۹۹
جہاد کی قسمیں،	۳۰۲
جہاد اکبر،	،،
جہاد بالعلم	۳۰۳
جہاد بالمال،	۳۰۵
ہر نیک کام جہاد ہے،	۳۰۶
جہاد بالنفس،	۳۰۷
دائمی جہاد،	۳۰۹
عبادات قلبی ۳۱۰ - ۳۶۷	
تقویٰ،	۳۱۱
اخلاص،	،،
توکل	،،
صبر،	،،
شکر،	،،
تقویٰ ۳۱۱ - ۳۱۹	

مضمون	صفحہ
تقوی سارے اسلامی احکام کی غایت ہے،	۳۱۱
اہل تقوی تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں،	۳۱۳
کامیابی اہل تقوی کے لئے ہے،	رر
اہل تقوی اللہ کے محبوب ہیں،	۳۱۴
معیت الٰہی سے سرفراز ہیں،	رر
قبولیت اہل تقوی ہی کو حاصل ہے	۳۱۵
تقوی والے کون ہیں،	رر
تقوی کی حقیقت کیا ہے؟	۳۱۶
اسلام میں برتری کا معیار،	۳۱۸

اخلاص
۳۲۰-۳۲۴

مضمون	صفحہ
اخلاص کا مفہوم اور تشریح،	۳۲۰

توکل
۳۲۵-۳۳۶

مضمون	صفحہ
توکل کے غلط معنی،	۳۲۵
توکل حقیقی معنی اور قرآنی تشریح	رر

صبر
۳۳۶-۳۵۵

مضمون	صفحہ
صبر کے لغوی معنی	۳۳۷
وقت مناسب کا انتظار کرنا،	۳۳۸
بے قرار نہ ہونا،	۳۴۰
مشکلات کو خاطر میں نہ لانا،	۳۴۱
درگذر کرنا،	۳۴۲
ثابت قدمی،	۳۴۴
ضبط نفس،	۳۴۹
ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا،	رر
صبر کے فضائل اور انعامات،	۳۵۲
فتح مشکلات کی کنجی، صبر اور دعا،	۳۵۴

شکر
۳۵۶-۳۶۷

مضمون	صفحہ
شکر کی تعریف،	۳۵۷
لفظ کفر کی تشریح	رر
شکر، اصل ایمان ہے،	۳۵۷
حمد،	۳۵۸
جسمانی نعمتوں کا شکریہ،	۳۶۰
مالی نعمتوں کا شکریہ احسان	۳۶۱
احسان کا شکریہ احسان ہے،	۳۶۲

ضمیمہ
۳۶۹-۳۷۶

مضمون	صفحہ
ارکان کی ترتیب،	۳۶۹
معذورین،	۳۷۱

خاتمہ
۳۷۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

دیباچہ

سیرۃ النبی صلعم کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۵۱ھ میں شائع ہوئی تھی، آج تین سال کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کیجارہی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گنہگار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسنِ قبول کے لیے کھول دیا ہے۔

موضوع اس جلد کا موضوع **عبادت** ہے، اس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ اقسام و انواع اور ان میں سے ہر ایک کی وہ مصلحت و حکمت اور اس باب میں گذشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذاتِ پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خطاکار قلم نے لکھی اور بیان کی ہے، اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستہ سے نہ ہٹے جو صراطِ مستقیم ہے، اور وہ سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ ہے، تاہم وہی کہتا ہوں جو بعض صحابہ اور اکابر نے (خدا ان سے راضی ہو) فرمایا کہ "جو بات کہی گئی ہے اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو نفسِ خطاکار کا قصور ہے"۔

ان جلدوں کا سیرت سے تعلق ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی

اور سیر کے واقعات سے نہیں، جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں، بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے۔ صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا، اور وہ کیا لایا تھا۔ سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں، اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔

اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا، ان زبانی بیانوں اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے، وہ خود اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:۔

چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آجائیں یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا، اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں ہوگا۔ گو لیا ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔ (بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۲۲ ء)

سیرۃ جلد اول کے مقدمہ میں انھوں نے ان حصوں کا عنوان **منصبِ نبوت** رکھا تھا اور لکھا تھا

دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاح اعمال اور اخلاق ہے، اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائض خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لیے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔" (جلد اول طبع اول ص ۲۲ و طبع دوم ص ۹)

گذشتہ چوتھی جلد، یہ پانچویں جلد اور آئندہ دو جلدیں درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل و تشریح ہیں، منصب نبوت، عرب کی گذشتہ حالت اور تعلیم عقائد چوتھی جلد کا موضوع تھی، اور فرائض خمسہ ان کی مصلحتیں اور حکمتیں اس جلد کا عنوان ہیں، اخلاق و معاشرت کے نکتوں کے لیے چھٹی جلد اور بقیہ اوامر و نواہی کے لیے

جو معاملات سے متعلق ہیں، ساتوین جلد ہوگی، ان مین سے ہر موضوع کی تفصیل و تشریح مین مصنف اول کے ایما کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر رہتی ہے، اُن کی مصلحتون اور حکمتون سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبون سے مناظرانہ پہلو کو بچا بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے، اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب مین کیا تعلیم پیش کی ہے، اور وہ کیونکر تمام عالم کی اصلاح کیلیے کافی ہے،

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ اُستادِ ازل گفت ہمان می گویم

حسنِ قبول: اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُس نے اس سلسلہ کو حُسنِ قبول کی سند عطا فرمائی

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا، مجھ سے فرمایا "یہ کتاب زبان قبول ہوگئی" آج مجھے اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوگئی، علاوہ اس کے کہ اسکی ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوچکے ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے مسلمانون مین اس کے ساتھ خاص شیفتگی اور عقیدت پیدا ہوگئی، ترکی میں اسکی تین جلدو کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا، فارسی میں اس کی چند جلدین کابل مین ترجمہ کی گئین، اور اب تک منتظر طبع ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی مین مکہ معظمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے،

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لیکر آج تک اُس زبان مین جس میں اس موضوع پر کوئی قابل توجہ کتاب نہ تھی چھوٹی بڑی سینکڑون کتابیں نئے نئے دعوون کے ساتھ اس کو سامنے رکھ رکھ کر لوگ لکھ رہے ہیں، اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان مین بحمد اللہ پیدا ہوگیا ہے، اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانون کا عام رجحان ہوگیا ہے،

امرائے اسلام کی امداد: اس کتاب کے حسن قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جو تجویز

شائع کیا، اس کی خدمت کے لیے لبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی جس کا ہر تارِ نفس محبتِ رسول صلعم کے دامن سے وابستہ تھا، یعنی ملتِ محمدی کی خادمہ اور اُمتِ محمدی کی مخدومہ تاج الہند نواب سلطان جہان بیگم سابق فرمانروائے کشورِ بھوپال (خدا اُن پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے) نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات پر خیال گذرا کہ شاید یہ توجہ ہمایونی باقی نہ رہے، مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا جو مرچکا، بلکہ اس خدا کے لیے تھا جس کو موت نہیں، اس لیے اپنی شاہانہ ماہوار امداد برابر جاری رکھی، مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا،

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت — کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقیدِ روایتہائے تاریخی — تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جن میں اک فقیرِ بینوا ہے ایک سلطاں ہے

جب اس فقیرِ بے نوا کی وفات ہوئی، تو سرکار عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ فقیرِ بینوا تو چل بسا اب سلطان کی باری ہے، آخر یہ سلطان بھی چل بسی، اور تالیف و تنقیدِ روایت کے ساتھ ساتھ "زرافشانی" کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہوگیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشیں یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت ایک ایسے جوان بخت کے سپرد کرگئیں، جس نے فرائضِ حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ اُن کے ناتمام کاموں کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھالیا، اور سیرۃ النبی صلعم کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی، سکندر صولت افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک و تعالیٰ برکت عطا فرمائے کہ اُن کے زیر سایہ اُمت و ملت کی سینکڑوں آرزوئیں پرورش پارہی ہیں، خلد اللہ ملکہٗ

سنہ ۱۹۱۸ء میں سیرت کی پہلی جلد جب چھپکر شائع ہوئی، تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلیحضرت آصفجاہ سابع مظفر الملک و الممالک نظام الدولہ نظام الملک سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہٗ کی پیشگاہِ خسروی میں پیش کیا، حضورِ ممدوح کو

اپنے مولیٰ و آقا حضرت سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، سید المرسلین، محبوبِ رب العٰلمین، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ علیہ الوف التحیات والصلوات کی ذاتِ قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہے، سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوئے، اور دوسری جلدوں کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دو دو برس کے لیے تین دفعہ اور تین برس کے لیے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے، جن سے پچھلے برسوں میں جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ میں پھنسا دیا تھا بیحد مدد ملی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز میں التجا ہے کہ وہ باقی جلدوں کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے، عمر کا رہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا، جو کچھ باقی ہے، دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر میں گذر جائے، اور آخر میں خوش قسمت سعدی کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے۔

منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر　　ما ہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

مؤلف

سید سلیمان ندوی

شبلی منزل، اعظم گڑھ

۲۳ رجب سنہ ۱۳۵۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عملِ صالح

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم کو لیکر آئے، اُسکا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزون پر موقوف ہے، ایک ایمان، اور دوسری عملِ صالح، کتاب سیرۃ النبیؐ کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح مین تھی، اب یہ پیش نظر حصہ عملِ صالح کی تشریح و بیان میں ہے، ایمان بنیادی اصولوں پر یقینِ کامل رکھنے کا نام ہے، اور عملِ صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا، کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لئے کافی نہیں جب تک اُس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو،

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو انھیں دو چیزوں یعنی ایمان و عملِ صالح پر مبنی قرار دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ عملِ صالح کو نہین، حالانکہ یہ دونون لازم و ملزوم کی حیثیت سے علا یکسان اہمیت رکھتے ہین، فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے، اور عملِ صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون، جسطرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہین رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہین ہو سکتی،

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے، ایمان کی حیثیت اصول موضوعہ اور اصولِ متعارفہ

کی بعض کو صحیح ماننے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا ثبوت محال ہے، لیکن اگر صرف اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فنِ تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کام کا نہیں ہو سکتا، اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں،

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآنِ پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے قرآنِ پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں میں بیان کیا ہے، مگر ہر جگہ بلا استثناء ایمان اور عملِ صالح دونوں پر اسکو مبنی قرار دیا ہے، اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عملِ صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے، فرمایا:

وَالْعَصْرِ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ، اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، (عصر-۱)

زمانہ (مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے) گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہدِ عدل ہے کہ انھیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا، اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، ایک دوسری آیت میں فرمایا،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ، ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ، اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ، (والتین-۱)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین حالت درستی میں پیدا کیا، پھر اسکو سب نیچوں کے نیچے لوٹا دیا لیکن جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے انکی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون بچائے جاتے ہیں؟ وہ جنہیں ایمان کی رفعت اور عملِ صالح کی بلندی ہے، یہود سے جنکو یہ دعویٰ تھا کہ بہشت انہیں کے ٹھیکہ میں ہے یہ فرمایا،

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ، (بقرۃ-۹)

اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، وہی جنت والے ہیں۔

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں، بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے، جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کریگا، وہ اُسی کی ملکیت ہے، فرمایا،

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ
وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ
صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ،
(بقرہ - ۸)

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں، اور صابئین اور
نصاری جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور
اچھے کام کرے، نہ تو اُنپر ڈر ہے، نہ وہ غم کھائینگے،

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول کسی نسل و قومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب و ملت کیطرف رسمی نسبت پر ہے، بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے، اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے، عدم ایمان اور بد کاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی، اور ایمان اور نکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جسمیں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا، اور نہ ہوگا، چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا،

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ یُرَدُّ
اِلٰی رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا، وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ِالْحُسْنٰی،
(کہف - ۱۱)

اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کریگا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا
دینگے، پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹا کر جائیگا تو اس کو بری
طرح سزا دیگا، اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو اسکے
لئے بھلائی کا بدلہ ہے،

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا
كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ،
(انبیاء - ۷)

تو جو کوئی نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو، تو اُس کی
کوشش اکارت نہ ہوگی، اور ہم اُس کے نیک عمل کو
لکھتے جاتے ہیں،

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ
وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا اِلَّا مَنْ
تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ

تو ان کے بعد اُن کے ایسے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز
کو برباد کیا، اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی، تو وہ گمراہی
سے ملیں گے، لیکن جسنے توبہ کی اور ایمان لایا، اور نیک کام

الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا. (سورۂ مریم-۴) کے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہونگے، اور اُن کا ذرا سا حق بھی مارا نہ جائے گا،

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق در اصل انہیں کو ہے، جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں، اور جو عمل سے محروم ہیں، وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ. ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ. (شوریٰ) اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ جنت کے باغوں میں ہونگے، اُن کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں، یہی بڑی مہربانی ہے یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے

دوسری جگہ فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا. (کہف-۱۲) بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، اُن کی مہمانی کے لئے باغ فردوس ہیں۔

پھر آگے چل کر فرمایا،

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا. (کہف) تو جسکو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک بنائے

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے، اسی کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے کیونکہ کسی چیز پر پورا پورا یقین آجانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا، انسانی فطرت کے خلاف ہے، آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا وہ بار بار اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے، اس لئے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان، یا تنہا عمل کو نہیں، بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے،

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (حج) تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ آرام کے باغوں میں ہونگے

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۵۴ موقعوں پر یہ آیت ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے،

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں، جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے، اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے، البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے،

جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں جن میں ایمان کے ساتھ عملِ صالح بھی ہو،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ، (نور - ۷) تم میں سے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے خدا نے وعدہ کیا کہ اُن کو زمین کا مالک بنائیگا،

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی انھیں سے تھا،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا، (فتح - ۴) اللہ نے اُن میں سے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے بخشایش اور بڑی روزی کا وعدہ کیا،

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی، اور عملِ صالح کی جگہ احسان یعنی نکوکاری کو جگہ دیگئی ہے، مثلاً ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا،

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، (بقرہ - ۱۳) کیوں نہیں جس نے اپنے کو اللہ کے تابع کیا، اور وہ نکوکار ہے تو اس کی مزدوری اُس کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ڈر ہے اُن کو اور نہ غم۔

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں، بلکہ ایمان کیساتھ عمل صالح پر ہے اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی، عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط میں ہے صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے؛ اور بودھ دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے؛ اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے، یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اسکو ایمان کہتے ہیں، پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عمل صالح ہے؛ اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انہیں دو باتوں پر ہے۔ کوئی مریض صرف کسی اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا، جب تک وہ اُن اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لئے کافی نہیں، جب تک اُن اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے،

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ، هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ	وہ ایمان والے مراد کو پہنچے، جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں،
خَاشِعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ	جو نکمی باتوں کی طرف رُخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے ہیں،
وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ، وَالَّذِينَ	جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ......
هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ..... وَالَّذِينَ هُمْ	.... اور
لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ	جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، جو اپنی
يُحَافِظُونَ، أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ، (مومنون-۱)	نمازوں کے پابند ہیں، یہی بہشت کے وارث ہیں،

مومنون ر ۱

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی عمل و اسباب کے تابع فرمایا ہے، یہاں کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک اُس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے۔ صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے، ہماری بھوک دفع نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لئے ہم کو جد و جہد کر کے روٹی حاصل کرنی اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا بھی پڑے گا، اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتی ہیں

ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے جب تک اس یقین کیساتھ ہم اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں، یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے، اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لیے بیکار ہے، البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اُس سے بہرحال بہتر ہے جو اُن کو سرے سے نہیں مانتا کیونکہ اوّل الذکر کے کبھی نہ کبھی راہِ راست پر آجانے اور نیک عمل بجا لانے کی اُمید ہو سکتی ہے اور دوسرے کے لیے تو اوّل پہلی ہی منزل باقی ہے، اس لیے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے، کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا،

اعمالِ صالحہ کی قسمیں "عملِ صالح" کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمالِ خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں تاہم اُن کی جلی تقسیمات حسبِ ذیل ہیں، عبادات، اخلاق، معاملات،

اسلام میں لفظ **عبادت** کو بڑی وسعت حاصل ہے، اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو، اس لیے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کئے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں، مگر فقہاء نے اصطلاحاً یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیئے ہیں جنکی تفصیل یوں کیجا سکتی ہے کہ اوّلاً اعمالِ صالحہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جسکا تعلق خاص خدا سے ہے اُس کو **عبادت** کہتے ہیں، دوسری وہ جسکا تعلق بندوں سے ہے، اُس کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے، اور دوسری وہ جسمیں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے، پہلے کا نام **اخلاق** اور دوسرے کا **معاملات** ہے،

اعمالِ صالحہ کی انہیں تینوں قسموں کی تفصیل و تشریح سیرۃ النبی کی موجودہ اور آئندہ جلدوں کا موضوع ہے،

عبادات

يٰأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمْ (بقرہ)

عبادات کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں جنکو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجالاتا ہے، لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی، اسکا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے، بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے، ساتھ ہی عبادت کے گذشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل، مبہم بیانات کی تشریح، اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کیگئی،

اہلِ عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بیخبر تھے، وہاں عبادت کے مفہوم و معنی اور اُس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے، عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے، وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیمات کوئی واضح حقیقت اُن کے سامنے پیش نہ کرسکے تھے، اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے، عقائد میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے، اور عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کرکے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انھوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنالی تھیں، اور اُن میں بیٹھکر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے، اسی لئے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیل ایک راہب متبتل کی صورت میں تھا، عرب کا سب سے بڑا شاعر امرؤالقیس کہتا ہے،

منارةُ ممسی راہبٍ متبتلِ ۔۔۔ | دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کے شام کا چراغ،

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے، ان میں روحانی خلوص و ایثار اور خدا پرستی نام کو نہ تھی، وہ صرف سبت (سنیچر) کے دن توراۃ کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اُس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے، قرآنِ پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے، یہودیوں پر اُسنے بے حکمی، نافرمانی، اکل حرام، اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے[1]،

یہودی جادو، ٹونٹکا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا، غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے، عیسائی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی اولیاء اور شہیدوں کی تصویروں، مجسموں، یادگاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے، انھوں نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کئے تھے، اور ان کا نام انھوں نے دینداری رکھا تھا، سورۂ حدید میں قرآنِ پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا ہے، لیکن ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے، یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا، اور نصاریٰ کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا، اور خدا کے شرع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں، اسی لئے قرآن نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا،

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ	اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا، اور اُن کی نسل میں نبوت
ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ	اور کتاب رکھی، تو اُن میں سے کچھ راہ پر ہیں، اور اکثر نافرمان
وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ، ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا	ہیں، پھر اُن کے بعد اُن کے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے اور
وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ	مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا اور انکو انجیل عنایت فرمائی اور جنھوں نے
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ	عیسیٰ کی پیروی کی اُنکے دل میں نرمی اور رحمدلی بنائی اور ایک رہبانیت
ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ	انھوں نے نئی خود نکالی جو ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی،
رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا	لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انھوں نے اس رہبانیت

[1] دیکھو سورۂ مائدہ رکوع ۹ و ۱۱، اور سورۂ حدید رکوع ۴۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ
فٰسِقُوْنَ، (حدید-۴)

تو بھی جیسا نباہنا چاہیے تھا نہیں نباہا، تو ان میں جو ایماندار
تھے انکو ہمنے انکی مزدوری دی، اور انمیں بہت سے نافرمان ہیں

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے اسی لئے قرآن نے انکو بار بار کہا،

لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ، (نساء-۲۳ و مائدہ-۱۰) اپنے دین میں غلو نہ کرو،

اُن کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا، وہ ابن اللہ ماننے لگے، اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے، بلکہ ان کو قتل کرتے تھے، وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ (بقرہ و آل عمران) ساتھ ہی وہ خدائے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمسایہ قوموں کے بتوں کو پوجنے لگے تھے، چنانچہ توراۃ میں یہودیوں کی بت پرستی اور غیر خداؤں کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے، اور قرآن میں اُن کے متعلق ہے،

وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ، (مائدہ-۹) اور جنہوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا،

آنحضرت صلعم نے عیسائیوں کو تبلیغ کی،

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا
يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ
الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ. قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا
نَفْعًا وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، قُلْ يٰاَهْلَ
الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا
تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ

مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس، اس سے پہلے
پیغمبر گذر چکے، اور اس کی ماں ولی تھی، دونوں انسان
تھے، کھانا کھاتے تھے (خدا نہ تھے) دیکھو ہم ان (عیسائیوں)
کے لئے اس طرح کھول کر دلیلیں بیان کرتے ہیں، پھر
بھی دیکھو وہ کدھر الٹے جاتے ہیں، (ان سے) کہہ کہ کیا
تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانوں) کو پوجتے ہو جن کے ہاتھ
میں نہ نقصان ہے نہ نفع، اللہ ہی سننے والا اور جاننے
والا ہے، جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے، اے اہل کتاب

بِضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ، (مائدہ - ۱۰)

اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو، اور اُن لوگوں کے خیال پر نہ چلو، جو بہک گئے اور بہتوں کو بہکایا اور سیدھے راستہ سے بھٹک گئے

اُن کی حالت یہ تھی،

اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ، (توبہ - ۵)

خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنا لیا تھا،

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستشگاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک حبش میں تھیں، ان میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں، اور مجسمے نصب تھے، عبادت گذار اُن کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سربسجود رہتے تھے، صحابہ میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے اثنا میں ان معبدوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، ان میں سے شاید بعض بی بیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلعم کے مرض الموت میں بعض ازواجِ مطہرات نے آپ سے اسکا تذکرہ کیا، اور اُن کی تصویروں اور مجسموں کے حسن و خوبی کو بیان کیا، آنحضرت صلعم نے فرمایا "خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے، انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا، تم ایسا نہ کرنا، ان میں جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا، تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، اور اس میں اسکی تصویریں کھڑی کردیتے تھے"[۱]

ایڈورڈ گبن نے تاریخ ترقی و زوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عباوات کے جو حالات بیان کئے ہیں، وہ تمام تر حدیثِ مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں، خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰؑ حضرت مریمؑ، سینٹ پال، اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے، اور آجتک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقوں کی پرستش گاہوں کے در و دیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آرہی ہیں، اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات موم بتیوں کی روشنی میں اُن کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگوں نظر آتے ہیں،

---

[۱] صحیح مسلم کتاب المساجد

روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤن مین یہ منظر مین نے خود اپنی آنکھون سے دیکھا ہے اور اُس وقت محمد رسول اللہ صلعم کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھون کے سامنے تھی،

یہودیون اور عیسائیون کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے، مگر اسکی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بیخبر تھے، لات، عزی، ہبل، اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتون کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے، اُن پر جانور قربانی کرتے، اور اپنی اولادون کو بھینٹ چڑھاتے تھے، سال کے مختلف اوقات مین مختلف بتخانون کے میلون مین شریک ہوتے تھے، اور پتھرون کے ڈھیرون کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے، خانۂ کعبہ یعنی خلیل بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتون کا مرکز تھا، اور اُن کی نماز یہ تھی کہ خانۂ کعبہ کے صحن مین جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتون کو خوش اور راضی رکھین، قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت صلعم کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا، کہا کرتا تھا کہ اے خدا مجھے نہین معلوم کہ مین تجھکو کس طرح پوجون اگر جانتا تو اسی طرح عبادت کرتا[۱]۔

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع خیبر کے سفر مین یہ ترانہ گا رہے تھے اور آنحضرت صلعم سُن رہے تھے[۲]،

وَاللّٰہِ لَولا اَنتَ مَا اھتَدَینا وَلا تَصَدَّقنا وَلا صَلَّینا

خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے،

اس شعر مین اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ہی کی تعلیم تھی، جسنے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقون سے آشنا کیا،

عرب سے باہر بھی کہین خداے واحد کی پرستش نہ تھی، بت پرست یونانی اپنے بادشاہون اور ہیرون کے مجسمے اور ستارون کے ہیکل پوجتے تھے، روم، ایشیاے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکون مین حضرت عیسیٰ، حضرت مریمؑ، اور سینکڑون ولیون اور شہیدون کی مورتیان، اور ہڈیان، اور انکی مصنوعی یادگارین پوجی جا رہی تھین، زردشت کی مملکت مین آگ کی پرستش جاری تھی، ہندوستان سے لیکر کابل و ترکستان، اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتون

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو، [۲] صحیح مسلم باب خیبر، شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتون مین مختلف ہی،

سماد ہون اور اس کی جلی ہوئی ہڈیون کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی، چین کے کنفوشس اپنے باپ داوون کی مورتون کے آگے خم تھے، خاص ہندوستان مین سورج دیوتا، گنگا مائی، اور اوتارون کی پوجا ہو رہی تھی، عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی مین مبتلا تھے، باقی تمام دنیا درختون، پتھرون، جانورون، بھوتون اور دیوتاؤن کی پرستش کر رہی تھی، غرض مین اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش مین مصروف تھی ایک ب تاب ہوگیا، ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی،

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ	لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو جس نے تم کو
وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ ۳)	اور تم سے پہلون کو پیدا کیا،

سابق کتب الہی کے امانت دارون کو آواز دی گئی،

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ	اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر متحد ہو جائین
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ،	جسمین ہم تم عقیدۃً متفق ہین کہ ہم خدائے برحق کے سوا
(آل عمران -۷)	کسی اور کی پرستش نہ کرین،

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستون نے سنی، اور پکار اُٹھے

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ	خداوندا! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز سنی کہ اپنے
أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا	پروردگار پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے، تو اے پروردگار
ذُنُوبَنَا۔ (آل عمران -۲۰)	ہمارے گناہ معاف کر

ان واقعات کو سامنے رکھکر آنحضرت صلعم کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ مین آپکی زبان[1] عبودیت ترجمان سے بارگاہ الہی مین نکلی تھی،

"خداوندا! تیرے پوجنے والون کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے لئے لڑنے پر آمادہ ہے، خداوندا! آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین مین تیری کبھی پرستش نہ ہوگی"

[1] صحیح مسلم و جامع ترمذی، غزوۂ بدر

خدا نے اپنے نبی کی دعا سنی، اور قبول فرمائی، کیونکہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا، جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا، اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا،

صرف ایک خدا کی عبادت | مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ مین نبوتِ محمدی کا پہلا کارنامہ یہ ہو کہ اُس نے دنیا کے جن خداؤن سے تمام باطل معبودون کو باہر نکال کر پھینکدیا، باطل معبودون کی عبادت اور پرستش یکقلم محو کردی، اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنین جھکا دین، اور صاف اعلان کر دیا کہ

إِن كُلُّ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم - ۶)

آسمان و زمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بنکر آنے والی ہے،

خدا کے سوا نہ تو آسمان مین، نہ زمین مین، نہ آسمان کے اوپر، اور نہ زمین کے نیچے، کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ، اور رکوع و قیام کی مستحق ہے، اور نہ اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جا سکتا ہے، اور نہ اسکی پرستش کے لئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جا سکتی ہو، اور نہ اُسکی نذر مانی جا سکتی ہو، اور نہ اُس سے دعا مانگی جا سکتی ہو، ہر عبادت صرف اسی کے لئے، اور ہر پرستش صرف اُسی کی خاطر ہے،

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ۔ (انعام - ۲۰)

بے شبہہ میری نماز اور میری قربانی، اور میری زندگی اور میری موت سب اُسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے،

کفار کو بتون، دیوتاؤن، ستارون، اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا، اور انھین ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہین لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا، تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا،

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنتُمْ عٰبِدُونَ مَا أَعْبُدُ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ وَلَا أَنتُمْ عٰبِدُونَ مَا

اے کافرو، جس کو تم پوجتے ہو اس کو مین نہین پوجتا، اور نہ تم اُس کو پوجنے والے ہو، جس کو مین پوجتا ہون اور نہ مین اس کو پوجنے والا ہون جسکو تم نے پوجا اور نہ تم

اَعْبُدُ، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ، (کفرون - ۱) — اس کو پوجنے والے ہو جس کو مین پوجتا ہون، تمھارے لئے تمھارا دین ہے، اور میرے لئے میرا دین ہے،

خارجی رسوم کا وجود نہین خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم و جان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہین، نہ سورج کے نکلنے اور اسکی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا مین جاکر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب[1]، نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت[2]، نہ دیوتاؤن، دیبیون، بزرگون اور ولیون کے مجسمون کو پیش نظر رکھنے کی اجازت[3]، نہ سامنے موم بتیون کے روشن کرنے کا حکم[4]، نہ گھنٹون اور ناقوسون کی ضرورت، نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنون کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑون کی قید[5]، ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے، اس کے لئے صرف ایک پاک سترپوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے،

درمیانی آدمی کی ضرورت نہین اسلام مین عبادت کے لیے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان، اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہین، محمد رسول اللہ صلعم کے دین مین ہندوؤن کی طرح نہ برہمن ہین، نہ پروہت ہین نہ پجاری ہین، نہ یہودیون کی طرح کاہن ہین، نہ ربی ہین، نہ حاخام ہین، نہ حضرت ہارون کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیون کی طرح عبادتون کی بجا آوری کے لئے پادریون اور مختلف مذہبی عہدہ دارون کی ضرورت ہے، اور نہ پارسیون کی طرح دستورون اور موبدون کی حاجت، یہان ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتین کرتا ہے آپ عرض حال کرتا ہے، ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری، اور اپنا آپ دستور ہے، یہان یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو، مین جواب دونگا:

اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن - ۶) — تم مجھے پکارو مین تم کو جواب دونگا،

---

[1] جیسا کہ ہندوؤن مین ہے [2] جیسا کہ پارسیون مین ہے، [3] جیسا کہ ہندوؤن، عام بت پرستون اور رومن کیتھولک مین ہے، [4] جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیون مین ہے، [5] یہ چیزین یہودیون کے ہان ہین، پارسیون مین سپید کپڑون کی ضرورت ہے،

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش، دلفریب، مؤثر اور بارعب بنانے کے لئے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا، کہیں ناقوس اور قرنا کی پررعب آوازیں تھیں کہیں ساز و ترنم، اور نغمہ و بربط کی دلکش صدائیں تھیں کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور، لیکن دینِ محمدی کی سادگی نے اُن میں سے ہر ایک سے احتراز کیا، اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لئے دل کے ساز، اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیروں کا سہارا نہیں لیا، تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کیساتھ خلوص و اثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید نہیں ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے، بت خانوں سے باہر پوجا نہیں، آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں، اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کے طریقہ میں نہ کسی در و دیوار کی ضرورت، نہ محراب و منبر کی حاجت، وہ دیر و حرم، معبد و صومعہ اور مسجد و کنیسہ سب سے بے نیاز ہے، زمین کا ہر گوشہ، بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اُسکا معبد اور عبادت خانہ ہے۔ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبروں کو نہیں دی گئیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہے،

وجعلت لی الارض مسجدا[1]، اور میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنا دی گئی۔

تم سوار ہو کہ پیادہ، گلگشتِ چمن میں ہو کہ ہنگامۂ کارزار میں، خشکی میں ہو کہ تری میں، ہوا میں ہو کہ زمین پر، جہاز میں ہو کہ ریل پر، ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو، اور اس کے سامنے سجدۂ نیاز بجا لا سکتے ہو، یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو جس میں سامنے بت اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضۂ عبادت ادا کر سکتے ہو[2]،

خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتوں اور چیزوں کی طرف رُخ کرنا بھی ہر مذہب میں ضروری سمجھا جاتا ہے، چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک ہی رُخ پر مجتمع کرنے کے لئے تاکہ اُن میں وحدت کی شان نمایاں ہو مسلمانوں کے لئے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی، اور اس کے لئے اسلام میں مسجد ابراہیمی کی تخصیص کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب قول النبی صلعم جعلت لی الارض مسجدا و طهورا، [2] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البیعۃ،

پرستش کا پہلا مقام ہے، لیکن اسکی حیثیت وہ نہین قائم کیگئی جو دوسرے مذاہب کے قبلون کی ہے، اسلام کا قبلہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کے حدود سے پاک ہے، وہ ستارون کے رخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہین، دنیا کے مختلف ملکون کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اسکی طرف رخ کرتے ہین، مغرب سے بھی، مشرق سے بھی، شمال سے بھی اور جنوب سے بھی، کسی ایک سمت کی تخصیص نہین، اور خود خانہ کعبہ کے صحن مین بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اسکی طرف رخ کیا جاتا ہے اگر کسی سبب سے اس رخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے، تو جدھر بھی رخ کرو، ادھر ہی خدا ہے، چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت مین اور عام نفل نمازون کی درستی کے لئے قبلہ کی بھی تخصیص نہین، جدھر سواری کا رخ ہو اُدھر ہی سجدہ کیا جا سکتا ہے، لڑائیون مین ہر رخ پر نماز برابر ادا کیجا سکتی ہے، اگر خدانخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے، تب بھی اس رخ کھڑا ہوجانا کافی ہے، کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو۔

انسانی قربانی کی ممانعت بعض مذاہب مین خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی، کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کاٹ کر، یا دریا مین ڈوبا کر یا آگ مین جلا کر یا کسی اور طرح بھینٹ چڑھا دے، اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کردیا، اور بتایا کہ خدا کی راہ مین اپنی جان قربان کرنا اصل مین یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت مین یا کمزورون کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پروا نہ کیجائے اور مارا جائے۔ یہ نہین ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے، یا دریا مین ڈوب مرا جائے۔ یا آگ مین اپنے کو جلا دیا جائے، آپ نے فرمایا کہ جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا اُس کو جہنم مین اسی چیز سے سزا دیجائے گی۔[1]

حیوانی قربانی مین اصلاح کسی حیوان کی قربانی کرکے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب مین رائج تھا، عرب مین اُسکا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کرکے بتون پر چڑھا دیتے تھے، کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لاکر باندھ دیتے تھے، اور اُس کو چارہ گھاس نہین دیتے تھے۔ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرجاتا تھا۔ اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے، چنانچہ قربانی ذبح کرکے مسجد کی دیوار پر اُس کے خون کا چھاپ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب من اکفر اخاہ۔

دیتے تھے، یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کرکے اُسکا گوشت جلا دیتے تھے، اور اُس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے اُن کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سما سکتی، اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے، بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اُس کا گوشت چیل اور کوّوں کو کھلا دیتے تھے، پیغامِ محمدی نے اِن سب طریقوں کو مٹا دیا، اُس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں، بلکہ تمہارے دل کی غذا مطلوب ہے۔ فرمایا،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج-٥)

اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے،

اسلام نے تمام عبادات میں صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہلِ استطاعت کیلئے جو موقعِ حج پر نہ گئے ہوں مقامِ حج کی یاد کے لیے قربانی مسنون کیگئی ہے، تاکہ اُس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملتِ حنیفی کے سب سے بڑے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا، اور خدا نے اُس کو آزمایش میں پورا ہوتا دیکھ کر اُس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھدی، اور اس کے پیرووں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہوگئی،

اسی کے ساتھ پیامِ محمدی نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا، جان کا فدیہ دینا، یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصد دو ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اُس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور اُن کو ہماری غذا کے لئے مہیا کیا، اور دوسرا یہ کہ اُنکا گوشت غریبوں، مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کیجائے، چنانچہ فرمایا،

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ، (حج-٥)

ہمنے ہر قوم کے لیے قربانی مقرر کی، تاکہ وہ ان جانوروں پر خدا کے نام کی یاد کریں جو ہم نے اُن کو روزی کی، تو تمہارا خدا ایک خدا ہے، اسی کے آگے سر جھکاؤ، اور عاجزی کرنے والے بندوں کو خوشخبری سنا دے،

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ	اور قربانی کے جانورون کو خدا کی نشانیان بنایا ہے تمھا
لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا	رے لئے اُن مین بہت فائدے ہین، اُن کو قطار مین کھڑا کرکے
صَوَافَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا	تم ان پر خدا کا نام لو، تو جب وہ پہلو کے بل جھکین،
مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ	(یعنی ذبح ہو چکین) تو اُن مین سے کچھ خود کھاؤ، اور باقی
سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ.	قناعت پسند فقیرون اور محتاجون کو کھلا دو، اسی طرح ہمنے
(حج - ۵)	اُن جانورون کو تمھارے کام مین لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت مین یہ فعل شرک، اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے، وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ، عرب مین دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینہ مین قربانی کرتے تھے، اسلام کے بعد لوگون نے اس کے متعلق آپ سے پوچھا آپ نے فرمایا[1] خدا کے نام سے جس مہینہ مین چاہو ذبح کرو، نیک کام خدا کے لئے کرو، اور (غریبون کو) کھلاؤ، غرض قربانی کی یہی دو حقیقتین ہین صرف خون بہانے کے لئے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہین، اور نہ یہ خون بہانا مشرکون کی دیبیون اور دیوتاؤن کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا ہے،

مشرکانہ قربانیون کی ممانعت

اسی لئے وہ تمام مشرکانہ قربانیان جو عرب مین جاری تھین بند کر دی گئین، عرب مین جانورون کے قربانی کرنے اور اُن کو بتون پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے، اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا بتون کے نام پر عموماً اسکی قربانی کر دیتے تھے، اور اسکی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے، اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے، رجب کے پہلے عشرہ مین ایک قسم کی قربانی کیجاتی تھی جسکا نام عتیرہ تھا اسلام نے ان دونون قربانیون کو ناجائز قرار دیا، اور رجب کی تخصیص باطل کر دی،

قال لا فرع ولا عتيرة۔[2] | آپنے فرمایا کہ فرع اور عتیرہ جائز نہین ہے،

بتون کے نام پر مختلف نامون سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے، اور اُن کو کوئی شخص کسی دوسرے کام مین

[1] ابو داؤد، باب فی العتیرہ، جلد دوم صفحہ ۔ [2] ابو داؤد کتاب الاضاحی جلد ۲ ص ۵،

احتمال نہیں کرسکتا تھا چنانچہ قرآن مجید مین اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی،

مَا جَعَلَ اللّٰہُ مِن بَحِیرَۃٍ وَّلَا سَآئِبَۃٍ وَّلَا وَصِیلَۃٍ وَّلَا حَامٍ، (مائدہ ۱۳)

نہ تو خدا نے بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، اور نہ حام بنایا،

مردون کی قبر کے پاس گائے، یا بکری ذبح کرتے تھے، لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحین کین اُس کے سلسلہ مین اس کو بھی ناجائز قرار دیا، فرمایا،

لَا عَقرَ فِی الاِسلَامِ[1]،

اسلام مین قبر کے پاس جانورون کا ذبح کرنا جائز نہین،

عرب جاہلیت مین یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی و سخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہو کر جانورون کے ذبح کی بازی لگاتے تھے، اپنا ایک اونٹ یہ ذبح کرتا، پھر اُس کے مقابل مین دوسرا ذبح کرتا، اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا جسکے اونٹ ختم ہوجاتے، یا ذبح کرنے سے انکار کر دیتا، وہ ہار جاتا، اسلام نے اس جان و مال کے اتلاف کو روک دیا[2]،

تجرد، ترکِ لذائذ، ریاضات اور تکالیفِ شاقہ عبادت نہین،

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے، اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اُسکی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے، اسی لئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفین دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائیگا، اسی قدر روح مین زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئیگی، چنانچہ یونانی فلسفیون مین اشراقیت، عیسائیون مین رہبانیت اور ہندوؤن مین جوگ اس اعتقاد کا نتیجہ تھا، کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کرلیتا، کوئی ہفتہ مین یا چالیس دن مین ایک دفعہ غذا کرتا تھا، کوئی سرتاپا برہنہ رہتا، اور ہر قسم کے لباس کو مقدس کا ننگ سمجھتا تھا، کوئی جاڑے کی سردی مین اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا، کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا، یا بیٹھا رہتا تھا، اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ شل ہوجائے، کوئی عمر بھر تاریک تہ خانون اور غارون مین چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرد، اور ترکِ دنیا کر کے اہل و عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا طلبگار بنتا تھا، لیکن نبوتِ محمدیؐ نے یہ راز آشکارا کیا، کہ ان مین سے کوئی چیز عبادت نہین، نہ ترکِ لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے، نہ ہماری غمگینی خدا کی خوشنو[دی]

[1] ابو داؤد کتاب الجنائز باب کراہیۃ الذبح عند القبر، جلد ۲ ص ۳۲۸،
[2] ابو داؤد کتاب الاضاحی، جلد ۲ صفحہ ۰

کا باعث ہو، اللہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہو، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہو، نہ ترکِ دنیا سے دین کی دولت ملتی ہو، خدا کا دین آسان ہے، جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہو، اُسنے کہا

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔ (بقرہ۔ آخر) خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (کا حکم) نہیں دیتا،

اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جسکو بعضوں کے لئے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں، اسلام نے اس میں متعدد آسانیاں پیدا کرکے کہا،

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (بقرہ ۲۳) خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں،

حج بھی سب لوگوں پر مشکل تھا، تو ساتھ ہی فرما دیا،

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا۔ (آل عمران۔ ۱۰) جسکو زاد راہ اور چلنے کی استطاعت ہو اسی پر حج فرض ہے

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج ۱۰) تمہارے لئے دین میں اس نے (خدا نے) تنگی نہیں کی

آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا،

اِنَّ ھٰذَا الدِّیْنَ یُسْرٌ وَلَنْ یُّشَادَّ الدِّیْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَہٗ۔ [۱] یہ دین آسان ہے، جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کریگا، تو دین اسکو مغلوب کر دیگا،

اور فرمایا،

اِنَّمَا اُبْعِثْتُ بِالْمِلَّۃِ السَّمْحَۃِ اَوِ السَّہْلَۃِ الْحَنِیْفِیَّۃِ الْبَیْضَاءِ۔ [۲] میں تو سہل اور آسان روشن حنیفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں،

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا، خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہو، تاہم وہ دینِ حق کی اصلی تعلیم نہ تھی، اسی لئے اسلام کے صحیفہ نے اُس کو بدعت سے تعبیر کیا، اور کہا،

۱؎ جمع الفوائد طبع میرٹھ جلد اول صفحہ ۳ بحوالہ ... ۲؎ کنز العمال بحوالہ صحیح بخاری و سنن نسائی، ۳؎ مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۲۶۶

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ	اور عیسائیون نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور
اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ	ہم نے اُن کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم
رِعَايَتِهَا ۚ (حدید-۴)	نہین دیا تھا، تو جیسا چاہیے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا،

ان لوگون سے جنھون نے اچھے کھانون اور زیب وزینت کی جائز چیزون کو بھی اِس لیے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا کہ اِس سے خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ	پوچھ اے پیغمبر کہ اس زیب وزینت اور رزق کی اچھی چیزون
وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ، (اعراف-۴)	کو جنکو خدا نے اپنے بندون کیلئے بنایا، کس نے حرام کیا،

اسلام نے اس مسئلہ مین یہانتک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے بعض بی بیون کی خوشنودیِ مزاج کے لئے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اِسپر عتاب آیا، خدا نے فرمایا،

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ	اے پیغمبر خدا نے جس چیز کو تیرے لئے حلال کیا، تو اس کو اپنی
تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ	بی بیون کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیون کرتا ہے،
رَّحِيْمٌ ، (تحریم-۱)	اور خدا بخشنے والا مہربان ہے،

صحابہ مین بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبون کے اثر، یا ذاتی میلانِ طبع کے سبب سے تجرد، ترکِ لذائذ اور ریاضات شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، آنحضرت صلعم نے اُن کو اس سے باز رکھا، اور فرمایا کہ مین یہ شریعت لیکر نہین آیا، حضرت عثمان بن مظعون اور اُن کے ایک رفیق نے دربارِ رسالت مین حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم مین سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا، اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے، آپ نے فرمایا: مین تو دونون باتین کرتا ہون[1] یہ سنکر دونون صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے،

حضرت عبد اللہ بن عمرو نے جو ایک نہایت عابد وزاہد صحابی تھے، یہ عہد کرلیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھینگے

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم،

اور رات بھر عبادت کرین گے، آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو آپنے اُن سے فرمایا کہ "اے عبداللہ! تم پر تمھارے جسم کا بھی حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ مین تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے"[1]، اسی قسم کی نصیحت آپنے ایک دوسرے تقشف پسند صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو فرمائی، آپ کو اُن کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت مین مصروف رہتے ہین، بیوی سے کوئی تعلق نہین رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہین، رات کو سوتے نہین، آپنے اُن کو بلا کر پوچھا کہ "کیون عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے" عرض کی "خدا کی قسم مین نہین ہٹا ہون، مین آپ ہی کے طریقہ کا طلبگار ہون" فرمایا "مین سوتا بھی ہون اور نماز بھی پڑھتا ہون، روزہ بھی رکھتا ہون اور افطار بھی کرتا ہون اور عورتون سے نکاح بھی کرتا ہون، اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمھارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی حق ہے، تمھاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی"[2]،

قبیلۂ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لاکر اپنے قبیلہ مین واپس گئے، تو انھون نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے، ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمتِ اقدس مین حاضر ہوئے تو اُن کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ انکو پہچان نہ سکے، انھون نے اپنا نام بتایا، تو فرمایا "تم خوشرو تھے، تمھاری صورت کیون ایسی ہوگئی" عرض کی "یا رسول اللہ صلعم! جب سے آپ سے مل کر گیا ہون متصل روزے رکھتا ہون" فرمایا "تم نے اپنی جان کو کیون عذاب مین ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ مین ایک روزہ کافی ہے" انھون نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی، تو آپنے مہینہ مین دو روزون کی اجازت دی، انھون نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپنے مہینہ مین تین روزے کر دیئے، انھون نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی، تو آپنے ماہِ حرام کے روزون کی اجازت دی[3]، ایک دفعہ چند صحابہؓ نے ازواجِ مطہراتؓ کی خدمت مین حاضر ہو کر آپ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت کیا، وہ سمجھتے تھے کہ رسولِ خدا صلعم کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا، انھون نے آپ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ صلعم سے کیا نسبت آپ تو معصوم ہین، ان مین سے ایک صاحب نے کہا مین تو رات بھر نمازین پڑھونگا، دوسرے صاحب بولے مین عمر بھر

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم۔ [2] ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ باب ما یؤمر بہ من القصد فی الصلوٰۃ۔ [3] ابو داؤد باب صوم اشہر الحرم۔

روزے رکھوں گا، تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرد رہوں گا، کبھی نکاح نہ کروں گا، آنحضرت صلعم اُن کی یہ گفتگو سُن رہے تھے، اُن کو خطاب کر کے فرمایا خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں تاہم میں روزہ رکھتا ہوں، اور افطار بھی کرتا ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں، اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میری جماعت میں نہیں[1]۔

بعض صحابہؓ جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبطِ نفس پر بھی قادر نہ تھے، چاہا کہ اپنا عضو قطع کرا دیں، انھوں نے آنحضرت صلعم سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی، تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ صحابہ کہتے ہیں اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے[2]،

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس اہتمام بلیغ کیساتھ لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا،

آپ نے کبھی بذاتِ خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے، صحابہ نے بھی آپ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے، آپ نے منع فرمایا، لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہیں، اس لئے انھوں نے افطار نہ کیا، آپ نے دو دن روزہ رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا آپ نے افطار کر لیا، اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو رہ جاتا، صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ پھر آپ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں، فرمایا تم میں سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے[3]، اسی لئے اسلام میں عام امت کیلئے یہ روزے نہیں ہیں،

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ کا گذر ہوا، دیکھا تو ایک کھمبے میں ایک رسی لٹک رہی ہے، دریافت کیا تو لوگوں نے کہا، یہ زینبؓ نے باندھی ہے، رات کو نماز میں جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہیں تو اسی کے سہارے کھڑی ہوتی ہیں یہ سنکر آپ نے فرمایا، یہ رسی کھول دو، لوگو! تم اُسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم میں نشاط باقی رہے، جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے[4]،

---

[1] صحیح بخاری کتاب النکاح [2] صحیح بخاری و ابوداؤد کتاب النکاح [3] صحیح مسلم کتاب الصوم [4] جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر و اوسط للطبرانی و ابو یعلیٰ

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گذری، حضرت عائشہؓ نے کہا یہ خولا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھر نہیں سوتی اور عبادت مین مصروف رہتی ہے۔ فرمایا کہ یہ رات بھر نہیں سوتی، لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے۔

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازون مین مشغول رہتے تھے، ان کو مخاطب کر کے فرمایا

اکلفوا من العمل ما تطیقون فان اللہ لا	اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کر سکو، کیونکہ جب تک
یمل حتی تملوا فان احب العمل الی اللہ	تم نہ اکتا جاؤ، خدا نہیں اکتاتا، خدا کے نزدیک سب سے
ادومہ وان قل[۲]	پسندیدہ وہی کام ہے جسکو تم ہمیشہ کر سکو اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو،

حج مین رہبانیت کی بہت سی باتین عرب مین جاری تھین بعض حاجی یہ عہد کر لیتے تھے کہ وہ اس سفر مین زبان سے کچھ نہ بولین گے، یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کرین گے، اور کسی سواری پر نہ چڑھینگے، یا اس سفر مین کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی مین چلین گے، بعض لوگ اپنی گنہگاری کے اظہار کے لیے اپنی ناک مین نکیل ڈال کر طواف کرتے تھے، اور اُس کو ثواب جانتے تھے، اسلام نے ان تمام طریقون کو منسوخ کر دیا، کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث نہین، حضرت عقبہ بنؓ عامر کی بہن نے یہ نذر مانی تھی، کہ وہ پیدل حج کریگی عقبہ نے آکر آنحضرت صلعم سے فتویٰ پوچھا، آپ نے جواب دیا خدا کو تمھاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہین، اُن سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کرین[۳]، اسی طرح آپ نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے، آپ نے اُس کو سوار ہونے کا حکم دیا، اُس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، آپ نے فرمایا مین یہ جانتا ہون کہ یہ قربانی کا جانور ہے لیکن تم اس پر سوار ہو جاؤ[۴] ایک دفعہ حج کے سفر مین آپ نے ایک بڈھے کو دیکھا جو خود چل نہین سکتا تھا، اس کے بیٹے اس کو دونون طرف سے پکڑ کر چلا رہے تھے، آپ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے۔ فرمایا، خدا کو اسکی حاجت نہین، کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب مین ڈالے، اُسکو سوار کر دو[۵]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (۴۴) عن انس جلد اول صفحہ ۲ طبع میرٹھ، باب الاقتصاد فی الاعمال[۱] صحیح بخاری جلد ۲ صحیح مسلم و موطا و نسائی۔ [۲] ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ [۳] ابوداؤد و مسند ابن جارود کتاب الایمان والنذور [۴] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۲۳۔ [۵] ابوداؤد و ترمذی و نسائی و ابن جارود کتاب الایمان والنذور،

ایکدفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ مین ننگے سر کھڑا ہے، آپنے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے، اور اسکی یہ کیا حالت ہے، لوگون نے بتایا کہ اس کا نام ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہیگا بیٹھیگا نہین اور نہ سایہ مین آرام کریگا، اور نہ بات کریگا، اور برابر روزے رکھیگا، آپنے فرمایا کہ اس سے کہو کہ باتین کرے، بیٹھے، سایہ مین آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرلے[۱]،

حج مین دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک مین نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اسکی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے، آپنے جاکر نکیل کاٹ دی، اور فرمایا کہ اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اسکو طواف کراؤ[۲]،

اسی قسم کی غیر ضروری ریاضتون کے متعلق عیسائی راہبون کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر آپنے فرمایا،

لا تشددوا على انفسكم فانما هلك من	اپنی جانون پر سختی نہ کرو، کہ تم سے پہلے قومین اپنی جانون پر
كان قبلكم بتشديدهم على انفسهم	سختی کرنے سے تباہ ہوئین، اور انکی بقیہ نسلین آج بھی گرجون
وستجدون بقاياهم في الصوامع والديارات[۳]	اور دیرون مین تم کو ملین گی،

خاتم الانبیاء صلعم نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقون کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا، آپنے فرمایا،

لا صرورة فی الاسلام۔ (ابوداؤد) — اسلام مین رہبانیت نہین،

عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہین،

اکثر مذاہب نے دینداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ، یا جنگل مین بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلے، اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہین قرار دیا، عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندون کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہمجنسون سے الگ ہوکر ایک گوشہ مین بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے

---

[۱] صحیح بخاری، ابوداؤد، وابن جارود کتاب الایمان والنذور۔ [۲] صحیح بخاری ایمان و نذور۔ [۳] جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر و اوسط للطبرانی وابوداؤد صفحہ ۲۰۰ باب الاقتصاد فی الاعمال،

اس لئے وہ کسی تعریف کا مستحق نہین، اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے اژدحام اور علائق کے ہجوم مین گرفتار ہوکر ان مین سے ہر ایک کے متعلق جو اُس کا فرض ہو اس کو بخوبی ادا کرے، جو شخص ان تعلقات و علائق اور حقوق و فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے، اسلام اپنے پیرؤن کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے، جو ان سب جھمیلون کو اٹھاکر بھی خدا کو نہ بھولین، غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترکِ فرض نہین، بلکہ ادائے فرض ہے، ترکِ عمل نہین، بلکہ عمل، کچھ نہ کرنا نہین، بلکہ کرنا ہے،

ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت صلعم نے بعض اُن صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست و احباب سب کو چھوڑکر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتون کو عبادت کرتے تھے، فرمایا "اے فلان! تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمھاری بیوی بچون کا بھی حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی حق ہے، تمھاری جان کا بھی حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی حق ہے"۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر مین عبادت ان حقوق کو بجالانا ہے، ان حقوق کو ترک کردینا نہین، چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ مین ایک صحابی کا گذر ایک ایسے مقام پر ہوا، جسمین موقع سے ایک غار تھا، قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا، آس پاس کچھ جنگل کی بوٹیان بھی تھین، ان کو اپنی عزلت نشینی کے لئے یہ جگہ بہت پسند آئی، خدمتِ بابرکت مین آکر عرض کی، یا رسول اللہ مجھ کو ایک غار ہاتھ آگیا ہے، جہان ضرورت کی سب چیزین ہین، جی چاہتا ہے کہ وہان گوشہ گیر ہوکر ترکِ دنیا کرون، آپنے فرمایا "مین یہودیت اور عیسائیت لیکر دنیا مین نہین آیا ہون، مین آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہون[1]"۔

اسلام سے پہلے آنحضرت صلعم غارِ حرا مین کئی کئی دن جاکر رہا کرتے تھے اور عبادتِ الٰہی مین مصروف رہتے تھے، لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپکے پاس آیا، اور دعوت و تبلیغ کا بار آپکے مبارک کندھون پر رکھا گیا، شب و روز مین رات کی چند ساعتین، اور سال مین رمضان کے چند اخیر دن، گوشۂ عزلت اور زاویۂ تنہائی مین بسر ہوتے تھے، روز تمام دن پوری جماعت کیساتھ ملکر خالق کی عبادت، اور پھر مخلوق کی خدمت مین صرف ہوتے تھے، اور یہی تمام خلفاء اور عام صحابہؓ کا طرزِ عمل رہا، اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادی عبادت تھی[2]۔

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶۔ [2] اسلام مین گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعون پر ہے۔ ایک اس شخص

اسلام مین عبادت کا مفہوم

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہوگا، کہ اسلام مین عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہین، جو دوسرے مذہبون مین پایا جاتا ہے، عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاحِ شریعت مین خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا، اور اُس کے احکام کو بجالانا ہے، اسی لئے قرآنِ پاک مین عبادت کا مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ، (مومن-۶) — جو میری عبادت سے غرور کرتے ہین، وہ جہنم مین جائین گے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) بیکار ہے جس مین فطرۃً بدی ہو جس کی سرشت دوسرون کو نفع پہنچانا نہین بلکہ تکلیف دینا ہے، آنحضرت صلعم نے اس کو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگون سے قطع تعلق کرے، صحیح بخاری مین ہو کہ ایک بدو نے آکر آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا، ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ مین قربان کرتا ہے، دوسرے وہ جو کسی گھاٹی مین بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کیے اور لوگون کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے ؎ اس تعلیم نبوی نے انسانون کی دو قسمین کر دین، ایک وہ جنکو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہے، تو اُن پر یہ فرض ہو کہ وہ مجمع اور ہجوم مین رہ کر اُن کی بھلائی کا فرض انجام دین، یہانتک کہ اس راہ مین اُن کی دولت بھی خرچ ہو جائے اور اُن کی جان بھی کام آجائے، دوسرے وہ لوگ ہین جنمین طبعًا مردم آزاری اور دوسرون کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہو، اُن کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی مین ہو کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھکر خدا کی عبادت مین اپنا وقت صرف کرین، تاکہ وہ گناہ کے بار سے، اور لوگ انکے آزار سے محفوظ رہین،

دوسرا موقع جسمین آنحضرت صلعم نے عزلت نشینی کی اجازت دی ہے، وہ ہے جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک مین فتنہ و فساد کا بازار اسطرح گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو، تو ایسے موقع پر اس کے لئے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے، چنانچہ آپنے صحابہ سے فرمایا کہ ایک ایسا زمانہ لوگون پر آئیگا جس مین ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی جسکو لیکر وہ بارش کی جگہون اور پہاڑون کی چوٹیون کو تلاش کریگا، تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو فتنون سے بچا سکے (صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہین، پہلے موقع مین ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدے کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو، الگ رہنا جماعت اور فرد دونون کے لئے فائدہ مند ہے، اور دوسرے موقع پر جبکہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا ہے، اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور سعید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کیلئے جماعت کے دائرۂ اثر سے اپنے کو باہر رکھکر ہی اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے،

؎ صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء،

فرشتوں کے متعلق فرمایا:

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ (انبیاء ۲)	جو اس کے پاس ہیں وہ اُنکی عبادت سے غرور نہیں کرتے

سعادت مند اور باایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا:

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا	میری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں جنکو ان آیتوں سے
خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ	سمجھایا جائے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور اپنے پروردگار
لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (سجدہ ۲)	کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور غرور نہیں کرتے،

اس قسم کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں جنسے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور و استکبار باہم مقابل کے متضاد معنی ہیں، اس بنا پر اگر غرور و استکبار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا سمجھنا، اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا، اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے، تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اُس کے احکام کے سامنے اپنی گردنِ اطاعت کو خم کرنا ہے، اس بنا پر صحیفۂ محمدی کی زبان میں عبادت: بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود، خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اُس کے احکام کی اطاعت ہو، اگر کوئی انسان بظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام کرے، لیکن اس سے اُسکا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا، اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لیے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے، اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امر فارق ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ جابجا ادا ہوا ہے،

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى	دوزخ سے وہ پرہیزگار بچالیا جائیگا جو اپنا مال دل کی پاکی
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى اِلَّا	حاصل کرنے کو دیتا ہے، اس پر کسی کا احسان باقی نہیں
ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى وَلَسَوْفَ يَرْضٰى	جس کا بدلہ اسکو دینا ہو، بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات
(لیل ۱)	اس کا مقصود ہے، وہ خوش ہوگا،
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ (بقرہ)	صرف خدا کی ذات کی طلب کیلئے جو تم خرچ کرو،

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ ۔ (انسان-۱)	ہم تو صرف خدا کے لئے تم کو کھلاتے ہیں؛
فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ	پھٹکار ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں
سَاهُوْنَ، اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۔ (ماعون-۱)	اور جو دکھاوے کے لئے کام کرتے ہیں،

قرآن کی ان آیتوں کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت صلعم نے ان مختصر لیکن بلیغ فقروں میں فرمادی ہے کہ

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ۔ (صحیح بخاری مسلم)	اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے

اسی کی تشریح آپ نے اُن لوگوں سے کی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آرہے تھے۔

لکل امرء ما نوی فمن کانت ھجرتہ	ہر شخص کو وہی ملیگا جس کی اُس نے نیت کی۔ اگر ہجرت سے
الی اللہ و رسولہ فاجرہ علی اللہ، ومن	مقصود خدا اور رسول تک پہنچنا ہے تو اُسکا ثواب خدا
کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرءۃ	دیگا۔ اگر کسی دنیاوی غرض کے لئے ہے، یا کسی عورت کیلئے
ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ،	ہے، تو اُس کی ہجرت اُسی کی طرف ہے جس کی نیت
(بخاری باب اول)	سے اُس نے ہجرت کی،

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت صلعم نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اس میں پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے، اس میں کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی، اور اُس کے احکام کی اطاعت ہو عبادت ہے، اگر تم اپنی شہرت کے لئے کسی کو لاکھوں دے ڈالو، تو وہ عبادت نہیں، لیکن خدا کی رضا جوئی اور اُسکے حکم کی بجاآوری کے لئے، چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے،

تعلیم محمدی کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی، اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنادیا ہے، اور یہی عبادت سے اسلام کا اصلی مقصود ہے،

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ	اے لوگو! اپنے اُس پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تمکو
وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (بقرہ-۳)	اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا، تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصولِ تقویٰ ہے،

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے، آپ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تقویٰ کی جگہ یہ ہے[1]، اور قرآن نے بھی تقوی القلوب "دلوں کا تقویٰ" کہکر اسی نکتہ کو کھولا ہے، اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے، نماز، روزہ اور تمام عبادتیں سب اُسی کے حصول کی خاطر ہیں، اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جنسے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہیں،

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں، کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند ان مخصوص اعمال کا نام ہے، جنکو انسان خدا کے لیے کرتا ہے، مثلاً نماز، دعا، قربانی، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بیحد وسیع کر دیا، اس تعلیم کے رو سے، ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لئے اور اسکی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے عبادت ہے، اسلام میں خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لیے ہو، یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لئے ہو، لیکن اس کام کرنے سے اُس کام کے کرنے والے کا مقصود، نمایش، دکھاوا، حصولِ شہرت، یا دوسروں کو احسان مند بنانا، وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو، بلکہ محض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضامندی ہو،

اس تشریح کے رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا، محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے اس کو دفعۃً مٹا دیا، دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی، بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے۔ دنیا کے وہ تمام کام جنکو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں، اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کئے جائیں لیکن انکی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمایش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں دین کے کام ہیں، اس لئے دین اور دنیا کے کاموں میں، کام کا تفرقہ نہیں، بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے، تم نے اوپر

---

[1] مسلم کتاب البر والصلہ باب تحریم ظلم المسلم۔ [2] حج رکوع ۴،

پڑھا کہ آنحضرت صلعم نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے، فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، کہ اس کو آرام دو، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اسکی تسلی کرو، اور تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، کہ اس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو، غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا، خدا کے احکام کی اطاعت اور اُسکی عبادت ہے، چنانچہ پاک روزی کھانا اور اسکا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ	اے ایمان والو، ہم نے جو تم کو پاک و ستھری چیزیں
وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ	روزی کی ہیں، ان کو کھاؤ، اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی
(بقرہ ۲۱)	کی عبادت کرتے ہو،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈھنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے، ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لئے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا پر سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ۔ (ھود ۔ ۱۰)	اُسکی عبادت کرو اور اُس پر بھروسہ رکھو۔

اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے، فرمایا

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ۔ (مریم ۔ ۴)	اسکی عبادت کر اور صبر کر،

کسی شکستہ دل سے اسکی تسکین و تشفی کی بات کرنا، اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے، ارشاد ہے،

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ	اچھی بات کہنا اور معاف کرنا، اس خیرات سے بہتر ہے،
يَتْبَعُهَا أَذًى (بقرہ ۔ ۳۶)	جس کے پیچھے ستانا ہو،

اسی آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ صلعم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے،

كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ (بخاری کتاب الادب)	ہر نیکی کا کام خیرات ہے،
تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ صَدَقَةٌ	تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے،

لے صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الضیف،

واماطة الاذی عن الطریق صدقۃ، راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہی،

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت بلکہ بہت سی عبادتون سے بڑھ کر ہے فرمایا،

الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد بیوہ اور غریب کے لئے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا

فی سبیل اللہ وکالذی یصوم النهار و کی راہ مین جہاد کرنے والے کے برابر ہے، اور اس کے برابر

یقوم اللیل، (بخاری۔ ادب) ہی جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھتا ہو،

باہم لوگون کے درمیان سے بغض وفساد کے اسباب کو دور کرنا، اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہی جسکا درجہ نماز، روزہ،

اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے، آپ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا،

الا اخبرکم بافضل من درجة الصیام والصلوٰة کیا مین تم کو روزہ نماز اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی

والصدقة، چیز نہ بتاؤن،

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ارشاد فرمائیے، فرمایا،

اصلاح ذات البین[1]، وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہی،

حضرت سلمانؓ فارسی ایک دوسرے صحابی حضرت ابوذرؓ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ اُن کی بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہین، حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی، تو بولین کہ تمھارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہین ہے، اس کے بعد مہمان کے لئے کھانا آیا، تو ابوذرؓ نے کہا مین روزے سے ہون، حضرت سلمانؓ نے کہا مین تو تمھارے بغیر نہین کھاؤنگا آخر اُنھون نے افطار کیا، رات ہوئی تو ابوذرؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے، حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہو، پچھلے پہر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، اور کہا اب نماز پڑھو، چنانچہ دونون نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ نے اُن سے کہا، اے ابوذرؓ تمھارے رب کا بھی تم پر حق ہے، اور تمھاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تو جس جس کا حق تم پر ہے، سب کو ادا کرو، حضرت ابوذرؓ نے حضرت صلعم کی خدمت مین آکر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی، آپ نے فرمایا،

---

[1] سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الادب باب اصلاح ذات البین ص ۱۹۲۔

کو سلمان نے سچ کہا۔[1]

لوگوں نے آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ تمام کاموں میں سب سے بہتر کون کام ہے؟ فرمایا "خدا پر ایمان لانا، اور اسکی راہ میں جہاد کرنا"، لوگوں نے پوچھا کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے؟ ارشاد ہوا جس کی قیمت زیادہ ہو، اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو، انھوں نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو فرمایا "پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو، یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو اس کا کام کر دو" پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے۔ فرمایا "تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو، یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو"۔[2]

ایک دفعہ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا، خدا اپنے بندوں سے کہیگا کہ "میں نے تم سے کھانا مانگا، تم نے نہ کھلایا" وہ عرض کرینگے "خداوندا! تو نے کیسے کھانا مانگا، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے" فرمائیگا "کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلان بندہ نے تم سے کھانا مانگا، تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے"۔ "اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا" وہ کہیگا کہ "اے پروردگار! میں تجھکو کیسے پانی پلاؤں، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے" وہ فرمائیگا "تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلان بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا۔ تو نے اس کو پانی نہ پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا"۔ "اے ابن آدم! میں بیمار ہوا، تو نے میری بیمار پرسی نہ کی" وہ کہیگا "اے پروردگار! میں کیونکر تیری بیمار پرسی کروں۔ تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے" فرمائیگا "تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلان بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی عیادت نہ کی۔ اگر کرتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا، یا مجھے اس کے پاس پاتا"۔[3]

اس موثر طریقۂ ادا نے خداشناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے، اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا کیا طریقے ہیں۔ حضرت سعدؓ چاہتے تھے کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دیدیں، آپ نے انھیں بتایا کہ "اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہو، اسکا تم کو ثواب ملیگا، یہانتک

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام والتکلف للضیف صفحہ ۹۰۰، [2] ادب المفرد امام بخاری باب معونۃ الرجل اخاہ،
[3] ایضاً باب عیادۃ المرضیٰ،

کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو اُس کا بھی ثواب ہے۔[1] ابو مسعود انصاری سے ارشاد فرمایا مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔[2] غریب و نادار صحابہؓ نے دربارِ رسالت میں ایک دن شکایت کی کہ یا رسول اللہ دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے، ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی روزے رکھتے ہیں، اُن کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں، جو ہم نہیں بجالا سکتے۔ فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور الحمد للہ کہنا بھی صدقہ ہے، یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے، وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے۔ فرمایا کہ اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اُس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملیگا۔[3]

محمد رسول اللہ صلعم کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا، کہ حسنِ عمل، ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے، اور کتنی توبرتو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح کے بعد روشن ہو جائیگا کہ وحیِ محمدی نے بالکل صحیح طور سے خلقتِ انسانی کی غرض و غایت، عبادتِ الٰہی قرار دی ہے،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ — میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے، کہ وہ میری عبادت کریں، (ذریت - ۳۰)

اس آیتِ پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے جنکے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اُس کی اطاعت، اور اسکی خوشنودی کی طلب ہو، اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں، جنکے بحسن و خوبی انجام دینے کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے، یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا،

عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، اس سے یہ شبہہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے، درحقیقت یہ چاروں فریضے عبادت کے

---

[1] ادب المفرد باب یوجر فی کل شی، [2] صحیح بخاری کتاب النفقات، [3] ادب المفرد امام بخاری باب کل معروف صدقہ۔

سیکڑون وسیع معنون، اور اُن کے جزئیات کے بے پایان دفتر کو چار مختلف بابون مین تقسیم کر دیتے ہین، جنہین سے ہر ایک فریضۂ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے۔ جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقرون مین ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھدیتے ہین، اسی طرح یہ چارون فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کامون کو چار مختلف عنوانون مین الگ الگ تقسیم کر دیتے ہین اس لئے ان چار فرضون کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال اور کامون کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہین۔

۱- بندون کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جنکا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے، ایک مستقل باب ہے، جس کا عنوان نماز ہے،

۲- وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لئے کرتا ہے صدقہ اور زکوٰۃ ہے

۳- خدا کی راہ مین ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے تکلیف اور مشقت جھیلنا، اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشون کی نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ مین حائل ہوتی ہین۔ روزہ ہے، یا یون کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے،

دنیائے اسلام مین ملتِ ابراہیمی کی برادری، اور اخوت کی مجمع تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتۂ اتحاد کا قیام، اور اس مرکز کی آبادی، اور کسبِ روزی کے لئے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرعنوان حج ہے،

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کام انہی اصول چارگانہ کے تحت مین داخل ہین، اسی لئے آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستونون پر قائم ہے، توحید و رسالت کا اقرار کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا اور حج کرنا[1]۔ پہلی چیز مین عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے، اور بقیہ چار چیزین ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کامون کو محیط ہین، انہی ستونون پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے،

اس تقریر کا مفہوم یہ نہین ہے کہ یہ چارون فرض عبادتین نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہین ہین

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم کتاب الایمان،

بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چارون عبادتین، اپنے تمام جزئیاتِ باب، اور محتویات کے ساتھ فرض ہین، جو شخص صرف ان چارون فرائض کو جو عنوانِ باب ہین ادا کرتا ہے، اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلو تہی کرتا ہے؛ اسکی عبادت ناقص اور اسکی اطاعت ناکمل ہے، اور اُس کے لئے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جسکا خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے مشکوک ہے، یہین سے یہ شبہہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازین، ہم کو برائیون سے کیون باز نہین رکھتین، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیون نہین بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلون کو پاک صاف کیون نہین کرتی، ہمارا حج ہمارے گناہون کی مغفرت کا باعث کیون نہین بنتا، اور قرنِ اوّل کی طرح ہماری نمازین ملکون کو فتح اور ہماری زکوتین ہمارے قومی افلاس کو دور کیون نہین کرتین، اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیون نہین لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ. (نور - ۷)

اللہ نے اُن سے جو ایمان رکھتے ہین، اور تمام نیک کام کرتے ہین، یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ اُنکو زمین مین خلیفہ بنائیگا،

ایمانِ کامل اور اعمالِ نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا حماقت ہے،

اسی طرح ان چارون جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کرکے، صرف مندرجہ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دنیاے فانی کی بادشاہی کا اہل بنادے، مگر آسمان کی بادشاہت مین اسکو کوئی حصہ نہین ملیگا، اور اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیرؤن کے پاؤن کے نیچے دونون جہانون کی بادشاہیان رکھدے[1]، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کیساتھ سمجھا جائے، جو اسلام کا منشا ہے، اور اسی وسعت کیساتھ اُس کو ادا کیا جائے، جو اسلام کا مطالبہ ہے،

[1] سیرۃ ابن ہشام وفد قریش عند النبی صلعم جلد اول صفحہ ۲۵۲ مطبع محمد علی مصر، کلمۃ واحدۃ یعطونیہا، تملکون بہا العرب وتدین بہا العجم،

نماز

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ،

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے، جو امیر و غریب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار و تندرست، سب پر یکسان فرض ہے، یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال مین بھی ساقط نہین ہوتی، اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہین ادا کر سکتے تو بیٹھکر ادا کرو، اگر اس کی بھی قدرت نہین ہے، تو لیٹ کر کر سکتے ہو، اگر منھ سے نہین بول سکتے تو اشارون سے ادا کرو[1]، اگر رُک کر نہین پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو[2]، اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اُسی رخ پڑھو[3]،

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤن سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اُس رحمان و رحیم کی یاد، اور اُس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسنِ ازل کی حمد و ثنا، اور اُس کی یکتائی، اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور مین جسم و جان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرضِ نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل، اور ہستی کا خلاصہ ہے،

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگون ہونا، اس کے حضور مین دعا و فریاد کرنا، اور اس سے مشکلون مین تسلی پانا، انسان کی فطرت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیون مین کوئی ساز ہے، جو نامعلوم انگلیون کے چھونے سے بجتا رہتا ہے، یہی

---

[1] نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۰۰ بروایت موقوف از دارقطنی، [2] ابو داؤد باب صلوۃ الطالب، [3] مسلم کتاب الصلوۃ باب جواز صلاۃ النافلۃ علی الدابۃ فی السفر حیث توجہت،

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا فطری جواب ہے، قرآن نے جابجا انسانون کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے، اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتین آتی ہین، جب سمندر مین طوفان اٹھتا ہے اور تمھارا جہاز بھنور مین پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو،

غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے، جس کے سامنے وہ جھکے۔ اندرونِ دل کی عرض نیاز کرے، اور اپنی دلی تمناؤن کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادت روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوشِ جنون کا علاج ممکن نہین، وحشی سے وحشی مذہب مین بھی عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسلی کے لئے موجود ہین، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتے ہین؟

چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب مین خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہین، اسلام مین اگر حمد و تسبیح ہے تو یہودیون مین مزمور، عیسائیون مین دعا، پارسیون مین زمزمہ، اور ہندؤن مین بھجن ہین، اور دن رات مین اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک مین بعض اوقات کا تعین بھی ہے، اس بنا پر یقین کرنا چاہئے کہ نماز مذہب کے ان اصول مین سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہین، قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا مین کوئی پیغمبر ایسا نہین آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو، اور اس کی تاکید نہ کی ہو، خصوصاً ملتِ ابراہیمی مین اسکی حیثیت سب سے زیادہ نمایان ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جب اپنے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کی ویران سرزمین مین آباد کرتے ہین تو اسکی غرض یہ بتاتے ہین کہ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ ؕ (ابراھیمؑ) اے ہمارے پروردگار تاکہ وہ نماز کھڑی کرین، حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہین، کہ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي "اے میرے پروردگار مجھکو اور میری نسل مین سے لوگون کو نماز کھڑی کرنے والا

لے قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیون کے پرانے صحیفون مین نماز کے لئے اصطلاحی لفظ "خدا کا نام لینا" تھا، چنانچہ توراۃ اور زبور مین نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا، (پیدایش ۱۲-۴) حضرت اسحٰقؑ نے خدا کا نام لیا، (پیدایش ۲۶-۲۵) حضرت داؤدؑ نے خدا کا نام لیا، (زبور ۱۱۷-۱۹) اور یہ اصطلاح قرآن مین بھی مستعمل ہوئی ہو، وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى (الاعلیٰ) اور اپنے رب کا نام لیا، پس نماز پڑھی اس معنی کی اور بھی آیتین قرآن پاک مین مذکور ہین، یہودیون کے پچھلے صحیفون مثلاً سفر دانیال وغیرہ، اور عیسائیون کے تمام صحیفون مین نماز کیلئے "دعا" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو عربی لفظ "صلوٰۃ" کے ہم معنی ہے، اسی لئے انجیل کے اردو مترجمون نے اسکا ترجمہ نماز کیا ہے، (متی ۶-۱ ۲) اور متی ۲۳-۱۴)۔

بنا؛ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے "وَکَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ" (مریم) اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیتے تھے؛ حضرت شعیبؑ کو اُن کے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں، "اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا" (ھود-۸) کیا تمھاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اُس کو چھوڑ دیں؛ حضرت لوطؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور اُن کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے، "وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ" (انبیا-۵) اور ہم نے اُن کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی۔ حضرت لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں "یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ" (لقمان-۲) اے میرے بیٹے نماز کھڑی کر؛ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا "وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" (طٰہٰ-۱) اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر؛ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور اُن کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" (یونس-۹) اور نماز کھڑی کیا کرو؛ بنی اسرائیل سے وعدہ تھا "اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ" (مائدہ-۳) میں تمھارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کھڑی کیا کرو؛ حضرت زکریاؑ کی نسبت ہے؛ "وَھُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ" (آل عمران-۴) وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے؛ حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں، "وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ" (مریم-۲) اور خدا نے مجھکو نماز کا حکم دیا؛

آیاتِ بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب میں بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے

مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اُمَّۃٌ قَآئِمَۃٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ	اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہوکر
اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ۔ (آل عمران-۱۲)	خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں، مثلاً آپ نے فرمایا کہ جب نماز پڑھو تو تہبند باندھو یا چادر اوڑھ لو، یہودیوں کی طرح (ننگے) نہ پڑھو (صفحہ ۲۷) تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر مت ڈال لو، بلکہ اس کو باندھ لیا کرو (صفحہ ۔۔) نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو (صفحہ ۱۱۲) تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو (صفحہ ۱۱۴) میری امت میں اُسوقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہیگا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کرینگے (صفحہ ۔۔) ان حوالوں

---

[1] کنز العمال جلد چہارم طبع حیدرآباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثیں نقل کیگئی ہیں، اور متن میں اس جلد کے صرف صفحات لکھدیئے گئے ہیں۔

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے،

عرب میں جو لوگ اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، ان میں بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقۂ عبادت سے واقف نہ تھے، چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گذر چکا ہے، کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "اے خدا! مجھے معلوم نہیں کہ میں تجھکو کیسے پوجوں" یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اُسی پر سجدہ کر لیتے تھے،[1] لیکن ایک دو ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے، کسی نے اُن سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے، کہنے لگے جدھر رخ کر لیا،[2] عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے،[3]

وادرکن اعجازًا من اللیل بعد ما اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

(اور ان سواریوں نے رات کے پچھلے حصہ کو اس وقت کے بعد جب عبادت گذار حنیفی نماز پڑھ چکا تھا)

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں مذہب حنیفی کے پیرو پچھلی رات میں نماز ادا کرتے تھے،

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا، اور اُن کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بنکر رہ گئی تھی، اور نماز سے زیادہ انھوں نے قربانی اور نذرانوں پر زور دیا تھا جنمیں خلوص اور خداپرستی کا شائبہ تک نہ تھا، عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھیں، وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے علاوہ اور بھی سیکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے،[4]

دینِ ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے، الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی، اس کی شکل وصورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ آج بھی اُن کے صحیفوں میں اسکی اصلی شکل نظر نہیں آتی، نہ اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفوں کے حامل

[1] ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل ۱۲ [2] صحیح مسلم فضائل ابی ذر ۱۲ [3] لسان العرب لفظ حنف ۱۲ [4] دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت (ورشپ) ۱۲

اور امانت دار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن مؤثر دعاؤن کو پڑھتے تھے، اور اسکی ادائگی کے کیا اوقات تھے، جو کچھ ان مین رہ گیا تھا، وہ صرف عملی رسم و رواج، اور بعد کے مذہبی مقتداؤن کی کچھ تجویزین، جنپر مذہبی فریضہ سمجھکر عمل کیا جارہا تھا، بجز جو نماز کی روح اور نیاز الٰہی کی انتہائی منزل ہے، اس کو یہود و نصاریٰ دونون نے مشکل اور باعث تکلیف سمجھکر چھوڑ دیا تھا، اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل و صورت بھی انھون نے بگاڑ دی تھی، قرآن مجید مین اُن کی اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا گیا ہے،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ
يَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ
سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ
اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا
يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ
وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۗ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا
الصَّلٰوةَ ۗ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ،

(اعراف ۲۱)

ان کے بعد اُنکے وہ جانشین ہوئے جن کو خدا کی کتاب باپ دادون سے وراثت مین ملی، وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا فائدہ لیتے ہین، اور کہتے ہین کہ ہم کو معاف کردیا جائیگا اور اگر ایسا ہی فائدہ اب بھی ان کے سامنے آئے تو لے لین (اور مذہب کی پروا نہ کرین) کیا ان سے کتاب کا معاہدہ نہین لیا گیا کہ وہ خدا کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہین گے اور ان لوگون نے جو کچھ اس (کتاب) مین ہے اس کو پڑھا اور آخرت کا گھر ان لوگون کے لیے ہے، جو پرہیزگار ہین کیا تم نہین سمجھتے؟ اور وہ لوگ جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہین اور جھون نے نماز کو قائم کیا تو ہم اپنی حالت درست کرنے والون (ہم نیکوکارون کا اجر ضائع نہین کرتے)

سورۂ مریم مین تمام انبیائے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ
وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ، (مریم ۴)

ان کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوے جنھون نے نماز کو برباد کردیا، اور اپنی خواہشون کی پیروی کی،

نماز کے ضائع اور برباد کرنے سے مقصود، نماز کو صرف چھوڑ دینا نہین ہے، بلکہ زیادہ تر اُس کی حقیقت اور اُس کی روح

کو گم کر دیا ہے، مسلمان جب اپنی نماز کے لئے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ (نماز کے لئے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے تھے، تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ اُن کی خدا پرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اسکو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں،

وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّلَعِبًا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ۔ (مائدہ) — اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اسلئے کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہیں،

اہلِ عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے، وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے، مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے، بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتوں کی خوشامد یہ ان کی عبادت کا خلاصہ تھا، حج و طواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعائیں مانگتے تو اُن میں بھی بتوں کے نام لے لیتے، اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے، خو دانہ خضوع و خشوع کا اُن کی دعاؤں میں شائبہ تک نہ تھا، مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو اُن کا منہ چڑھاتے تھے، دق کرتے تھے، ڈھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ اُن کے متعلق قرآن نے کہا،

وَمَا کَانَ صَلَاتُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَۃً (انفال) — اور اُن کی نماز خانۂ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجانا ہے،

اگلے مفسروں نے اس آیتِ پاک کے دو مطلب لئے ہیں: ایک یہ کہ واقعًا وہ جو نماز پڑھتے تھے، اُس میں سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر اُن کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے، اور گویا یہی اُن کی نماز تھی،[1] پہلے معنی کی بنا پر تو اُن کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو و لعب تھا، اور دوسرے معنی کے رو سے سرے سے اُن کے ہاں نماز ہی نہ تھی، بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا ہی ان کی نماز تھی،

ایک اور آیت میں ہے،

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی۔ (علق) — کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے،

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، آپ جب صحنِ حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بیفکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے، کبھی آپ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی دق کرتے،[2] کبھی آپ کی گردن میں پھندا

[1] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ، [2] ایضاً

ڈال دیتے،[1] اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے پشت مبارک پر نجاست لاکر ڈالدیتے تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارِ نجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے،[2] اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے آغاز میں تو اخفاء کے خیال سے اور اس کے بعد اُن کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غار یا درہ میں چھپکر نماز پڑھا کرتے تھے، اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے، یا پھر رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے مشرکین اگر کبھی اس حالت میں اُن کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے، ابن اسحٰق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیوں میں چھپکر نماز پڑھتے تھے، ایک دفعہ حضرت سعد بن ابی وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آگئی، اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو بُرا بھلا کہا۔ اور اُن سے لڑنے پر آمادہ ہوگئی،[3]

الغرض جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے، ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے، ان کی نمازیں یا تعمیم اخلاص واثر، سکون و دلجمعی، خشوع وخضوع، اور خوف وخشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کیساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور اُن کی عبادتیں کرتے تھے اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی اُن کے ہاں شرک کا مظہر بنگئی تھی، تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنھوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا، اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا، وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے،

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا، وہ نماز کا تھا، یَاۤ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، (مدثر-۱) "اے لحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ، اور ہشیار کر اور اپنے رب کی بڑائی بول" رب کی بڑائی بولنا یہی نماز کی بنیاد ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتی گئی

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل ابوبکرؓ [2] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب المرأۃ تطرح عن المصلی شیئا من الاذی :

[3] سیرۃ ابن ہشام، (ابتداء ما فرض اللہ سبحانہ من الصلوٰۃ)

اس نقطہ پہنچکر جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے آپنے سونے والون کو جگایا، بھولے ہوؤن کو بتایا، انجانون کو سکھایا اُ
خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست کے سونے چاندی کے، اور اینٹ اور پتھر کے اُن بتون کو جو
خدا کی جگہ کھڑے تھے، دھکیل کر نیچے گرا دیا، صرف ایک خدا کی نماز دنیا مین باقی رکھی، اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدے کو حرام
کر دیا، اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا مین ظاہر ہوئی، آپنے اہل عرب اور دنیا کی بت پرست
قومون کی نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، موثر دعائین تعلیم کین، عیسائیون کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا
کی پرستش کا سبق دیا، یہودیون کو نماز کے خضوع و خشوع، راز و نیاز، اور اخلاص و اثر سے باخبر کیا، اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے عمل
کے ذریعہ سے شکل و صورت اور روح و حقیقت دونون کیساتھ ناقابلِ تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا، حکم ہوتا ہے کہ

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ ۔ (بقرہ۔۳۱)　　نمازون کی نگہداشت کرو۔

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونون حیثیتون سے نگہداشت کا حکم ہے، اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ

وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۔ (انعام۔۱۱)　　اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہین،

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۔ (معارج۔۱)　　جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہین،

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۔　　اور وہ کامیاب ہین، وہ جو اپنی نمازون کی نگہداشت
(مومنون۔۱)　　کرتے ہین،

خود آنحضرت صلعم کو حکم ہوتا ہے، کہ خود بھی نماز پڑھو، اور اپنے اہل و عیال کو بھی اسکا حکم دو، اور اس نماز پر جسکا مکہ کے
قیام کے زمانہ مین ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہو، فرمایا،

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۔　　اور اپنے گھر والون پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اسکے
(طٰہٰ۔۸)　　اوپر جمے (پابند) رہو،

نماز کیسی ہونی چاہیے؟ فرمایا،

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ ۔ (بقرہ۔۳۱)　　اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو،

تعریف کیگئی کہ

اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (مومنون) — (کامیاب ہین وہ مومن) جو اپنی نماز مین خشوع کرتے ہین

حکم ہوا کہ

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اعراف-۷) — تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو،

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (اعراف-۷) — اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کیساتھ پکارو،

وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اعراف-۳) — اور خدا کو پکارو، اس حال مین کہ تم دین کو اسی کیلئے خالص کرنے والے ہو

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہی،

اسلام مین نماز کا مرتبہ اسلام سے پہلے بھی دنیا مین کوئی ایسا مذہب نہین آیا جسمین نماز کو اہمیت نہ دیگئی ہو، لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قومون اور وقتون تک محدود تھے، اس لئے اُن کے اندر سے عملاً اسکی اہمیت جاتی رہی، چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب مین آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرارِ عبودیت اور اسکی حمد و ثنا کو واضح معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہین، یعنی کسی مذہب کے پیروون بلکہ عالمون کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایان نہین ہوتی، ورنہ جیسا کہ گذر چکا، قرآن کے روسے تو دنیا مین کوئی ایسا پیغمبر نہین آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہی کہ اسلام کے سوا وہ کہین نمایان، واضح اور مؤکد صورت مین باقی نہین رہی ہی اور اسکا سبب یہ ہی کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء، اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے، اس لئے اس فریضۂ الٰہی کو دینِ کامل مین ایسی منظم، واضح، مؤکد اور نمایان صورت دیگئی ہی کہ وہ قیامت تک دنیا مین قائم اور باقی رہے،

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جبتک اسمین کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے کسی حالت مین بھی سبکدوش نہین ہو سکتا، قرآنِ پاک مین سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے، اس کے ادا کرنے مین سستی اور کاہلی نفاق کی علامت[1]، اور اُسکا ترک کفر کی نشانی[2] بتائی گئی ہے، یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا،

---

[1] منافقین کی صفت مین ہی وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى (نساء-۲۱) "جب وہ نماز کو اٹھتے ہین تو سست و کاہل ہو کر اٹھتے ہین"۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷ پر)

اور اُس کی تکمیل اُس شبستانِ قدس مین ہوئی جسکو معراج کہتے ہین[1]،

اسلام مین پہلا فرض ایمان اور اُس کے لوازم ہین، اور اُس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے چنانچہ سورۂ روم (رکوع ۴) مین پہلا حکم یہ دیا گیا کہ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، (اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین توحید پر سیدھا رکھ، وہی اللہ کی فطرت جسپر اُس نے لوگون کو بنایا ہے) اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (روم ۴) اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکون مین سے نہ ہو جاؤ،

اس آیتِ پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے، اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکِ نماز سے کفر و شرک مین گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہین خود اُس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلعم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے، اور اُس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے،

چنانچہ آپ نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے، جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے، طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ آکر صلح کی بات چیت شروع کی تو نماز جہاد، اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا، آپ نے دو پچھلی باتون سے مستثنیٰ کر دیا لیکن نماز کے متعلق فرمایا، جس دین مین خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو، اُس مین کوئی بھلائی نہین" آپ نے یہ بھی فرمایا ہے، کہ نماز دل کی روشنی ہے" اپنی نسبت فرمایا ہے، "نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے" ایک تمثیل مین آپ نے فرمایا "انسان آگ مین جلتا رہتا ہے، اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے" یہ محبوب ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے، اور نماز آبِ زلال ہے، جو اس آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپ نے فرمایا کہ کفر اور ایمان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶) فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ، (ماعون - ۱) افسوس ہے ان نمازیون پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہین،

[2] کفار کے بارے مین ہے، لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ، (مدثر - ۲) ہم نمازیون مین نہ تھے" یہ وہ اس وقت کہین گے جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ مین کیون ہو،

[1] کتب صحاح واقعات معراج و اسراء، و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ،

درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے؛ کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں، جنکا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہوسکتا ہے، مسلمان کا وہ عمل جسکے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے نماز ہی ہے، عین اسوقت جب جناب رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبان مبارک سے ادا ہورہے تھے، آپ فرمارہے تھے نماز اور غلام[1]!!

نماز کی حقیقت | نماز کے لئے اصل عربی لفظ صلوٰۃ ہے، صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانوں میں "دعا" کے ہیں اس لئے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے، اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے، معاویہ بن حکم سلمی ایک نومسلم صحابی تھے، ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ جب کبھی کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں تم یرحمک اللہ کہو، اتفاق سے ایک دفعہ نماز باجماعت ہورہی تھی، معاویہ بھی اسمیں شریک تھے، اُن کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی، انھوں نے نماز کی حالت میں یرحمک اللہ کہدیا، صحابہؓ نے ان کو گھورنا شروع کیا، معاویہ نے نماز ہی میں کہا، تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہؓ نے زانو پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جارہا ہے، نماز ہوچکی تو آنحضرت صلعم نے پوچھا کہ نماز میں کون باتیں کرتا تھا، لوگوں نے معاویہؓ کی طرف اشارہ کیا، آپ نے ان کو پاس بلاکر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے کا نام ہے، اس میں انسان کو باتیں کرنا مناسب نہیں[2]، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ الدعاء مخ العبادۃ "دعا عبادت کا مغز ہے" اور حضرت نعمان بن بشیر انصاری روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا الدعاء ھو العبادۃ "دعا ہی عبادت ہے" اس کے بعد آپ نے یہ کہکر کہ تمھارا پروردگار فرماتا ہے، اس تفسیر کی تائید میں یہ آیت پڑھی[3] جس میں دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے۔

---

[1] یہ تمام حدیثیں کنز العمال (کتاب الصلوٰۃ جلد ۴) میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں۔ [2] سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب تشمیت العاطس فی الصلوٰۃ، یہ دو روایتیں ہیں، ہم نے ان دونوں کو جمع کرلیا ہے۔ [3] یہ دونوں حدیثیں جامع ترمذی کتاب الدعوات میں ہیں، دوسری حدیث ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب الدعاء میں اور مستدرک حاکم کتاب الدعاء میں بھی ہے۔

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ، اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (مومن-۶) — مجھ سے دعا مانگو، میں قبول کرونگا، جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عنقریب جہنم میں جائینگے

مستدرک حاکم (کتاب الدعاء) میں ہے کہ آپ نے فرمایا بہترین عبادت دعا ہے۔ اس کے بعد آیت مذکور تلاوت فرمائی۔

قرآن پاک میں حضرت موسیٰ کے قصہ کے ضمن میں نماز کی حقیقت صرف ایک نقطہ میں ظاہر کیگئی ہے، یعنی خدا کی یاد فرمایا۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ، (طٰہٰ-۱) — اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔

کامیابی اسی کے لئے ہے جو خدا کو یاد کرکے نماز ادا کرتا ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی، وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی (اعلیٰ-۱) — کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی اور خدا کا نام یاد کیا پس نماز پڑھی،

انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بےچینی، قلبی اضطراب، اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر واماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز، اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے، تو سکون واطمینان کی راحت اُسکو صرف اُسی ایک قادر مطلق کی پکار، دعا، اور التجا میں ملتی ہے۔ وحیِ الٰہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا،

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (رعد-۴) — ہاں، خدا ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں،

یہی وجہ ہے کہ مصیبتوں کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثباتِ قدم اور دعا ہی چارۂ کار بنتے ہیں،

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ۔ (بقرہ-۵) — ثابت قدمی اور نماز (یا دعا) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو

زمین سے لیکر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر وتوانا کے سامنے سرنگون ہے، آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل، جھاڑ، چرند، پرند سب اس کے آگے سربسجود ہیں، اور اس کے مقرر کردہ احکام وقوانین کی بےچون وچرا اطاعت کررہے ہیں۔ یہی اُن کی تسبیح ونماز ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا — اور دنیا میں کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ بس خدا ہی کی حمد کی

تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط (بنی اسرائیل - ۵) — تسبیح پڑھتی ہے البتہ تم انکی تسبیح سمجھتے نہیں ہو،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ — کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے، اور جو زمین میں ہے

وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ — اور سورج، چاند، تارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے

وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ — آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہت سے آدمیوں پر اس

النَّاسِ، وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ط (حج) — کا عذاب ثابت ہو چکا کیونکہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے

غور کرو! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثنا خدا کے سامنے سرنگون ہے لیکن استثنا ہے تو صرف انسان میں کہ بہتیرے اس کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہتیرے اس سے روگردان ہیں، اسی لئے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے۔ انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثنا، اطاعت گذار ہے، کیونکہ وہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہے، اور قیامت تک مصروف رہیگی، لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پا کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انہی سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع و فرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت و انقیاد اور بندگی و سرافگندگی کی دعوت دیتی ہے، جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے، تو انسان کیوں نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے، اور یہی نماز ہے،

نماز کی روحانی غرض و غایت نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خالقِ کُل، رازقِ عالم، مالک الملک، منعمِ اعظم کی نعمتِ بے بخششوں، اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کریں، تاکہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اسکی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے، اوسکی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے، اس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور ناقابلِ زوال یقین کی صورت میں اسطرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت، اور ہر جسمانی فعل و عمل کے وقت اُس کی ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اوٹھا ہوا دیکھیں جس سے اپنے برے ارادوں پر شرمائیں، اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجکیں، اور بالآخر ان سے بالکل باز آئیں، صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت میں آکر نماز کی حقیقت دریافت کی، آپ نے اس کی

تشریح فرمائی، پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ احسان کیا ہے؟ فرمایا "یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے" اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ "نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کیونکہ اوس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے"[1] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے، اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے، تو آپ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا "لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اس کو جاننا چاہیے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے، نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ"[2] ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں، اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے، اسی لئے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی،

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ (عنکبوت ۵)

اور نماز کھڑی کیا کر، کہ نماز بےحیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے، اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے،

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بےحیائیوں سے روکتی ہے، اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے، اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں، بےحیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے، یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزلِ مقصود اور حقیقی کامیابی ہے چنانچہ فرمایا

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ۙ وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ؕ (اعلیٰ)

کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے، اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے،

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ

تو انہیں کو ہوشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ، باب البزاق فی الصلوٰۃ، صحیح مسلم باب المساجد، مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۳۴ و جلد ۳ صفحہ ۱۷۶ و ۱۸۸ وغیرہ [2] مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۳۶ و ۱۲۹ و ۶۷

وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَمَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی — سے ڈرتے ہیں، اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں، اور جو تزکیہ (دل کی صفائی) حاصل کرتا ہے، وہ اپنے ہی لئے حاصل کرتا

لِنَفْسِہٖ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ۔ — ہے، اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے،

(فاطر-۳)

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اُسکی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی، اور اُس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے، فرمایا،

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّاِذَا مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا ۙ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۙ (معارج-۱) — بیشک انسان بے صبر بنا ہے، جب اُس پر مصیبت آئے تو گھبرا، اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل، لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں،

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لئے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے، نماز کے انہیں ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف وشفاف نہر بہتی ہو، جسمیں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اُس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ، ارشاد ہوا کہ نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو[1]، ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آکر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]،

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ ۔ (هود-۱۰) — اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز کھڑی کیا کر، بیشک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کو،

[1] یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کیساتھ آئی ہے، کنز العمال (جلد ۴ صفحہ ۷، ۹۰) میں حاکم، احمد، ابن خزیمہ، طبرانی، اور بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں، [2] صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوۃ و تفسیر سورۂ ہود،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے، اُن کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے، جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجالائی گئی ہو، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے، جس کے گرجانے سے پوری عمارت کا گرجانا یقینی ہے،

نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت

جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں جنکی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب "قلب کا عالم" اور فلسفہ "نفسیات یا دماغی کیفیات" کہتا ہے، اس کے لئے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں جنکی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور اُن کے صحیح نتیجے مترتب ہوتے ہیں، سائیکالوجی (علم نفسیات) کے انکشافات اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل کھول دیا ہے، اُس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے اندر جس قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہیں، اور اُن کے مناسب شکل و صورت، اور ماحول (گرد و پیش) نہ اختیار کریں، تو ہم کو اُن کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکتی، ہمارے تمام تمدنی، اجتماعی، اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی، اور اجتماعی، مقاصد کے حصول کے لئے رواجی رسوم و آداب اور قواعد و ضوابط مقرر ہیں، معبدوں، ہیکلوں اور گرجوں میں جہاں مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پجاریوں اور کاہنوں کے خاص لباس، خاص رسوم و آداب، سکون و خاموشی، ادب و لحاظ، گھنٹوں کی پرشکوہ آواز، اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں، شاہانہ رعب و داب کے اثرات پیدا کرنے کے لئے شاہی جلوسوں اور سلطانی درباروں میں فوجوں کے پہرے، قوی ہیکل چوبدار، عصا بردار نقیب و چاؤش، خدام کی زرق برق پوشاکیں، ننگی تلواریں، بلند نیزے، تخت و تاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت و نقارہ اور دمبدم دورباش اور نگاہ روبرو کی پر رعب صدائیں ضروری ہیں، کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لئے فضا کا سکون و خاموشی، مقام کی سادگی و صفائی، شور و غوغا، اور شہر و بازار سے دوری ضروری چیزیں ہیں، بزم عروسی کے لئے رنگ و بو، نور و سرور، گانا بجانا، اور عیش و نشاط کا اظہار طبعی ہے۔

انہی طبعی و نفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال میں بھی ان محرکات و آداب و قوانین کی رعایت رکھی گئی ہے، نماز سے

مقصود دل کے خضوع وخشوع، توبہ و انابت پشیمانی و شرمندگی، اطاعت و بندگی، اور خدا کی عظمت و کبریائی، اور اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار، نیز دل و دماغ اور نفس و روح مین پاکی، صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے۔ اس بنا پر نماز کے لئے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کئے گئے جنسے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشو و نما ہو، مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہ عالم کے دربار مین کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچی کئے رہے، طور وطریق اور حرکات و سکنات مین ادب و احترام کا لحاظ رکھے۔ نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہون، اور سب اس کی بارگاہ مین اپنی دعاؤن اور التجاؤن کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے، اور اس مین روحانی فیوض و برکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی و پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے، تو دل کی صفائی و پاکیزگی کا تصور اس کے اندر مؤثر انداز مین کیونکر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ مین جاری و ساری ہے، اندر بنانے کے لئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازون سے جماعت کی نماز، اور گھر کی نمازون سے مسجد کی نماز بہتر ہے، کہ جماعت کا حول اور مسجد کا منظر دونون کی کیفیت کو دو بالا کر دیگا، اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کامون مین اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت اسکولون کی تنظیم اور ان کی درجہ بندی کھیل مین فریقین کی ہمرنگی و ہم لباسی، فوجون مین وردی اور حرکت و عمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے، اور یکسان اسلحہ اور ہتھیار، اور ہمقدم سکون ورفتار کی بھی ضرورت ہے۔ کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت مین چند اشخاص ایسے ہون جو اصلی کیفیت سے متکیف ہون، ان کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسرون کو بھی پرکیف بناتی ہے۔ اور ان سے دوسرا، اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم و بیش پوری جماعت متاثر ہوجاتی ہے، اسی لئے جلسون مین ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتون کو رونا آجاتا ہے۔ نفسیات اجتماع مین یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے۔ غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لئے ان طبعی و نفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے۔ نماز کے آداب شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے۔

ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے

یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ نماز سے مقصود خضوع و خشوع، ذکر الٰہی، حمد و ثنا، اپنے گناہوں پر ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے، یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں جن کے لئے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں ہے، اسی لئے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید و شرط کے بغیر ادا کر سکے، اسکا نام عام تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی ہے، جسکے لئے نہ زمانہ کی قید ہے، نہ مکان کی شرط ہے، نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پا سکتی ہے، چنانچہ خدا نے فرمایا،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ (نساء) پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے، اور لیٹے، یاد کرو،

اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابۂ کرام کی یہی حالت تھی، خدا نے ان کی مدح فرمائی،

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران ۲۰) — جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں،

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے، فرمایا،

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، (نور ۵) — ایسے لوگ ہیں جنکو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے،

نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے.

دوسری عبادت وہ ہے، جو خاص شکل و صورت کیساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ سے ادا کیجائے، اس کا نام نماز ہے، پہلا طرز عبادت انفرادی چیز ہے، اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے، اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے، اور نہ اسلام میں اسکو جماعت کیساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے، وہ تنہائی کا راز ہے، جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہئے، کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے، لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے، اور اسی لئے اس کو جماعت کیساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے، اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے، اگر اس کو جماعت کیساتھ کوئی شخص ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائیگی

لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی ہوگی، دوسرے لفظون مین ہم اسکو یون تعبیر کرسکتے ہین کہ عام ذکر و فکر اور تسبیح و تہلیل، انفرادی طریقۂ عبادت ہے، اور نماز ایک جماعتی شعار ہے، جو خاص ارکان اور شرائط کیساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے، اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت مین حکم ہے، البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کیساتھ ادا نہ ہوسکے تو تنہا بھی اسکو ادا کرنا ضروری ہے، اس کی مثال اُس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل مین اپنی فوج سے جس کے ساتھ اسکو چلنا تھا، کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا، اب تنہا رہ کر بھی اسکو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا،

نماز مین نظام وحدت کا اصول

اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے، وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصلی راز بلکہ سرّ الاسرار ہے، اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ توحید ہے، یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری ہے بلکہ وہ عملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہئے، اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے، نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراوش کرنا چاہئے، اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل و صورت، آئین و طریق، اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا، جماعتین اس کو ایک متحدہ نظام مین ادا نہین کرسکتی تھین، نماز لاکھون کروڑون مسلمانون پر جنھون نے دعوت محمدیؐ کو قبول کیا فرض تھی، اب اگر ان مین سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی کہ جیسے چاہے، جب چاہے، جدھر منھ کرکے چاہے ادا کرے، تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کیطرح اس کی جسمانی اداؤن سے بھی توحید کا راز آشکار ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھون کروڑون مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے،

غرض اس نظام وحدت کا آشکارا و ہویدا کرنا، توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار ہے، اور کروڑون دلون کو جو کروڑون جداجدا اجسام مین ہین، ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ اُن سے واحد نظام کے ماتحت، واحد

صورت وشکل مین واحد اعمال وافعال کا صدور کرایا جائے، چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظامات کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے، قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم وانجمن کی وحدت، کسی مملکت وسلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظامِ وحدت اسی اصول پر قائم ہے، اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے،

نماز مین جسمانی حرکات یہ بھی ظاہر ہے، کہ نماز کی اصل غرض وغایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے، یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اُس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے، غصہ کی حالت مین چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف مین زرد پڑجاتا ہے، خوشی مین کھل اٹھتا ہے، غم مین سکڑ جاتا ہے، جب کسی سے سوال کرتا ہے، تو اس کے سامنے اپنے دونون ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے، تو اس کو دیکھکر کھڑا ہوجاتا ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اُس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل وفروتنی اور خوشامد مقصود ہو تو منھ کے بل گرتا ہے اور پاؤن پر سر رکھدیتا ہے، یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہین، جو ہر قوم مین تقریباً یکسان رائج ہین، اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح نماز کی دعائین انسانی طرز بیان مین ادا کی گئی ہین، اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال وحرکات کی صورت مین رکھے گئے ہین،

انسان کے قلبی افعال واعمال کے مظاہر اُس کے جسمانی اعضا ہین، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ ونیت اور اس کے دلی جذبات واحساسات کے متعلق اُسوقت تک کچھ نہین کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤن اور زبان سے اُن کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے، اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہین کر سکتا، لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ وبرباد ہو جاتی ہے، اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی، اور اس لئے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہین مگر خود بندون کو ان کی ضرورت ہے، کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونون حیثیتون سے عرض والتجا، اور تذلل وعاجزی کی تصویر بنجائین،

انسان اپنے جسم اور روح دونون کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے، اس کی زندگی کے دونون جز خدا کے احسانات و

انعامات سے یکسان گران بار ہین، اس لئے ضرورت ہو کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونون جھک کر سجدۂ نیاز ادا کرین، غرض یہ وجوہ ہین جنکی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونون کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کئے،

اوپر گذر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب مین نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اُس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقون سے کرتے ہین، کھڑے ہوجاتے ہین، جھک جاتے ہین، زمین پر سر رکھدیتے ہین، نماز کے بھی یہی تین رکن ہین چنانچہ آغازِ عالم سے انبیاے کرام علیہم السلام نے جس نماز کی تعلیم انسانون کو دی، وہ انہین تین اجزا سے مرکب تھی، کھڑے ہوجانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھدینا (سجدہ)

ارکانِ نماز معلوم ہوچکا ہے کہ نماز، ملتِ ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تطہیر کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اسکی غرض بھی بتائی گئی،

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُودِ، (حج-۴) — اور میرے گھر کو طواف کرنے والون، کھڑے ہونے والون رکوع کرنے والون، اور سجدہ کرنے والون کیلئے پاک صاف کر،

اس حکم مین نماز کے تینون ارکان، قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے، حضرت مریمؑ کا زمانہ سلسلۂ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، اُن کو خطاب ہوا،

يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ، (آل عمران-۵) — اے مریمؑ اپنے رب کے حضور مین کھڑے ہوکر بندگی کر، اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والون کیساتھ رکوع کر،

اس نمازِ مریمی مین بھی، نماز کے تینون ارکان موجود ہین،

توراۃ کے حوالون سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ مترجمون نے عبرانی اور یونانی لفظون کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم و رواج کے مطابق کردیے ہین، جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑجاتا ہے، بہرحال عبادت اور تعظیم کے یہ تینون طریقے، حضرت ابراہیمؑ کی شریعت اور اُن کی نسل مین جاری تھے، ذیل مین

ہم ان مین سے ہر ایک کا حوالہ توراۃ کے مجموعہ سے نقل کرتے ہین،

قیام "پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور مین کھڑا رہا" (پیدایش ۱۸-۲۲)

رکوع "اور (ابراہیم) زمین تک اُن کے آگے جھکا، اور بولا اے خداوند" (پیدایش ۱۸-۲)

سجدہ "اور یہ سُن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبرگیری کی، اور اُن کے دکھون پر نظر کی، انھون نے اپنے سر جھکائے، اور سجدے کئے" (خروج ۴-۳۱)

"تب ابرہام (ابراہیم) منھ کے بل گرا، اور خدا اُس سے ہمکلام ہو کر بولا" (پیدایش ۱۷-۳)

"تب ابرہام (ابراہیم) نے اپنے جوانون سے کہا تم یہان گدھے پاس رہو، مین اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لیے) وہان تک جاؤن گا، اور سجدہ کر کے پھر تمھارے پاس آؤنگا" (پیدایش ۲۲-۵)

"تب اُس مرد (حضرت اسحاقؑ کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا مبارک خداوند ابرہام کا خدا مبارک ہو" (پیدایش ۲۴-۲۶)

"اور ایسا ہوا کہ جب داؤد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا، جہان اس نے خدا کو سجدہ کیا" (۲ سموئیل ۱۵-۳۲)

زبور مین حضرت داؤد خدا تعالیٰ سے کہتے ہین:-

"اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کرونگا" (زبور ۵-۷)

ان حوالون سے بخوبی ثابت ہے کہ براہیمی ملت مین عبادت اور تعظیم الٰہی کے یہ تینون ارکان موجود تھے، اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے، موجودہ انجیل مین دعا و نماز کا ذکر متی ۶-۵ و ۱۴-۲۳ و ۲۶-۳۶ مرقس ۱۴-۳۲ و لوقا ۲۲-۴۱ وغیرہ مین ہے، طریقۂ نماز مین ایک انجیل مین ایک ہی موقع کے لئے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲-۴۱) اور دوسری مین (متی ۲۶-۳۹) منھ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے، اور بقیہ انجیلون مین خاموشی ہے،

عہد بعثت مین یہود و نصاریٰ مین جو لوگ نماز کے پابند تھے، وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے، کھڑے ہو کر توراۃ یا زبور کی آیتین تلاوت کرتے تھے، اور سجدہ بھی کرتے تھے، قرآن پاک کی شہادت ہے،

لَيْسُوا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ — وہ برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو

يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ — رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدے

(آل عمران ۱۲۰) — کرتے ہیں،

روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کیطرح دونوں ہاتھ جوڑے نہ رہیں[1]، اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہودی بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔

اسلام کی نماز بھی انھیں قدیم ارکان اور فطری شکل و صورت کیساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اب تک چلی آرہی تھی، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے[2]"

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقف عام کر دیا، انسانی آمیزشوں کو نکال کر بھلائے ہوئے فریضوں کو دوبارہ یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بیجان پیکر میں حقیقت کی روح پھونک دی، اس میں اخلاص کا جوہر پیدا کیا، اس کو دین کا ستون بنایا، اور اپنی متواتر تعلیم و عمل سے اسکی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا، اس طرح اس نے اُس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لئے وہ ازل سے منتخب تھا،

یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی کا نام نہیں، بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہیں، رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے، خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے، اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے، تو نماز کو اُس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى — نماز دن کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت کرو، اور خدا کے سامنے

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۔ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا — ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر

اَوْ رُكْبَانًا ج فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا — (پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو ویسے یاد کرو

---

[1] فتح الباری ابن حجر جلد ۲ صفحہ ۲۲۶ مصر، [2] مضمون صلوٰۃ جلد ۴ صفحہ ۹۶۔

عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۔ — جیسے اُس نے تم کو بتایا جو تم نہین جانتے تھے،

(بقرہ - ۳۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس ذکرِ الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جسکی عملی شکل نماز ہے، اور اسی کی تفصیل سورہ نساء مین ہے، اسی طرح جنگ کی نماز مین ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق کہا گیا ہے

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ (نساء - ١٥)

پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور پہلوؤن پر یاد کرو، پھر جب اطمینان ہوجائے تو نماز کھڑی کرو،

اس آیت مین غور کرنے کی دو ۲ باتین ہین، اول یہ ہے کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی، اسکو الصلوٰۃ (نماز) کہا گیا، اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھکر بیٹھکر جھک کر لیٹے اور لڑائی حملہ اور مدافعت کی حالت مین پوری ہوئی اسکو صرف ذکر اللہ کہا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مختصر نماز کو "اقامتِ صلوٰۃ" (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہین کیا گیا، حالانکہ ذکرِ الٰہی، تسبیح و تہلیل اور بعض ارکان بھی اسمین موجود تھے، بلکہ یہ فرمایا گیا کہ پھر جب اطمینان ہوجائے تو نماز کھڑی کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور تلاوتِ قرآن سے جداگانہ ہین یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے ضمن مین ذکر و فکر تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور قرأت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہین جو جنگ کی حالت مین کم یا موقوف ہوگئے تھے، اور اب اس عارضی مانع کے دور ہوجانے کے بعد پھر بدستور نماز مین اُنکی بجاآوری کا مطالبہ کیا جارہا ہے، یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورہ بقرہ مین یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اُس نے بتایا ہے،

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام مین نماز کن ارکان کیساتھ مقرر ہوئی ہے، گو اس کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت صلعم نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی، اور صحابہ کو کس طرح کی نماز سکھائی، کیونکہ نماز کی یہ عملی کیفیت پورے تواتر کے ساتھ اُس عہد سے لیکر آج تک موجود ہے، اور دوست و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم ہے، اور اسلام کے ہر فرقہ مین یکسان طور

عملاً بلا اختلاف مسلّم ہے، تاہم نظر پسند لوگون کے لئے قرآن پاک سے انکا ثبوت پہنچادینا زیادہ مناسب ہوگا،

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ مین مؤدب کھڑے ہوتے ہین،

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ق — نمازون پر (عموماً) اور بیچ کی نماز پر (خصوصاً) نگاہ رکھو،

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۔ (بقرہ ۶-۳۱) — اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو،

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہین کہ

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۔ (اعلی-۱) — اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی،

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۔ (مدثر-۱) — اور اپنے رب کی بڑائی کر،

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز مین بار بار تکرار کیجاتی ہے، اسی حکم کی تعمیل ہے،

اس کے بعد خدا کی حمد و ثنا کرتے، اور اس سے اپنے گناہون کی بخشش چاہتے ہین،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۔ (طور-۲) — اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر،

پھر قرآن پڑھتے ہین،

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۔ (مزمل-۲) — قرآن مین سے جتنا ہوسکے پڑھو،

قرآن کی ان آیتون مین خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہین، اور اس کی حمد خصوصیت کیساتھ بیان کرتے ہین،

جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے،

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۔ اَيًّا مَّا — کہہ اللہ کر پکارو یا رحمان کو پکارو، جو کہکر پکارو سب اچھے

تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۔ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ — نام اسی کے ہین، اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھ، اور نہ

وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۔ — بہت چپکے بیچ کی راہ تلاش کر، اور کہہ کہ حمد اس اللہ کی

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ — جس نے کوئی بیٹا نہین بنایا، اور نہ سلطنت مین کوئی

يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ — اسکا شریک ہے، اور نہ درماندگی کے سبب سے اسکا

وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا ، (اسرائیل-۱۲) کوئی مددگار ہے، اور اسکی بڑائی کر، بڑی بڑائی،

چونکہ اس کی یہ حمد سورہ فاتحہ مین بہ تمام وکمال مذکور ہے، اسی لئے اس سورہ کو ہر نماز مین پہلے پڑھتے ہین، اس کے بعد قرآن مین سے جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اُس کو پڑھتے ہین، پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے ہین یعنی رکوع کرتے

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ، (بقرہ-۵) اور رکوع کرنے والون کیساتھ رکوع کرو،

پھر اس کے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہین،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَ اے ایمان والو! جھکو (رکوع کرو) اور سجدہ کرو اور اپنے

اعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ رب کی پرستش کرو، اور نیک کام کرو، تاکہ کامیاب

تُفْلِحُونَ ، (حج-۱۰) ہو،

ان دونون (رکوع وسجدہ) مین خدا کی تسبیح وتحمید کرتے ہین.

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ، (واقعہ-۲-۳) تو اپنے بزرگ پروردگار (ربِّ عظیم) کے نام کی تسبیح کر،

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ، (اعلیٰ-۱) اپنے برتر رب (ربِّ اعلیٰ) کے نام کی تسبیح کر،

آنحضرت صلعم کی ربانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع مین اور دوسرا سجدے مین ادا ہوتا ہے[1]،

قیام، رکوع اور سجود کی یہ ترتیب، سورۂ حج (۴- ذکر ابراہیمؑ) اور آل عمران (۵- ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ ہی پر ایک رکعت تمام ہوجاتی ہے، سورۂ نساء (۱۵- ذکر نماز خوف) سے ثابت ہے، درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے، پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدے مین گر پڑنا، اس مین خود طبعی اور فطری ترتیب ہے، تعظیم کی ابتدائی اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہوجاتا ہے، جب کیفیات اور جذبات مین گہرائی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے، اور جب فرطِ بےخودی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو اپنے بلند ترین حصۂ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور معظم کے پست ترین حصۂ جسم (یعنی پاؤن) پر رکھ دیتا ہے، یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے، قرآن

---

[1] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب التسبیح فی الرکوع والسجود،

نے کہا ہے،

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ، (علق-۱) اور سجدہ کر اور قریب ہوجا،

گویا سجدہ قربتِ الٰہی کی اخیر منزل ہے، شاید اسی لئے وہ ہر رکعت مین مکرر ادا کیا جاتا ہے،

نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے،

قرآن پاک کی مختلف آیتون مین ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتون کا حکم دیا گیا ہے، جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے، پھر جھکانے، اور سرنگون کرنے کا حکم ہے، مختلف دعاؤن کے پڑھنے کی تاکید ہے، خدا کی تسبیح و تحمید کا ارشاد ہے، دعا اور استغفار کی تعلیم ہے، دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے، رسول پر درود بھیجنے کا امر ہے، اس لئے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتون کے احکام یکجا ہوگئے، اسی لئے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگون جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے، دوسرے لفظون مین یون کہہ سکتے ہین کہ قرآن پاک مین مسلمانون کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قرأتِ قرآن، ذکرِ الٰہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کئے گئے ہین، ان کی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے، جس مین یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہین، دوسری طرف ان احکام کی بجاآوری مین ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے، کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانون کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا، کہ جو چاہے، رکوع کرے، جو چاہے سجدہ کرے، جو چاہے صرف قیام کرے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر و قرأت پر اکتفا کرلے، اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کرکے اس فرض سے ادا ہوجائے تو ہر فرد سے فرائضِ الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے جنپر کبھی عمل نہ ہوتا، اور عجب نہین کہ افراد کی طبعی سستی، اور سہل انگاری ان پورے احکام کی تعمیل مین مانع آتی، سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانون کی عبادت کی واحد اور منتظم شکل پیدا نہ ہوتی، نہ جماعت ہوسکتی، اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادتِ خاص کہا جاسکتا، اور نہ جماعتی رمز و شعار کی وحدت کی شان اُس سے پیدا ہوکر مسلمانون کو واحد امت بناتی اور بتاتی،

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی،[1] اور رسول نے امت کو سکھلایا، اور امت

---

[1] موطا امام مالک و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ،

نے نسلاً بعد نسل موجودہ اور آیندہ نسل کو سکھایا، اور اس پورے تواتر عمل کے ساتھ جس مین ذرا بھی شک و شبہہ نہین، وہ آج تک محفوظ ہے،

نماز کی دعا | نماز کی مختلف حالتون مین اُن حالتون کے مطابق مختلف دعائین پڑھی جاتی ہین، اور پڑھی جاسکتی ہین، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کی مختلف حالتون کی بیسیون مختلف دعائیں مروی ہین، اور ہر مسلمان ان مین سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے، لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے، جس کے نماز مین پڑھنے کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، جس کو آپ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت مین پڑھا ہے، اور اس وقت سے لیکر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہین، وہ سورۂ فاتحہ ہے، جو مقاصدِ نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے، اسی لئے وہ اسلام مین نماز کی اصلی دعا ہے، یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندون کی بولی مین اپنے منہ سے ادا کی،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۭ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ڏ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ؁	حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانون کا پروردگار ہے رحم والا مہربان ہے، ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک (ہے) (اے آقا!) ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہین، تو ہم کو سیدھا رستہ چلا، ان کا راستہ جنپر تو نے فضل کیا، ان کا راستہ نہین جنپر غضب آیا، اور نہ انکا جو بھٹک گئے،
(فاتحہ - ۱)	

(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہین، یعنی اے خدا تو اسکو قبول کر،)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان، ہر نماز مین دہراتا ہے، جس کے بغیر ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہے، [1] یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد و ستایش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا و سزا کا

[1] جامع ترمذی قرأت فاتحہ۔

یقین ہے، عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے۔ توفیق و ہدایت کی طلب ہے، اچھون کی تقلید کی آرزو اور برون کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے، جس وقت اس حمد مین خدا کی پہلی صفت "کل جہانون کا پروردگار" زبان پر آتی ہے، تو اُس کی تمام قدرتین اور بخششین جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہین سب سامنے آجاتی ہین، "جہانون" کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے، سارے جہانون کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائناتِ ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن مین آتا ہے. انسان ہون کہ حیوان، چرند ہون کہ پرند، پھر انسانون مین امیر ہون یا غریب، مخدوم ہون یا خادم، بادشاہ ہون یا گدا، کالے ہون یا گورے، عرب ہون یا عجم، کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکسان معلوم ہوتی ہے، خدا کو "رحمان و رحیم" کہکر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت. بے پایان شفقت، غیر محدود بخشش اور ناقابلِ بیان کیف محبت کا سمندر دل کے کوزہ مین موجین مارنے لگتا ہے. "روزِ جزا کے مالک" کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر، اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے. "ہم تجھی کو پوجتے ہین" کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہین. "ہم تجھی سے مدد مانگتے ہین" بول کر ہم تمام دنیاوی سہارون اور بھروسون کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈھتے، اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیازمند بنجاتے ہیں، سب سے آخر ہم اس سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہین، یہ سیدھی راہ (صراطِ مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہین:

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا	کہدے (اے پیغمبر) آؤ مین تم کو پڑھکر سناؤن
تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ج	جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے. یہ کہ اُس کیساتھ
وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ	شرک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت
نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ج وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ	کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ج وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ	ان کو روزی دیتے ہین، بے حیائی کی باتون کے

الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ
بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ
الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ
اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ
لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا
قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ
بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ
مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ

(انعام - ۱۹)

نزدیک نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر میں (فحش) ہوں یا
باطن میں، جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے اس کو
مت مارو، لیکن انصاف کیساتھ، یہ وہ باتیں ہیں
جنکا حکم خدا نے تم کو دیا ہے، شاید کہ تم سمجھو، اور یتیم
کے مال کے پاس مت جاؤ، لیکن اچھی نیت سے،
یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے، اور ناپ
اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو، ہم کسی کو اس
کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے، جب تم بات
بولو تو انصاف کی، گو وہ تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو،
اور خدا کے عہد کو پورا کرو، یہ وہ باتیں ہیں جنکا خدا نے
تم کو حکم دیا ہے، تاکہ تم نصیحت پکڑو، اور بے شبہ یہی ہے
میرا سیدھا راستہ (صراط مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو،

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحی محمدی کی اصطلاح میں "صراطِ مستقیم" کیا ہے یعنی شرک نہ کرنا، ماں باپ کیساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا) یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں دیانتداری، بلا رو رعایت سچ بولنا، اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفاتِ عالیہ ہیں جن کو "صراطِ مستقیم" کی مختصر سی ترکیب توصیفی میں ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہیں، جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہیں،

یہی وہ صفاتِ حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جنپر اس کا فضل و انعام ہوا، یہ خاص بندے کون ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ؕ (نسآء-۹)

اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہین، تو وہ اُن لوگون کے ساتھ ہین جنپر خدا کا فضل اور انعام ہوا، یعنی نبی، صدیق، شہید، اور صالح لوگ، ان کی رفاقت کیسی اچھی ہو،

اس بنا پر ہر نمازی جس صراطِ مستقیم اور راہِ راست کے لئے دعا کرتا ہے، وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے، جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین) علی قدر مراتب چل چکے، سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے، (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے اور (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت مین ہم اپنی طرف سے بدعتون کا اضافہ کرین، یہ گمراہی ہے، اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دین، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے، اور ہر قسم کا انعام واکرام چھین لیا جاتا ہے، پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہین، جنھون نے دین مین اپنی طرف سے ہزارون باتین اضافہ کردین، دوسری کا نمونہ یہود ہین، جنھون نے احکامِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا، اور ہر قسم کے انعام واکرام سے محروم ہوگئے، مسلمانون کی دعا یہ ہے، کہ الٰہی ہم کو ان دونون غلط راستون سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی یہ دعا (سورۂ فاتحہ) دین ودنیا کی دعاؤن کی جامع، جسم وروح کی نیکیون پر مشتمل، اور اخلاق وایمان کی تعلیمات کو محیط ہے، اس مین خدا کی حمد بھی ہے، اور بندے کی التجا بھی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے اس کی نسبت فرمایا:-

> جو نماز مین اس سورہ کو نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص اور ناکمل ہے، خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصون مین بٹی ہوئی ہو، آدھی میرے لئے ہے، اور آدھی اس کے لئے، بندہ جب الحمد للہ رب العٰلمین (حمد ہو سارے جہانون کے

پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری ستایش کی" پھر جب وہ الرحمٰن الرحیم (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری تعریف کی" پھر وہ کہتا ہے مالک یوم الدین (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی" اتنا میرا حصہ ہے، اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے، کہ "ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) اور اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراط مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا[1]۔

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اُس دعا کا جو دلکش و دلفریب نظارہ نظر آتا ہے وہ روح میں نشاط، اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے، یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یورپین فاضل اے جی ونسنک (A.G.WENSINCK) کو بھی جس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پر معلومات مضمون لکھا ہے، تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"(اسلام کے رو سے) نماز حضورِ قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہئے ایک دفعہ محمدؐ نے ایک پر نقش و نگار کپڑے کو اس لئے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے، یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اس میں دلی خضوع و خشوع کی بھی ضرورت ہے، اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے، جس میں محمدؐ نے کہا ہے، کہ مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے، محمدؐ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے، نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے، جس کو ہم ان دو حدیثوں میں پاتے ہیں جنہیں بیان ہے کہ نماز

[1] جامع ترمذی تفسیر فاتحہ و مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۴۱ (مصر)

خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے۔ اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیثِ قدسی میں ملتی ہے؛

کہ "سورۂ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے"[۱]۔

اس دعائے محمدی کا موازنہ دوسرے انبیا کی منصوص دعاؤں سے

دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور نماز میں پڑھنے کیلئے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو، کوہِ طور پر جلوۂ ربانی کے وقت حضرت موسیٰؑ نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ توراۃ کی کتاب خروج میں موجود ہے، زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے، مگر اس میں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ "داؤد کی نماز" انجیل میں حضرت عیسیٰؑ اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں، جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزو ہے، ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر محمد رسول اللہؐ کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت، حسنِ تعبیر، جامعیت، پاکیزگی، اور اختصار کا اندازہ ہوگا، اور پتہ چلے گا کہ اسکی کیا بے مثالی ہے جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لئے اسی کا انتخاب ہوا؟ اسی لئے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت اُبیؓ سے فرمایا تھا کہ "نماز میں جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی اُم القرآن، قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ توراۃ میں اتری نہ انجیل میں نہ زبور میں، اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے"[۲]۔ اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا

توراۃ کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ توراۃ لینے اور ربانی تجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لئے کوہِ طور پر چڑھے، اور تجلی نظر آئی، تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے اس وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ دعا تعلیم کی،

> خداوند، خداوند، خدا، رحیم، اور مہربان، قہر میں دھیما اور بہت الفیض و وفا، ہزار پشتوں کیلئے فضل رکھنے والا، گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا لیکن وہ ہر حال میں معاف نہ کرے گا،

[۱] صحیح مسلم ... [۲] جامع ترمذی فضائل سورۂ فاتحہ

بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے تیسری
اور چوتھی پشت تک لیگا۔“ (۳۴-۶)

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت مؤثر ہیں، لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہے، پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر میں بابِ اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے،

زبور میں حضرت داؤدؑ کی نماز کی دعا | زبور باب ۸۶،

داؤد کی نماز

”اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سن کہ میں پریشان اور مسکین ہوں۔ میری جان کی حفاظت کر کہ میں دیندار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجھ پر ہے، رہائی دے، اے خداوند مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہوں، اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند میں اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہوں، کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے، اور بخشنے والا ہے، اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں، وافر ہے،

اے خداوند! میری دعا سُن، اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، میں اپنے بپت کے دن تجھ کو پکاروں گا، کہ تو میری سنیگا، معبودوں کے درمیان اے خداوند تجھ سا کوئی نہیں، اور تیری صنعتیں کہیں نہیں، اے خداوند! ساری قومیں جنھیں تو نے خلق کیا، آئینگی، اور تیرے آگے سجدہ کرینگی، اور تیرے نام کی بزرگی کرینگی کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے، تو ہی اکیلا خدا ہے،

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتا میں تیری سچائی میں چلونگا، میرے دل کو یکطرفہ کر، تاکہ میں تیرے نام سے ڈروں، اے خداوند! میرے خدا میں اپنے سارے دل

سے تیری ستایش کرونگا، اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کرونگا کہ تیری رحمت
مجھ پر بہت ہے، اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دی ہے،
اے خدا، مغرورون نے مجھ پر چڑھائی کی ہے اور کٹر لوگوں کی جماعت میری جان
کے پیچھے پڑی ہے، اور انھون نے مجھ کو اپنی آنکھون کے سامنے نہین رکھا، لیکن تو اے خداوند
خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے، اور شفقت اور وفا مین بڑھکر ہے، میری
طرف توجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش، اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو
نجات دے، مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا، تاکہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہین، دیکھین اور
شرمندہ ہون، کیونکہ تو نے اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی۔

اس دعا مین بھی وہی خدا کی حمد و صفت اور توحید و عبادت کا ذکر، راہ راست کی ہدایت کی طلب اور شریرون اور گمراہون سے بچائے جانے کی درخواست ہے، لیکن طول، تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہین بن سکتی، اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز مین پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے،

انجیل مین نماز کی دعا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریون کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہین:-

"اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے، تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آوے، تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمین دے، اور ہمارے قرض ہمین معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرضدارون کو معاف کرتے ہین، اور ہمین آزمایش مین مت ڈال بلکہ برائی سے بچا کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے، آمین،"

نام کی تقدیس" خدا کی حمد" ہے، "بادشاہت کے آنے" سے مقصود شاید قیامت، اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے، جو دعائے قرآنی مین مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ، کے لفظ سے ادا ہوا ہے، نیز استعارہ کی زبان مین "روز کی روٹی" سے مراد دنیاوی روٹی نہ لیجائے، بلکہ روح کی غذا یا صراطِ مستقیم لیجائے، اور "قرض" سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائین جو خدا کی طرف سے، انسانون پر عائد ہین، "آزمایش" مین نہ پڑنے اور برائی سے بچنے کے معنی وہی لئے جاسکتے ہین، جو اسلامی دعا کے خاتمہ مین مذکور ہے کہ "نہ اُن کا راستہ ہو جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بھٹک گئے ہین"۔

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چارون دعائین جو چار اولوالعزم پیغمبرون کی زبانِ نبوت سے ادا ہوئین ہین، کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہین جو تکمیلِ دین کے مختلف مدارج مین کسی کو نظر آسکتی ہے، دعائے محمدی تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے، وہ مختصر ہے، تاثیر سے لبریز ہے، خدا کی تمام صفاتِ کاملہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکامِ شریعت کی جامع ہو، اس کے الفاظ مین ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت مین ہر انسان کے دل کی نمایندگی کر سکتی ہے، وہ ایسے استعارات سے پاک ہے، جو ظاہر بینون کی لغزش کا باعث ہون اور خدا کو انسانون سے رحم و کرم کی صفت "قرض" لینے پر آمادہ کرتے ہون، نیز وہ خدا کی رحمتِ عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے، جسمین کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہو، خدا کی وہ تین صفتین جنکا تصور کئے بغیر خدا کا تصور پورا نہین ہو سکتا۔ (یعنی، ربوبیت، رحمت، اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، ربوبیت مین وہ تمام صفتین داخل ہین، جنکا تعلق پیدایش سے لیکر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے، جس مین اس کی تمام جمالی صفتون کی نیرنگیان ظاہر ہوتی ہین، مالکیت اس کی تمام جلالی صفتون کا مظہر ہے، اور پوری سورہ دعا کے اغراض ثلاثہ حمد، اچھائیون کے لئے درخواست، اور برائیون سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے، طرزِ بیان خدا اور بندہ کے شایانِ شان ہے، درخواستین حد درجہ مؤدبانہ ہین، اوصافِ الٰہی وہی ہین جو ایک دعا کے مناسب

ہو سکتے ہیں، دعا میں عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے، للہیت اور روحانیت کا کمال منتہائے نظر ہے، اس لئے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے، خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤں میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے، یعنی دونوں حصوں نے مناسبت کیساتھ جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت، اور بندہ کے خشوع و خضوع، بلند حوصلگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع، مختصر، اور پُر اثر بیان سورۂ فاتحہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے؟

نماز کے لئے تعیین اوقات کی ضرورت

نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقاتِ نماز کی تعیین ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا، اس لئے کسی کام کے کرنے کیلئے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لئے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم جس دین کامل کو لے کر مبعوث ہوئے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہیں اس نے نماز کی تعلیم دی، تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اس لئے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے۔ انسان کی نفسی (سائیکولاجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کیساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے، جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کرلے کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلاناغہ انجام نہیں دے سکتا، اسی لئے ہر منظم، باقاعدہ، اور دائمی عمل کیلئے اوقات کی تعیین ضروری ہے۔ اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لئے اختیار کیا ہے۔ اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کی لیے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے، تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے، یہانتک کہ دن تمام ہو جاتا ہے۔ اور آخری گھڑی بھی گذر جاتی ہے، اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا، لیکن جب کاموں کے لئے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے، اور وہ

وقت گذرنے نہین پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے۔ اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے۔ اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلاناغہ انجام پاتے جاتے ہین،

اوقاتِ نماز کے تقرر مین وہ چیز بھی مدنظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی اصولِ وحدت جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے، مسلمان مختلف شہرون، ملکون، اور اقلیمون مین ہزارون لاکھون اور کرورون کی تعداد مین آباد ہین، مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت مین وحدت کا مرقع بنجاتی ہے، کرہ ہوا مین لگی ہوئی دوربین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت مین لاکھون کرورون انسانون کو ایک ہی وضع مین ایک ہی شکل مین خالقِ عالم کے سامنے سرنگون پاؤگے، اور جہانتک مطلع ومغرب مین نمایان فرق نہ ہوگا، یہی منظر آنکھون کے سامنے رہیگا، مختلف ملکون مین طلوع وغروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہین ہونے دیتا، تو کم ازکم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جب وقت جس حالت مین ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے، جب دوسری جگہ بھی اُسی حالت مین ہوتا ہے، تو نماز کا فرض اس وقت وہان ادا ہوتا ہے، یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحۂ ارضی تو کجا ایک محلہ اور ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت مین نظر نہین آسکتے تھے،

نماز کے اوقات دوسرے مذہبون مین

اسی لئے اوقات کے تقرر اور تعین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبون نے یکسان تسلیم کیا ہے، اور اپنے اپنے نظریون اور اصولون کے مطابق عبادتون کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہین۔ ہندو آفتاب کے طلوع وغروب کے وقت پوجاپاٹ کرتے ہین، زردشتی صرف طلوعِ آفتاب کے وقت زمزمہ خوان ہوتے ہین، رومن کیتھولک عیسائی صبح کو طلوعِ آفتاب سے پہلے، پھر شام کو، پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہین۔ یہودیون مین تین وقت کی نمازین ہین جنکو "تفلا" کہتے ہین۔ دانیال نبی کی کتاب مین ہے،

"جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہوگئے تو وہ اپنے گھر آیا، اور اپنی کوٹھری کا دروازہ جو بیت المقدس کیطرف تھا کھول کر اور دن بھر مین تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا

کے حضور مین جس طرح سے پہلے کرتا تھا دعا اور شکر گذاری (حمد) کرتا رہا۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے" (۶-۱۰ تا ۱۳)

حضرت داؤدؑ کی زبور مین ان تین وقتون کی تعیین ان لفظون میں ملتی ہے،

"پر مین خدا کو پکارون گا، تب خدا مجھے بچا لیگا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو مین فریاد کرونگا، اور نالہ کرون گا، سو وہ میری آواز سُن لیگا" (۵۵-۱۶ و ۱۷)

اسلامی اصطلاح مین ہم ان کو فجر، ظہر، اور مغرب کی نمازین کہہ سکتے ہین،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعاؤن اور نمازون کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی۔ لوقا کی انجیل مین ہے:

"پھر اس نے (حضرت عیسیٰؑ نے) اس لئے کہ ان کو ہمیشہ دعا مین لگے رہنا اور سستی نہ کرنا ضرور ہے، ایک تمثیل کہی، (۱۸-۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی شریعت مین بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیون مین تھے، اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز اُن کے ہان بھی تھی، چنانچہ اعمال مین ہے:

"پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا" (اعمال ۱۰-۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے، ایک جگہ ہے،

پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ہیکل کو چلے" (اعمال ۳-۱)

یونانی مین تیسرے پہر کے بجائے "نوین گھڑی کو" لکھا ہے جسکو ہم عصر کہتے ہین، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰-۳۰ مین بھی ہے،

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی، آپنے بتائی اور فرمایا، کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے،

"اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا، جب مانگ چکا ایک نے اس کے شاگردون

مین سے اس سے کہا کہ اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکہا، جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰؑ)
نے اپنے شاگردون کو سکھایا، اس نے اُن سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو۔ . . .
. . . . . . اس نے اُن سے کہا تم مین سے کون ہے جسکا ایک دوست ہو اور وہ
آدھی رات کو اس کے پاس آ کے کہے اے دوست مجھے تین روٹی ادھار دے" (لوقا ۱۱-۱)

اس تمثیل مین حضرت عیسیٰؑ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے، چنانچہ جس شب کو انھین گرفتار کیا گیا، وہ ایک جماعت کیساتھ اسی نماز تہجد مین مصروف تھے، (لوقا ۲۲-۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل مین موجود ہے، مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت مین ہے "اور بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اُٹھکے نکلا اور ایک ویران جگہ مین گیا اور وہان دعا مانگی" بلکہ عربی ترجمے سے جو براہِ راست یونانی سے[1] ہوا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام روزانہ اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ اس مین اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے وَفِی الصبح باکرا قام وخرج الی موضع خلاء وکان یصلی هناک، یعنی وہ وہان نماز پڑھا کرتے تھے،

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی مقدس کتابون مین مذکور ہین ہم جمع کرلین، تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائین گے، جنین سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵-۱۶ و ۱۷) مین، صبح کا مرقس (۱-۳۵) مین، عصر کا اعمال (۳-۱ و ۱۰-۳ و ۳۰) مین ہے، اور عشاء رات کی نماز کا لوقا (۱۱ و ۲۲-۳۹) مین!

نماز کے لئے مناسب فطری اوقات

اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتون کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز مین مصروف رہتا، مگر انسان کی فطری و نوعی کمزوریون کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا، اس لئے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لئے چند مناسب اوقات مقرر

[1] مطبوعہ لندن ۱۸۲۵ء [2] مطبوعہ مطبعہ ادبیہ بیروت ۱۸۹۶ء و مطبع آکسفورڈ ۱۸۶۹ء،

کردیئے، ہرانسان ہرروز مختلف قسم کے کامون مین اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کرکے تھوڑی دیر سستاتا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے، اور اس کو تمام کرکے سیروتفریح اور دلچسپ مشاغل مین دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آکر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے، اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اسلامی نمازون کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے، تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی مین محسوب ہون، نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حیَّ علی الصلوٰۃ کا نغمۂ جانفزا سناتی ہے اور ہر شئی کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح وتحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے، تو یہ وقت غافل انسانون کے سر جھکانے کے لئے بھی نہایت موزون ہے، کہ کتاب زندگی مین حیات امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس دن کے کارنامون کی لوح پر سب سے پہلے سجدۂ نیاز کا طغرا نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت ومشقت کا آغاز کرتا ہے، اور دوپہر تک اس مین مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کرکے آدمی تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ دن کا آدھا کام بخیر وخوبی ختم ہوگیا، پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کرکے سیروتفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہین، تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے، جو دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کامون کے بعد اب آرام وسکون کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ اسکا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت جب انسان اپنی با احساس زندگی سے کچھ دیر کے لئے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لیکر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھون کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا، اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیئے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہین،

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہین، اسی لئے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہین رکھی گئی، اسی طرح عشا سے لیکر صبح تک کوئی فرض نماز نہین ہے، یہ وقت صرف خواب راحت کے لئے موزون ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمامتر انسان کے کام کے ہین، انہین کام کے اوقات کے تشریع مین نماز پنجگانہ مقرر ہوئی ہے،

اسلامی اوقات نماز مین ایک نکتہ،

اوقاتِ نماز کی تعیین مین اسلام کے لئے ایک اور اصول کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانون کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسدِ کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے، ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان، ہر جگہ سورج کی پرستش کیجاتی تھی، جس کی روشنی قلوبِ انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قومون مین آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکت نیمروز کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالمِ کائنات سے رخصت ہو کر نقابِ شب مین اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے،

سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی کا چراغ گل کیا، حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ملتِ ابراہیمی مین نماز کے وہ اوقات مقرر کئے گئے، جب ستارہ پرستون کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہین، بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے، تاکہ یہ اوقات خود زبانِ حال سے شہادت دین کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اُس خدائے برحق کی عبادت ہے، جس کے آستانۂ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے، دینِ محمدی، ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لئے اس مین بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملتِ ابراہیمی مین تھے،

لے قرآن پاک سورۂ انعام۔ ۹،

دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردۂ عدم مین روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچکر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی تین دور ہوتے ہین، جب سر (سمت الراس) سے نیچے اترتا ہے جس کو زوال کہتے ہین، جب آنکھون کے دائرۂ تقابل سے نیچے اترتا ہے، جس کو عصر کہتے ہین، اور پھر جب دائرۂ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہین، آفتاب کے ان تینون اوقاتِ انحطاط مین ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر مین مدفون ہوجاتا ہے، اُس وقت عشاء کی نماز ادا کیجاتی ہے، اسی لئے قرآنِ پاک مین نماز کے اوقات کے ذکر مین آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے،

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (اسرائیل - ۹)

نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت رات کی تاریکی تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز (تفصیل آگے آتی ہے)

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام مین کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہین رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازین آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات مین ہین، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام مین آفتاب نکلتے وقت، اُس کے عروج وکمال کے وقت، اور اس کے ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستون کی عبادت کے خاص اوقات ہین[1]

اسلام مین طریق و اوقاتِ نماز

نماز کس طرح اور کن کن اوقات مین اور کے کے رکعتین کرکے پڑھنی چاہئے، اور اس کے کیا کیا آداب وشرائط ہین، ان سب کے لئے قرآنِ پاک مین ایک جامع آیت ہے، جو لڑائی کی حالت مین نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ مین مذکور ہے،

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوٰة، الاوقات التی نہی عن الصلوٰة فیہا ۱۲

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ. فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا فَاِذَا اَمِنْتُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ، (بقرہ ۵-۳۱)

نمازون پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو، اور اللہ کے لئے (نماز مین) ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر (دشمنون کا) خوف ہو تو پیادہ ہو کر، یا سوار ہو کر (نماز پڑھ) پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے،

اس آیتِ پاک سے یہ بات بتصریح ظاہر ہوتی ہے. کہ ان باتون کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات مین اور کتنی رکعتون کے ساتھ پڑھنی چاہیئے خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے، جس طرح خود قرآنِ پاک کی، اس اجمال کی تفصیل سنتِ نبوی کے ذریعہ احادیث مین تحریرًا، اور مسلمانون کے نسلًا بعد نسلٍ متفقہ تواترِ عمل مین عملًا موجود ہے، اور قرآنِ پاک مین اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہین،

نمازون کی پابندی ونگرانی

اس سلسلہ مین سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازون کو پابندی سے ادا کرین. ان کی نگہداشت رکھین اور ان پر مداومت کرین. قرآنِ پاک مین نماز کی پابندی، نگہداشت اور مداومت کے لئے ایک خاص لفظ "محافظت" کا استعمال کیا گیا ہے. جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہین، اور جس کی وسعت مین پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا، اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہین، فرمایا،

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلٰوٰتِ . (بقرہ ۷-۳۱) نمازون کی نگرانی رکھو،

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ . (معارج-۱) اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہین،

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ . (مومنین-۱) اور جو لوگ اپنی نمازون کی نگرانی رکھتے ہین،

وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ . (انعام-۱۱) اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہین.

ایک آیت مین یہ بھی فرمایا،

الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَائِمُوْنَ (معارج ۱) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں،

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے،

نماز کے اوقات مقرر ہیں اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں، ارشاد ہے،

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا، (نساء ۱۵) بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے،

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازوں کے لئے اوقات مخصوص ہیں،

وہ اوقات کیا ہیں اور اسے نماز کے لئے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کئے ہیں، صلوۃ یا اقامتِ صلوۃ، تسبیح، اور ذکر اللہ، پہلا لفظ اقامتِ صلوۃ نماز کے لئے مخصوص ہے، لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح و تحمید اور یاد الٰہی اور نماز کے لئے بولا جاتا ہے جس کا جزو اعظم تسبیح و تحمید ہے، احادیث میں بھی تسبیح[1] کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں، اور اشعار عرب[2] و لغت عرب[3] سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، قرآن میں جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہو گی تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ وقت مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے، البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے، اس سے خدا کی عام یاد و توصیف مراد ہو سکتی ہے،

اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر نظر کرنی چاہیے،

---

[1] صحیح مسلم باب صلوۃ الضحیٰ، ما رایت رسول اللہ صلعم یصلی سبحۃ الضحیٰ قط، وانی لاسبحہا نیز صحیح مسلم، باب جواز النافلۃ علی الدابۃ دباب وکنت اسبح فقام قبل ان اقضی سبحتی،

[2] اعشیٰ وائل کا شعر ہے، وسبح علی حین العشیات والضحیٰ ولا تحمد الشیطان واللہ فاحمدا (شعراء الجاہلیۃ جلد ۳ صفحہ ۳۶۵)

[3] لسان العرب جلد ۳ صفحہ ۳۰۱ مصر

۱- قُمِ اللَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ
مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ
تَرْتِيْلًا ؕ (مزمل-۱)

۱- رات کو کھڑا رہا کر، مگر کچھ کم، یا آدھی رات
یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا دے، اور قرآن
(آہستہ) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔

۲- وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (المؤمن)

۲- اور اپنے پروردگار کی حمد سہ پہر اور صبح کو کر۔

۳- وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۔ (احزاب-۶)

۳- اور تم اوسکی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو۔

۴- وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۔ (فتح-۱)

۴- اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو۔

۵- وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا
وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ
بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ
(اعراف-۲۴)

۵- اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں
گڑگڑا کر اور ڈر کر، اور پست آواز میں
صبح کو اور سہ پہر کو یاد کر، اور بھولنے
والوں میں سے نہ ہو۔

۶- وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ
بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ۔ (انعام-۶)

۶- اور (اے رسول) اُن کو مت نکال جو
اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں۔

۷- فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ
وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا
بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۔ رِجَالٌ ۔ الآية
(نور-۵)

۷- ان گھروں میں جن کے بلند کرنے کا حکم
خدا نے دیا ہے، اور ان میں خدا کا نام
لیا جاتا ہے اور اُن میں وہ لوگ جنکو دنیا کا
کاروبار خدا سے غافل نہیں کرتا، صبح اور سہ پہر کو
خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں،

۸- وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ۔ (کہف-۴)

۸- اور تو (اے رسول) اپنے کو اُن لوگوں
کیساتھ روکے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح
[illegible]

٩- وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (طور-٢)

٩- اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر، جب تو اٹھتا ہے، اور رات کے کچھ حصہ مین اسکی تسبیح کر اور ستارون کے پیٹھ پھیرتے وقت۔

١٠- وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ۔ (هود-١٠)

١٠- اور نماز کو قائم کر دن کے دونون کنارون مین اور رات کے کچھ ٹکڑون مین،

١١- وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ، اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا، وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ۔ (اسرائيل-٩)

١١- نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی ابتدائی تاریکی تک، اور فجر کا پڑھنا، بیشک فجر کا پڑھنا پر حضور ہے، اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ، (تہجد)

١٢- وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا۔ (دهر٢)

١٢- اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر، صبح کو، سہ پہر کو، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر، اور بڑی رات تک اسکی تسبیح کر۔

١٣- فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى (طه-٨)

١٣- کافرون کے کہے پر صبر کر، اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے، اور رات کے کچھ حصون مین اس کی تسبیح پڑھ، اور دن کے کنارون مین، تاکہ تو خوش رہے۔

١٤- فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ. وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ

١٤- تو خدا کی تسبیح پڑھو، جب شام کرو، اور جب صبح کرو، اور اسکی حمد آسمانون، اور زمین

وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (روم-۲)	ہین، اور سہ پہر کو اور جب تم دوپہر کرو
۱۵- فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ	۱۵- تو ان کافرون کے کہے پر صبر کر، اور
قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ	اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب
وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ،	نکلنے سے پہلے، اور ڈوبنے سے پہلے، اور کچھ
(ق-۳)	رات مین تسبیح پڑھ اور ڈوبنے کے بعد،
۱۶- مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ	۱۶- فجر کی نماز سے پہلے، اور جب دوپہر کی گرمی
ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ	کے سبب کپڑے اتارتے ہو، اور عشا کی
صَلٰوةِ الْعِشَآءِ، (نور-۸)	نماز کے بعد،

ان اوپر کی آیتون مین نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے۔ ان مین سے بعض مکرر ہین، اور بعض نہین، مگر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہین، جنمین رسول اللہ صلعم تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے۔ اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ، اور اُس وقت سے لیکر آج تک تمام روے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسلٍ ادا کرتے آئے ہین، اور جن کے مشہور نام فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا ہین، غدو، غداۃ، بکرہ، فجر، قبل طلوع الشمس، اور حین تصبحون کے معنی صبح کی نماز، اصیل، عشی، اور قبل غروب شمس، سے مراد عصر، دلوک الشمس (زوال) اور حین تظہرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرف النہار (دن کا کنارہ) اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب، اور من آناء الیل (کچھ رات گذرے) غسق الیل (رات کی ابتدائی تاریکی، اور صلوٰۃ العشاء سے مقصود عشا کی نماز ہے، اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہین جنمین خدا کی یاد اور تسبیح و تحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے، کہ کس غربت، مظلومی اور بے سروسامانی کیساتھ ہوا تھا، اس لئے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، سورۂ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے، یہ آیتیں آئی ہیں،

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝

(مزمل - ۱)

اے کملی اوڑھ کر سونے والے: تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر، آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ، اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں (یعنی شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں) بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے، اور قرآن سمجھکر پڑھنے کے لئے زیادہ مناسب ہے، بے شبہ تجھ کو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے،

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جا سکتی تھی، کیونکہ جہاں وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (شعراء - ۱۱) (اپنے قریب کے اہل خاندان کو ہشیار کرو) کے ذریعہ سے

دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے، وہین یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے،

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۙ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ۙ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ۙ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۔ (شعراء - ۱۱)	اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ، جو تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے جب تو (نماز کے لئے) اٹھتا ہے، اور نمازیون مین تیرا پھرنا (دیکھتا ہے) بیشک وہی سنتا اور جانتا ہے،

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلانِ دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت صلعم ان دشمنون کے بیچ مین راتون کو اٹھکر خود نماز پڑھتے تھے، اور مسلمانون کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز مین مصروف ہے، اور کون سویا ہوا ہے، جس کو نماز کے لئے جگانا چاہیئے۔ ایسی پرخطر حالت مین آپکا راتون کو تنِ تنہا یہ فرض انجام دینے کے لئے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے، اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب نسبتہً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا، اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشا) اور تارون کے جھلملاتے وقت بھی ایک ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۙ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ۔ (طور - ۲)	اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ، بیشک تو ہماری آنکھون کے سامنے ہے، اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر، جب تو (رات کو تہجد کے وقت) اٹھتا ہے، اور کچھ رات کے حصہ مین اس کی تسبیح کر، اور ستارون کے پیٹھ پھیرتے وقت۔

یہ آیت سورۂ طور کے آخر مین ہے، اور سورۂ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ مین نازل ہوئی تھی۔[1]

[1] صحیح بخاری تفسیر طور، واقعۂ جبیر بن مطعم،

اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت صلعم کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا، کیونکہ اس سورہ مین اسی آیت سے پہلے آپ کے مصائب، اور ان پر صبر کرنے اور فیصلۂ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپکی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازون کی تفریق ہے، سورۂ دہر مین جو جمہور کے نزدیک مکی ہے، اور غالبًا سورۂ طور کے بعد اتری ہے، انھین معنون کی ایک اور آیت ہے، جس مین ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہئے اور بڑھتی ہے،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا، وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا، وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا۔ (دھر-۲)

تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر، اور ان مخالفون مین سے کسی گنہگار یا اللہ کے ناشکر گذار کا کہنا نہ مان، اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر، اور رات کو دیر تک اسکی تسبیح کیا کر،

اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتون کی تصریح ہے، یعنی صبح، اخیر دن، اور ابتدائی شب، مگر ہنوز "اصیل"[1] مین ظہر و عصر اور مِنَ اللَّيْلِ (رات) مین مغرب اور عشا کی تفریق نہین ہوئی تھی، کیونکہ کل تین نمازین تھین، ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو، اور ایک رات کو، اسی لئے ابھی تک باقی دو نمازون کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیساکہ آیتِ بالا سے ظاہر ہے،

اب یہ ان تین وقتون کی "تسبیح وتحمید" باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہین حکم ہوتا ہے،

أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا دن کے دونون کنارون مین (یعنی فجر اور عصر)

---

[1] اصیل دن کے آخری حصہ کو کہتے ہین، عام کتب لغت مین لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اس کو اصیل کہتے ہین، لسان العرب مین اصیل کے معنی عشی لکھے ہین، جو عصر کے لئے سورۂ روم مین استعمال ہوا ہے،

[2] طرفی النہار کو مختلف طریقون سے قرآن مجید مین ادا کیا گیا ہے۔ قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا۔ بالعشی والابکار، بالغدو والآصال، انمین پہلا طرف فجر، بکرۃ۔ اور غدو ہے، دوسرا طرف عصر، عشی، اور اصیل ہے۔

مِنَ الَّیۡلِ، (ھود - ۱۰) اور رات کے ایک ٹکڑے مین نماز پڑھا کر،

یہ آیت سورۂ ہود کی ہے جو مکہ مین نازل ہوئی ہے، اس مین اکثر انبیار علیہم السّلام کے متعلق یہ بیان کرکے کہ انھون نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے، اور غالبًا نماز کے اوقات کے سلسلہ مین یہ پہلی آیت ہے، جس مین "تسبیح" کے بجائے باقاعدہ "صلوٰۃ" کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانون کی خاصی تعداد تھی، جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے،

فَاسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ وَمَنۡ تَابَ مَعَکَ پس تو سیدھا چلا چل، جیسا کہ تجھکو حکم دیا گیا ہے،

وَلَا تَطۡغَوۡا، (ھود - ۱۰) اور وہ جنھون نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے چلین)، اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو،

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازین باقاعدہ فرض ہوتی ہین، ایک دن کے ایک کنارہ مین یعنی رات کے خاتمہ کے قریب، تارون کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے مین دن کے خاتمہ کے قریب، اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ مین، پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی جسکو پہلے اصیل کہا گیا تھا، اور تیسری سے عشار کی نماز مراد ہے، ابھی تک دن اور رات کی نمازون مین اجمال اور ابہام تھا، دوسری مین ظہر و عصر، اور تیسری مین مغرب و عشا کی نمازین چھپی ہوئی تھین، اب رات کی نمازین سب سے پہلے علٰحدہ ہوتی ہین، سورۂ قٓ مین جو مکی سورہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اوقات خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے،

فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ پس ان (مخالفون) کے کہنے پر (اے رسول)

قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ صبر کر، اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور

وَمِنَ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡهُ وَاَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ، اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار

کی حمد و تسبیح کر، اور کچھ رات گئے پر (عشا) اس کی[3]
تسبیح کر، اور (آفتاب کے) سجدہ کرنے کے بعد[1]
(غروب کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کر)

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا و تحقیر کے درپے تھے۔ اس آیتِ پاک میں رات کی نماز کا ابہام دور کرکے مغرب اور عشا کی تعیین کر دی گئی، ایک کی نسبت کہا گیا وَمِنَ الَّيْلِ (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقاتِ نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لئے کیا گیا کہ یہ نسبۃً کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا، زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل، اور پھر طرفی النہار (دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں "قبل غروب" کی نماز کہا گیا ہے، ہنوز تفصیل طلب ہے، جس کے اندر ظہر و عصر دونوں نمازیں داخل ہیں، چنانچہ سورۂ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس کی تفصیل کی گئی ہے، اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکستِ کامل کے بعد ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں چھٹے سال سے لیکر آٹھویں نویں سال تک ہے،

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ — اللہ کی تسبیح کر جب شام (یا رات) کرو، اور

---

[1] آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہے، اس لئے ادبار السجود سے ادبار سجود الشمس مراد ہے، جیسا کہ قبل الغروب سے قبل غروب الشمس مقصود ہے۔ آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ڈوب جانا ہے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے، کہ غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے، چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لئے غروب کا لفظ پہلے آچکا تھا، اس لئے کلام کی فصاحت کا اقتضا یہ تھا کہ اب اس کے لئے دوسرا لفظ لایا جائے، چنانچہ اس معنی کے لیے سجود کا لفظ استعارۃً لایا گیا، سجود اصل میں زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہیں، اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہے، اس طرزِ ادا سے آفتاب پرستوں کی تردید مقصود ہے، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لئے سجودِ شمس کا ذکر کیا، کہ جس وقت آفتاب کا سر اپنے خالق کے آگے سجدہ میں ہو، تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ۔ تفسیروں میں حضرت علیؓ سے روایتیں ہیں، کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتیں ہیں۔

تُصْبِحُوْنَ ۔ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — جب صبح کرو، اور اُس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے،

وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۔ (روم - ۲) — اور آخیر دن کو اُسکی تسبیح کرو، اور جب ظہر کرو،

اس آیت پاک مین زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازون کی توضیح کی گئی ہے، ایک کو عَشِیّ (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے، تمام آیتون کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ، طور، دہر، ہود، قٓ، روم اور نور مین، ظہر کا بالاجمال دہر، قٓ، طٰہٰ اور اسرا مین اور بالتصریح اسرا اور روم مین، عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طٰہٰ، قٓ اور روم مین، مغرب کا بالاجمال ہود، طٰہٰ، اور روم مین اور بالتصریح قٓ مین، عشا کا بصورت صلاۃ اللیل، مزمل، طور اور دہر مین، اور بصورت عشا، بالاجمال طٰہٰ، ہود، اور روم مین اور بالتصریح قٓ اور ہود مین ہے، تمام نمازون کا بالاجمال تذکرہ بقرہ، اسرا، اور طٰہٰ مین ہے طور سے فجر اور عشا، دو وقتون کی نماز، اسراء، ہود، اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتون کی روم سے چار وقتون کی (اگر مسا سے صرف مغرب مراد لین) اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتون کی نماز ثابت ہے۔

ایک نکتہ

جمع بین الصلوتین

اوپر کی آیتون پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے، پہلی آیتون مین ظہر اور عصر کی نمازین مجمل ہین، یعنی دونون کو ایک لفظ "قبل الغروب" یا اصیل یا طرف النہار کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے، آخری آیت مین جو سورۂ روم کی ہے، ظہر و عصر کی نمازون کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے، مگر شام کی نماز مین اجمال ہے، یعنی مغرب و عشا دونون کو حِيْنَ تُمْسُوْنَ (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے، اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے، کہ یہ دونون مل کر ایک بھی ہین اور علٰحدہ بھی ہین، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشا کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہین[1]، اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت مین

ہمیشہ علیحدہ ذکر کیگئی ہے، اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہین ہے، احادیث مین جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالین اس نکتہ قرآنی کی تشریح مین موجود ہین؛

اوقاتِ پنجگانہ اور آیتِ اسراء

محدثین اور مورخین کا اتفاقِ عام ہے کہ نماز کے اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین معراج مین ہوئی ہے، جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہوین سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی، گو اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر سورہ قٓ اور روم مین موجود ہے، جو اس سے پہلے نازل ہوچکی تھین، لیکن اقامتِ صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورہ اسراء (معراج) مین نمازِ پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نمازِ پنجگانہ کی تکمیل بصورتِ صلوٰۃ اسی معراج مین ہوئی، جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا، مگر اس کا حکم قرآن مین مدنی سورتون کے اندر نازل ہوا ہے۔ سورۂ اسراء (معراج) کی وہ آیت جس مین نمازِ پنجگانہ کا ذکر ہے حسب ذیل ہے،

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ	آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک
الَّیۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ	نماز کھڑی کر، اور فجر کی قرأت قائم کر، بے شک
مَشۡہُوۡدًا، (اسراء-۹)	فجر کی قرأت مین حضور ہوتا ہے،

یہ آیتِ کریمہ اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے، اس مین

(حاشیہ ص۹۱) لہ موطا امام مالک مسلم ترمذی باب القصر فی الصلوٰۃ فی السفر والحضر بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوٰتین کی حدیثین دیکھکر یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ زمانہ نبوی مین شاید تین وقت کی نمازین ادا ہوتی تھین (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مین فاضل وینسنک کو بھی یہی شبہہ ہوا ہے، دیکھو اسکا مضمون صلوٰۃ) مگر حقیقت یہ نہین ہے بلکہ نمازین ہمیشہ پانچ وقتون کی ہوتی تھین البتہ بضرورت ظہر وعصر کو ایک ساتھ، اور مغرب وعشا کو ایک ساتھ ملاکر پڑھ لیتے تھے، رکعتین اتنی ہی رہتی تھین، صرف وقت مین کمی ہو جاتی تھی، فقہا مین باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازون کو کن کن صورتون مین پڑھا جا سکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر جب حج مین عرفات مین ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونون ظہر کے وقت ادا کیجاتی ہین کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤن کیلئے ہے، بقیہ نمازون مین حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجا نہین، بلکہ محض صورۃً دو دو نمازین ایک ساتھ ادا کیجا سکتی ہین، اسکی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت مین، اور دوسری اول وقت مین پڑھی جائے۔ حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہا کے نزدیک سفر مین حقیقۃً دو نمازین یکجا ایک وقت مین پڑھی جا سکتی ہین، آنحضرت صلعم نے ایسا کیا ہے، شیعون مین دو دو نمازون کے ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے۔

سب سے اہم اور تشریح کے قابل لفظ "دلوک" ہے، دلوک کے اصلی معنی "جھکنے" اور "مائل" ہونے" کے ہیں؛ لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ "دلوک الشمس" یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہلِ عرب اس کو کن معنوں میں بولتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے. زوال پر، مقابل نقطۂ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر، اور غروب پر، اور جب آیتِ مذکورہ میں کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز پڑھو، تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی، غرض یہ ہے کہ اوجِ کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے؛ تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں، ایک نقطۂ سمت الراس سے، دوسرا نقطۂ تقابل سے، اور تیسرا دائرۂ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا، اور تیسرا مغرب کا، اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی خدائی کی نفی و تردید، اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لئے ایک ایک نماز رکھی گئی ہے؛ اس طرح "دلوک" کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں. چوتھی نماز کا وقت "غسق اللیل" (رات کی تاریکی) ہے، یہ عشا کی نماز ہے، اور اس کو حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہئے. جب آفتاب کا چہرۂ نورانی تو بر تو حجاباتِ ظلمت میں چھپ جاتا ہے. لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے سونے سے پہلے رکھی گئی. تاکہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے. اور پانچویں نماز کا وقت "قرآن الفجر" (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے. یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لئے ادا کی جاتی ہے کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا. اس لئے ضرور ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالقِ اکبر کا نام لے، اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں، بریّ ظاہر کرے. غرض اس آیتِ پاک سے اقامتِ صلوٰۃ کے اوقاتِ پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے. اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلامِ عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے. اگر کلامِ عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقاتِ پنجگانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا.

دلوک کی تحقیق

مفسرین میں سے بعض نے دلوک سے زوال کا وقت، اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے، اور اہل لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں، اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کئے ہیں یعنی مقابل نقطۂ نگاہ سے ہٹ جانا، اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے، چنانچہ

لسان العرب میں ہے،

ودلكت الشمس تدلك دلوكا غربت
وقيل اصفرت ومالت للغروب، و
فى التنزيل العزيز اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ
الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ" وقد دلكت
زالت عن كبد السماء ...... و
قال الفراء عن ابن عباس فى دلوك
الشمس انه زوالها الظهر قال ورأيت
العرب يذهبون بالدلوك الى
غياب الشمس، قال الشاعر،

هذا مقام قدمى رباحِ   ذبب حتى دلكت براحِ

يعنى الشمس. قال ابو منصور وقد روينا
عن ابن مسعود انه قال دلوك الشمس
غروبها وروى ابن هانئ عن الاخفش
انه قال، دلوك الشمس من زوالها الى

آفتاب کا دلوک ہوا، یعنی وہ غروب ہوا، اور کہا گیا
ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہوگیا
اور غروب کے لئے جھک گیا، اور قرآن میں ہے کہ
"دلوک شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز
کھڑی کرو" اور آفتاب کو دلوک ہوا، یعنی وہ آسمان
کے بیچ سے ہٹ گیا...... اور فراء نے کہا
کہ ابن عباس سے روایت ہے کہ دلوک شمس
کے معنی، ظہر کے وقت آفتاب کے زوال کے ہیں
اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اہل عرب کو دلوک
سے آفتاب کا غروب مراد لیتے دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے
"یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں
قدم جمے تھے، اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی
حفاظت کی، یہانتک کہ سورج ہتھیلی سے جھک گیا"
ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعود سے روایت
کی ہے، کہ دلوک شمس آفتاب کا غروب ہے اور

غروبها وقال الزجاج دلوک الشمس
زوالها فی وقت الظهر وذالك ميلها
للغروب وهو دلوکها ایضاً. یقال دلکت
براح وبراحِ ای قد مالت للزوال
حتی کاد الناظر یحتاج اذا تبصرها ان
یکسر الشعاع عن بصره براحته ....
فان قیل ما معنی الدلوک فی کلام
العرب قیل الدلوک الزوالُ ولذالك
قیل للشمس اذا زالت نصف النهار
دالکة وقیل لها اذا افلت دالکة
لانها فی الحالتین زائلة . . .
. . . قال الفراء فی قوله براح جمع
راحة وهی الکفُّ یقول یضع کفه علی
عینیه ینظر هل غربت الشمس بعدُ

ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا کہ "دلوک شمس زوال
سے غروب تک ہے" اور زجاج نے کہا کہ دلوک
شمس ظہر کے وقت آفتاب کا زوال ہے اور
اس کے معنی غروب کے لئے جھکنا بھی ہیں اور
یہ بھی اس کا دلوک ہے۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے
کہ دلکت براح وبراحِ یعنی آفتاب زوال کیلئے
جھک گیا، یہانتک کہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھنا
چاہے تو اس کی کرن کی شدت کو توڑنے کیلئے
اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہو۔ . .
. . . تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں
دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو جواب دیا جائیگا کہ دلوک
کے معنی زوال کے ہیں، اور اسی لئے آفتاب
کو "دالکہ" کہتے ہیں، جب وہ دوپہر کو جھک جائے
اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے، تب بھی اسکو
"دالکہ" کہتے ہیں، کیونکہ ان دونوں حالتوں میں
وہ جھک جاتا ہے، فرّاء نے کہا کہ اس قول (شعر
یا محاورہ) میں جو براح کا لفظ ہے یہ راحہ کی جمع ہے
جس کے معنی ہتھیلی کے ہیں، کہنے والے کا مطلب
یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے
(کہ آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہیں)

شعرائے عرب نے آفتاب کیلئے ڈھل کر آنکھون کے سامنے آجانے کے وقت آنکھون پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے، عجاج کہتا ہے،

والشمس قد کادت تکون دنفا　　ادفعها بالراح کی تزحلفا

اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر دُبلا ہوجائے مین اسکو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا تاکہ وہ ہٹ جائے

اس دوسرے شعر سے، پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہین کہ اس مین دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے، جب آفتاب ڈھل کر آنکھون کے سامنے آجاتا ہے، اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے، الغرض دُلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے، اسکا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے، دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے، جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے، اور مغرب کی طرف چلنے والون کی آنکھون کے سامنے پڑتا ہے، اس وقت شعاعون کی تیزی سے بچنے کے لئے آدمی کو آنکھون کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے، ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہین، بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گذر اتسامحًا یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہین، حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے، اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمت نظر سے ہوتا ہے، اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمتِ افق سے ہوتا ہے، اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹون کے بعد آتے ہین، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ،　　آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر،

لہ یہ شعر تفسیر طبری مین آیت مذکورہ کے تحت مین، اور لسان العرب مین دنف اور زحلف کے تحت مین مذکور ہی،

سے مراد تین نمازیں ہیں، کیونکہ تین دلوک ہوتے ہیں، ظہر جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے، عصر جب اس کا دلوک سمتِ نظر سے ہوتا ہے، اور مغرب جب اس کا کامل دلوک سمت افق سے ہوتا ہے[1]، اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قرأت) سے ظاہر ہے کہ عشا اور صبح فجر کی نمازیں مراد ہیں، اس طرح اس آیت پاک سے جو سورۂ اسراء میں واقع ہے، اوقات پنجگانہ میں اقامت صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے،

اوقاتِ نماز کا ایک اور راز اس آیتِ کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلانِ اوّلِ آفتاب) سے ہوتا ہے، اور یہی اُس حدیث سے بھی ثابت ہے جس میں بذریعۂ جبرئیل نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعلیم کا ذکر ہے[2]، اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے، پھر بہ ترتیب اور چاروں نمازوں کا، ظہر کے بعد، عصر، پھر مغرب، پھر سونے سے پہلے عشا، یہ چار نمازیں تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلہ سے ہیں، اس کے بعد صبح کی نماز ہے، جو عشا سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فصل رکھتی ہے، اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اسی قدر فصل ہے، چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشا تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے، پھر خاموشی ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے، اور اُسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے، غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب، اور مغرب سے عشا تک مسلسل نمازیں ہیں، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے، اور پھر انسانی کاروبار کے لئے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے، جو صبح سے ظہر تک ہے، اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے،

---

[1] تفسیروں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے انہیں نمازوں کا باختلاف روایت مراد ہونا مذکور ہے، حضرت ابن مسعود دلوک سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباس زوال آفتاب مراد لیتے ہیں، اسی طرح غسق اللیل کو بعض لوگ مغرب اور بعض عشا سمجھتے ہیں، اور فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشا اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہے، اور اس طرح ان کے نزدیک بھی یہ آیت اوقات پنجگانہ کو بتاتی ہے،

[2] سیرت ابن ہشام باب ابتداء فرضیت صلوٰۃ،

اوقاتِ پنجگانہ کی ایک اور آیت

سورۂ اسرا کی آیت کی طرح سورۂ طٰہٰ میں بھی ایک آیت ہے جس میں اوقاتِ پنجگانہ کی تفصیل ہے، وہ یہ ہے،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ آنَائِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ ۔ (طٰہٰ - ۸)

اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے، اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھ، اور دن کے کناروں میں

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر ہے، رات کے کچھ وقت سے عشا مراد ہے۔ اور دن کے کناروں میں ظہر اور مغرب ہے،

اطرافِ النہار کی تحقیق

یہ شبہہ کیا جاسکتا ہے کہ "اطراف" کا لفظ جمع ہے، جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں صبح اور شام یا تین ہیں اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح، دوپہر اور شام پہلی شق لیجائے تو صبح کا ذکر مکرر ہوجاتا ہے، اور ظہر غائب ہوجاتی ہے، دوسری شق اختیار کیجائے تو گو ظہر آجاتی ہے، مگر پھر بھی صبح مکرر رہتی ہے،

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہے مگر کلامِ عرب میں تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے، اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمالات موجود ہیں، مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین" دو مشرق اور دو مغرب" ہے۔ دوسری جگہ انہیں کو "مشارق" اور "مغارب" کہا گیا ہے، سورۂ تحریم میں ہے فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو قلب ہونگے، قلوب (بصیغۂ جمع) نہیں ہوسکتا، مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے، اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں، اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں، یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں، ایک صبح سے دوپہر تک، اور دوسرا دوپہر سے شام تک اطراف سے انہیں دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں، صبح سے دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارہ ظہر ہے، اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری

کنارہ عصر یا مغرب ہے، لیکن چونکہ عصر کا ذکر قَبْلَ غُرُوْبِهَا کے اندر مستقل موجود ہے، اس لئے متعین ہوگیا کہ یہان اس سے مراد مغرب ہے،

ایک اور طریقۂ ثبوت اگر ہم قرآن پاک کی علحدہ علحدہ آیتون سے اوقاتِ پنجگانہ پر استدلال کرنا چاہین تو کر سکتے ہین، مثلاً

۱- اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (اسرٰی-۹) زوالِ آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر،

یہ ظہر کی نماز ہے،

۲- وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ، (ق-۳) اور غروبِ آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کرو،

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا، (دہر-۲) اور اپنے پروردگار کا نام صبح کو اور عصر[1] کو،

یہ عصر کی نماز ہوئی، اور اسی کو وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (بقرہ-۳۱) (بیچ کی نماز) سورۂ بقرہ مین اسلئے کہا گیا ہے، کہ یہ دن کی نمازون مین ظہر اور مغرب کے بیچ مین واقع ہے،

۳- وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ (ھود-۱۰) اور دن کے دونون (ابتدائی اور انتہائی) کنارون مین نماز کھڑی کر۔

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے،

۴- سورۂ نور مین ہے، کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ کمرہ یا مکان مین نہ جایا کرو،

مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ (نور-۸) صبح کی نماز سے پہلے،

اس سے نمازِ صبح کا عملی ثبوت بھی ملا، پھر اسی مین اسی موقع پر ہے،

۵- وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ اور عشا کی نماز کے بعد۔

اس کے رو سے مسلمانون کو عشا کی نماز کے بعد جو سونے، اور کپڑے اتار دینے کا وقت ہے، کسی کے مکان مین بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں۔ یہ بھی نماز عشا کا عملی ثبوت ہے، اور یہی پانچون اوقاتِ نماز ہین

[1] الاصیل الوقت بعد العصر الی آخر (صحاح جوہری و لسان العرب)

نماز پنجگانہ احادیث وسنت مین

تمام انبیا علیہم السلام مین آنحضرت صلعم کو جو خاص تفوق و امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لیکر آئے اسکی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی، اور نہ وہ کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی، بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرمادی، اور خود عمل فرماکر، اور اپنے تمام پیرودن سے اس کی تعمیل کرا کر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک وشبہہ کی جڑ کاٹ دی، اسلام نے جس روزانہ طریق عبادت کو پیش کیا، آنحضرت صلعم نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان و آداب وشرائط و اوقات و تعداد کی پوری تشریح فرمادی، اوران مین سے ہر چیز ناقابل شک قولی وعملی تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی، نماز کس طرح پڑھنی چاہیئے، اس مین کیا کیا پڑھنا چاہیے، کن کن وقتون مین پڑھنی چاہیئے، کس وقت کی نماز کی کے رکعتین ہین، ان مین سے ہر چیز کی آپنے زبانی تشریح فرمائی، صحابہؓ کو تلقین کی، اور عملاً نبوت کی پوری زندگی مین جو حکم نماز کے بعد گذری، ایک دن دو دن نہین کم ازکم مدینہ مین متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ، تمام جماعت مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے، یہانتک کہ مرض الموت مین بھی اس مین تخلف نہ ہوا اور آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا، مدینہ کی مسجد نبوی اور تمام اسلامی مسجدون مین پنجوقتہ اعلان نماز کی آوازین بلند ہوتین اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہان اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا، یہ فرض ادا ہوتا تھا، آپ کے بعد تمام خلفاے راشدین اور تمام پیروان محمدی جہان بھی رہے، اور جہان بھی پہنچے، اسی طرح دن مین پانچ بار علی الاشہاد سفر و حضر مین تمام عمر ادا کرتے رہے، کیا ایسی مستمر، علی الاعلان، متواتر، اور دائمی چیز مین کسی کو شک واقع ہوسکتا ہے، یہ اہتمام، یہ علانیہ استمرار، اور یہ تاکید بلیغ، اس لئے فرمائی تاکہ جس طرح دوسرے پیغمبرون کا طریق عبادت بعد کے پیرودن کے ترک عمل سے مشتبہ اور عدم صحت نقل سے مشکوک ہوگیا، خاتم الانبیاؐ کی شریعت آخرین کا طریق عبادت اس سے محفوظ رہے، کیونکہ اگر اب اس شریعت مین شک پڑجاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت آکر اسکی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی، چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروان محمدی مین آپ کی یہ نماز اور اس کے ضروری

اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایۃً متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہین، نماز وہ فریضۂ الٰہی ہے جس کی فرضیت خمسہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعت سعید مین دیا جب آنحضرت صلعم معراج کے تقرب خاص سے ممتاز ہوئے حکم ہوا کہ شب و روز مین پانچ نمازین تم پر اور تمھاری امت پر لکھی گئین۔ جو پچاس[1] نمازون کے حکم مین ہین قرآنِ پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، ارشاد ہے کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (انعام - ۲۰) یعنی جو ایک نیکی کریگا، اس کو دس گونہ ثواب ملیگا، اس لئے پانچ نمازین یقیناً پچاس کے حکم مین ہین؛

نماز کی فرضیت کے بعد فرشتۂ الٰہی نے اتر کر خود نماز کے طریق ادا اور اس کے اوقات خمسہ کی تعلیم کی اور ہر وقت کی ابتدا اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی[2]، اور وہی آپ نے اپنے پیرون کو بتایا اور اس پر ان سے عمل کرایا۔

چنانچہ آپ نے شیوعِ اسلام کے بعد ہر جگہ احکام شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے، تو ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کر کے آیا تھا، خدمتِ اقدس مین آکر عرض کی یا رسول اللہ! آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات مین پانچ نمازین فرض ہین، کیا یہ سچ ہے، فرمایا ہان سچ ہے، عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہان[3]؛

خود آنحضرت صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ جبریل اترے اور انھون نے میری امامت کی، تو مین نے اُن کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک دو، تین چار پانچ گنتے جاتے تھے[4]، ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو، اور وہ اس مین دن مین پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل رہ سکتا ہے؟ سب نے عرض کی نہین، نہین رہیگا، فرمایا تو یہی مثال پانچون وقت کی نمازون کی ہے کہ ان سے

---

[1] بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ، کتاب الصلوۃ و کتاب الاسراء [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب اوقات الصلوات الخمس۔
[3] صحیح بخاری کتاب الایمان باب الزکوۃ من الاسلام ص۱۱ و صحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ص۲۲ و ۲۵ ج ۱۔ مصر۔
[4] صحیح بخاری و صحیح مسلم و موطا باب اوقات الصلوۃ الخمس

اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے[1]۔ اوقات کی تعیین میں فرمایا، کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اسوقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اسوقت تک اسکا وقت ہے جبتک عصر کا وقت نہ آجائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اسکا موقع اسوقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے، پھر جب مغرب پڑھو، تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے، پھر جب عشا پڑھو تو آدھی رات تک اسکا وقت ہے[2]؛

ابو برزہؓ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور صبح[3] کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قرأت کرتے تھے، اور ظہر[4] زوال کے بعد ادا کرتے تھے، اور عصر[4] اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جاکر لوٹ آتا تھا، پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی، مغرب[4] کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہیں رہا، اور عشا[4] کو تہائی رات تک ادا کرنے میں آپ تامل نہیں فرماتے تھے، حضرت جابرؓ دوسرے صحابی نقل کرتے ہیں، کہ انحضرت صلعم ظہر[5] کی نماز دوپہر میں پڑھا کرتے تھے، اور عصر[5] اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا اور مغرب[5] جب سورج ڈوب جاتا تھا، اور عشا[5] میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت، اور صبح[5] اندھیرے میں پڑھتے تھے[6]، صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورۂ فاتحہ کیساتھ سورہ پڑھتے تھے، کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی، مغرب میں سورۂ المرسلت پڑھی اور کبھی سورۂ طور پڑھی، عشا میں اذا السماء انشقت اور والتین والزیتون قرأت کی ہے، اور صبح میں سورۂ طور پڑھی ہے[7]،

اس قسم کی اور بیسیوں روایتیں ہیں، اور روایتوں پر کیا موقوف ہے، اس وقت سے آج تک تمام امتیان محمد رسول اللہ صلعم کا عملی تواتر دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابل تردید حجت ہے[8]،

تہجد اب نفل ہوگئی لیکن کیوں؟ ان نماز پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کیلئے

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوات الخمس کفارۃ [2] صحیح مسلم باب اوقات الصلوات الخمس، [3] صحیح بخاری باب وقت الظہر عند الزوال [4] صحیح بخاری باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس او تاخروا، [5] ایضا باب القراءۃ فی الظہر والعصر والمغرب والعشاء والفجر بروایات متعددہ، [6] چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ صلوٰۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقات کے میں غلط فہمی پھیلانی چاہی ہے، اسلئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی، تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے،

نفل ہوگئی، چنانچہ پوری آیت یہ ہے

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ	نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (ظہر عصر
الَّيۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ	مغرب) رات کی تاریکی تک، اور صبح کی قراءت
مَشۡهُوۡدًا، وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ	قائم کر، بے شک صبح کی قراءت میں حضور ہوتا ہے،
نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ	اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے)
مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا، (اسراء - ۹)	زیادہ نماز پڑھ شاید کہ تجھکو تیرا رب قابل تعریف مقام

غور کرو کہ جب تک اوقات مقرر نہ ہوئے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جا سکے پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ پتیوں والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا، جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو ان کے بقدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی، اور حکم آیا کہ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ یعنی قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو اس کے بعد اس آیتِ پاک میں جب اقامتِ صلوٰۃ کے اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز (تہجد) کی فرضیت ساقط ہوگئی، یہاں ایک قابلِ ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیتِ پاک اوقاتِ نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے، کیونکہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نماز تہجد نفل نہ تھی اور اب نفل ہوگئی۔

قبلہ انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہو سکتا، جس کی بنا پر اوقاتِ نماز کی تعیین کی گئی ہے اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہو سکتا، جب انسان کوئی کام کریگا تو ظاہر ہے کہ اس کا منھ کسی نہ کسی سمت ہوگا، اگر نماز میں کسی خاص سمت کی تعیین نہ ہوتا اور یہ عام اجازت دیدیجاتی کہ جس کا جس طرف جی چاہے منھ کرکے نماز ادا کرے، تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہوجاتا، اور نمازیوں کی وحدتِ صوری قائم نہ رہتی

لہ صحیح مسلم جلد اول باب وجوب قراءۃ الفاتحہ احدیث ارجع فصل فانک لم تصل. نیز دیکھو فتح الباری جلد اول صفحہ ۳۹۰،

بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب، کوئی پچھم، کوئی اوتر اور کوئی دکھن رخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ وحدت نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز تماشا بن جاتا، اس لئے ہر مذہب میں عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لیگئی ہے، صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کی طرف منہ کرتے تھے، کہ ستاروں میں وہی ہے جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا بلکہ برقرار رہتا ہے[1]، آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے ہیں، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت آگے رکھ لیتے ہیں، اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رخ کرتی تھیں، یہاں تک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ ایسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنایا تھا، شامی عیسائی بھی اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے[2]، بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، توراۃ سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے، اس کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر "بیت ایل"[3] بنا لیتے تھے، قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے، تو حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ اپنے گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں،

وَاجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (یونس-۹) اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کر لو اور نماز کھڑی کرو،

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے مجموعۂ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے، حضرت داؤدؑ کے زبور میں ہے:-

"لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤنگا، اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کرونگا" (۵-۷)

سلاطینِ اوّل میں ہے:-

---

[1] الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ، [2] یہ تفصیلات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ "قبلہ" میں ہیں،
[3] سفر تکوین باب ۱۲-۸، ۱۳-۴ و ۲۸-۱۷ تا ۱۹ و ۳۱-۱۳،

"جب تیرا گروہ لڑائی کے لئے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے، جہان کہین تو انھین بھیجدے، اور خداوند کے آگے دعا مانگے، اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا، اور اس گھر کی طرف جسے مین نے تیرے نام کے لئے بنایا" (۷-۴۴)

اسی صحیفہ مین آگے چل کر ہے:-

"اور اس زمین کی طرف جو تو نے ان کے باپ دادون کو دی، اور اس شہر کیطرف جسے تو نے چن لیا اور اس گھر کی طرف جو مین نے تیرے نام کے لئے بنایا تجھ سے دعا مانگین" (۴۸)

اہل عرب مین کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی، جو بنی اسرائیل مین بیت المقدس کو تھی، اس لئے اہل عرب کا قبلہ کعبہ تھا، اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے،

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ (بقرہ-۱۸)

اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے، جدھر وہ منہ پھیرتی ہو، تو اے مسلمانو! نیکیون کی طرف دوڑو،

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ دنیا کے تین مذاہب مین تین قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست، یا ستارہ پرستی سے متاثر، پرستش کے لئے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً آفتاب پرست آفتاب کے طلوع کے رُخ یعنی مشرق کو، اور صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو، عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے عنصر یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے، موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے ابراہیمی قومون مین اس قسم کی مرکزی مسجدین دو تھین مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانۂ کعبہ)، پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحٰقؑ اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی، اس لئے وہ ان کا قبلہ تھی، دوسری مسجد کے متولی حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کے بیٹے تھے، جنھون نے اس کو قبلہ بنا لیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک کہ معظمہ مین رہے، خانۂ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے، کہ کعبہ اور بیت المقدس دونون سامنے پڑ جاتے تھے، لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس

مدینہ سے شمال اور خانۂ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم چونکہ کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک اجازت نازل نہین ہوئی تھی، آپ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے، کہ وہی انبیاے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا لیکن آپ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملت ابراہیمی کے لئے وہی ابراہیمی مسجد (خانۂ کعبہ) قبلہ قرار پائے جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیم) کی طرف سے بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تھی، چنانچہ سورۂ بقرہ کے وسط مین اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن مین سب سے پہلے یہ بتایا گیا کہ خدا کو کسی خاص جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہین، کیونکہ وہ بے سمت ہے، اور سب سمتین اسی کی ہین،

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا	اور خدا ہی کے لئے ہے، پورب اور پچھم، تو جدھر
فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ	رخ کرو اُدھر ہی خدا کا منھ ہے، بیشک خدا بڑا
(بقرہ ۱۴-۷)	گنجایش اور وسعت والا، اور بڑے علم والا ہے،

اس کی گنجایش اور وسعت مین ہر سمت داخل ہے، اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی کسی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے، دوسری آیت مین بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے،

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ	بے وقوف لوگ کہین گے کہ ان (مسلمانون) کو،
عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ۚ	ان کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا جس پر وہ
قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ یَهْدِیْ	تھے، کہدے کہ پورب اور پچھم دونون خدا کے ہین
مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (بقرہ ۱۷)	وہ جسکو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے،

یہودیون کو سب سے زیادہ یہ اعتراض تھا کہ شرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر، مغربی مسجد یعنی خانۂ کعبہ کو کیون قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کرکے فرمایا،

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ	نیکی یہی نہین کہ تم اپنے منھ مشرق اور مغرب کی

وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ — طرف پھیرو، البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا، قیامت، فرشتون

الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ — کتاب اور پیغمبرون پر ایمان لائے اور اپنی دولت

اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى — کو اس کی محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت پر)

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ — رشتہ دارون، یتیمون، غریبون، مسافرون،

وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ — سائلون اور غلامون کو (آزاد کرانے مین) دے

وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ — اور نماز پڑھے، اور زکوٰۃ دے اور (نیکی یہ ہی)

اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ — جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہین اور سختی اور تکلیف

وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ — اور جنگ مین صبر کرتے ہین، یہی وہ ہین جو سچے

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ — (سچے) ہوے اور یہی پرہیزگار ہین،

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام مین قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رخ کیا جائے عبادت کے لئے کوئی ضروری چیز نہین ہے، لیکن چونکہ نمازون مین امت کے نظام وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی اس لئے س۲ھ مین خانہ کعبہ کے قبلہ بنانے کا حکم ہوا،

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَ — پس تو اپنا منہ مسجد حرام (خانۂ کعبہ) کی طرف پھیر،

حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ) — اور تم لوگ جہان بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو،

اسلام نے قبلہ کے لئے کسی خاص سمت کا نہین، بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا جس کے چارون طرف چارون سمتون سے نماز پڑھی جا سکے، اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال، سب بہ یک وقت مسلمانان عالم کا قبلہ ہین، جس سے ایک لطیف رمز یہ نکلتا ہے کہ مسلمانون کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے، اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب

یا قطب شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی، اور ستارہ پرستی کا رواج ہوگیا تھا، اس کا کلیۃً خاتمہ ہوگیا،

لیکن یہ مرکزی مسجد، بیت المقدس کے بجائے مسجدِ حرام (کعبہ) قرار دیگئی جس مین بہت سی مصلحتین تھین،

۱- یہ ضرور تھا کہ قبلہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے، ہر ملک مین منہ پھیر سکے، ایسی چیز یا تو کوئی مصنوعی شے ہو سکتی تھی، مثلاً کوئی چراغ، کوئی مومی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب، جیسا کہ اوپر گذرا بعض اہلِ مذاہب اُن چیزون کو سامنے رکھتے تھے، جن کی وہ پرستش کرتے تھے، مثلاً بت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء (عناصر) کو اسکے ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی مین گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہین بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا، مثلاً شمال یا مشرق کہ پہلی سمت مین جگہ سے نہ ٹلنے والا قطب تھا اور دوسری چیرۂ خورشید کا مطلع اور بیاضِ سحر کا دیباچہ تھی، دینِ توحید کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا، کہ ستارہ پرستی کے ابطال کیساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے،

۲- یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی، کسی اور سمت کا انتخاب کیا جا سکتا تھا، مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتون مین سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مرجح سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا تھا، ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی، اب جو بھی سمت اختیار کیجاتی اسکے لئے ضرور تھا، کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستارون کے طلوع و غروب کا لحاظ کئے بغیر ممکن ہی نہین، کیونکہ ہر سمت مین کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے، جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کیگئی ہے، اس لئے جو سمت بھی اختیار کیجاتی، اس سے اس سمت کے خاص ستارہ کے متعلق وجوہ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا، اور اس ترجیح سے دینِ توحید کا دینِ شرک بنجانا لازمی تھا،

۳- اسی لئے ملتِ ابراہیمی نے ان صورتون کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے، حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجدون مین سے اُن کی نسل نے دو مرکزی مسجدون کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنے اپنے زمانون مین بڑے اہتمام سے تیار کرایا، اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی،

(۴) اسلام کا دعوی ہے کہ خانۂ کعبہ بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا مین پہلا گھر تھا، جو خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا، اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے،

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا، (آل عمران - ۱۰)

بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانون کے لئے (خدا کا) بنا، وہ ہے جو مکہ مین ہے،

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ، (بقرہ - ۱۵)

اور جبکہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ بیت اللہ کے کھمبے اٹھا رہے تھے،

خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عہدِ اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا، چنانچہ قرآنِ پاک مین ہے،

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ، (بقرہ - ۱۷)

اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہین کہ خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے، (اور وہ) اُن کے پروردگار کی طرف سے (ہے)

پولوس (پال) ایک خط مین جو گلیتون کے نام ہے لکھتا ہے،

"کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا (اسماعیل) جسم کے طور پر پیدا ہوا،

اور جو آزاد سے تھا (اسحٰق) سو وعدہ کے طور پر، یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں، اور سینا مصر کے راستہ میں ہے) پر سے جو ہوا دہ نرے غلام جنتی ہیں، یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے، اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے۔ (گلیتون کے نام ۲۲-۲۶، باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوگا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں، "اب کے یروشلم" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کئے تھے، ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا، جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں، اور راستہ میں سینا پڑتا تھا، اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی غلام اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا، اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہوگئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادتگاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا، سارہ کے وعدہ کا بیان ذکر نہیں ہے، لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی، گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا، چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تمرد، سرکشی اور شقاوت کے سبب اس عہد کو توڑ دیا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا، جس کا ذکر سورۂ اسراء کی آیتوں میں ہے، اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر بنو اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو سینا پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا۔

معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا اور اس کے چند سال

بعد خانۂ کعبہ کا قبلہ بنجانا، گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست، اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتدا، کا اعلان تھا، جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد مین بسلسلۂ معراج

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا
مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى
الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ، (بنی اسرائیل-۱)

پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت
مسجد حرام (خانۂ کعبہ) سے اس مسجد اقصیٰ (بیت المقدس)
تک لے گیا، جس کے چارون طرف ہمنے برکت دی ہے

کی تفسیر مین لکھا گیا ہے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیلی کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس مین قبلہ ہونے کی شان باقی نہین رہی، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی، جسکا تعلق عہد اسماعیلی سے تھا (یعنی خانۂ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے،

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ
فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ
اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا
یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ. وَاِذْ جَعَلْنَا
الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا
مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَآ
اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا
بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ
السُّجُوْدِ،

(بقرہ-۱۵)

اور جب خدا نے چند باتون مین ابراہیم کو آزمایا
تو اس نے ان باتون کو پورا کیا، خدا نے کہا مین
تجھ کو لوگون کا پیشوا بنانے والا ہون، (ابراہیم
نے) کہا اور میری نسل مین سے (خدا نے) فرمایا
میرا عہد ظالمون کو شامل نہ ہوگا، اور جب ہمنے
گھر (کعبہ) کو لوگون کے اجتماع کی جگہ اور امن
بنایا، اور تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز
پڑھنے کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل
سے عہد کیا کہ تم دونون میرے گھر کو طواف کرنے
اعتکاف کرنے والون، رکوع کرنے والون اور

غرض یہ رمزِ الٰہی تھا جو ہزارون برس پہلے سے خدا کے علم مین تھا، اور جس کی بنا پر رسول اللہ صلعم کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار پایا، جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا، جہان کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی، اور جو دنیا مین اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا، اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دنیا مین عرشِ الٰہی کا سایہ اور زمین پر حظیرۃ القدس کا عکس تھا، اس لئے حکم ہوا،

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (بقرہ - ۱۰۰) — اور تو جہان بھی نکلے مسجد حرام ہی کی طرف منہ کر،

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی جگہ کھڑا ہو کر فریضۂ عبودیت ادا کرے جہان حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے، لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہین تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رُخ ہی کر لے، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے، اسی لئے قبلہ کی تعیین کے موقع پر فرمایا،

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (بقرہ - ۱۴) — پس جدھر منہ پھیرو اُدھر ہی خدا کا منہ ہے،

خانہ کعبہ کی دیوارین اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و مسجود نہین، نہ مشرکون، بت پرستون، اور ستارہ پرستون کی طرح نماز و دعا مین قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے، نہ اس کی دہائی دی جاتی ہے، نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر چھپا ہے، خانہ کعبہ کی دیوارین اگر بالفرض ٹوٹ جائین، اس کی چھت گر جائے، اور صرف فضا باقی رہ جائے، تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا، اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جا کر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز جائز ہے، اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو اُدھر ہی نماز پڑھی جا سکتی ہے، سواری مین نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جا رہی ہو پڑھ سکتے ہو، گھمسان کی لڑائیون مین بھی ایسا کیا جا سکتا ہے، یہ باتین

ان تمام مشرکانہ غلط فہمیون کی جو خانۂ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہوسکتی تھین قطعی تردید کرتی ہین، اور یہی اس باب مین دینِ محمدی کی تکمیلی حیثیت ہے،

یہ قبلہ گویا مسلمانون کا ارضی مرکز، ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت، دنیا کے قدیم موحدون کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ کے پیرو ہونے کا شعار، اور مسلمانانِ عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبولِ اسلام کی علامت قرار دیا، اور فرمایا کہ "جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے، وہ مسلمان ہے[1]" اگر خیال کے پر پرواز سے اڑکر اور فضاے آسمانی کی نیلگون سطح پر کھڑے ہوکر دنیا کے مسلمانون کو نماز کی حالت مین کوئی شخص دیکھے تو نظر آئیگا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے، جس کے چارون طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت مین خدا کے آگے صف بستہ اور سربسجود ہین،

رکعتون کی تعداد ایک قیام اس کے بعد رکوع پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز مین کم از کم دو رکعتین اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئین، صبح کو دو، ظہر، عصر اور عشا کے وقت چار چار، اور مغرب مین تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہین رکھی گئی، اور نہ چار سے زیادہ رکعتین رکھی گئین، کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل مین ذرا اثر بھی پیدا نہ ہوسکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بددل بنادے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب مین خضوع و خشوع پیدا نہ ہوتا، کیونکہ صرف چند سکنڈ مین تمام ہوجاتی، اور چار سے زیادہ رکعتون کی نماز بددلی کا باعث ہوتی، کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبرا جاتا، اس لئے فرض نماز کی رکعتین دو سے کم اور چار سے زیادہ نہین رکھی گئین،

مکہ مین مسلمانون کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی، اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ چھپکر نماز پڑھتے تھے، اس کے لحاظ سے اُس وقت نماز مین زیادہ رکعتین ہونا ممکن نہ تھا، اسی لئے مکہ معظمہ مین ہر نماز صرف

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل استقبال القبلہ،

دُو رکعتون کی تھی، جب مدینہ منورہ آکر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشا مین چار چار رکعتین کر دی گئین لیکن مسافر کے لئے وہی دُو رکعتین[1] قائم رہین، کیونکہ اوسکی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے، جو اس تخفیف کی علت تھی، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لئے چار رکعتین ہین، مسافر کے لئے دُو اور بحالتِ خوف ایک[2]، اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پر ان رکعتون کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے

مغرب اور صبح کی نمازین قیام وسفر دونون حالتون مین یکسان ہین، مغرب کی تین رکعتون کا آدھا ممکن نہین، اور صبح مین خود دو رکعتین ہین، ان مین کیا کمی ہوسکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح مین یہ تین اور دُو رکعتین کیون ہین؟ اس کی گرہ کشائی امّ المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے "مغرب مین تین اسلئے ہے کہ وہ دن کا وتر ہے، اور صبح مین دو اس لئے کہ اس مین دو رکعتون کے بڑھانے کے بجائے قرأت لمبی کر دی گئی ہے[3]"

حضرت عائشہؓ کے ارشاد مین تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، گذر چکا ہے کہ عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستون) کی عبادت کا وقت[4] تھا، مغرب کی نماز غروبِ آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہل توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری برأت ظاہر کرین، اسی لئے اس وقت کی نماز مین رکعتون کی تعداد وہ رکھی گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے[5]، یہ عدد واحد تو ہو نہین سکتا کہ اُس سے خضوع وخشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا، دُو کا عدد بھی نہین ہوسکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے، طاق نہین، بنا برین توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے، جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونون باتین ثابت

---

[1] دیکھو بخاری باب الہجرۃ وصحیح مسلم صلوٰۃ المسافر ومسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۱ وابن خزیمہ وابن حبان، والبیہقی در فتح الباری جلد اول صفحہ ۳۹۲) [2] دیکھو مسلم صلوٰۃ المسافر،

[3] مسند احمد بن حنبل ۶-۲۴۱، [4] صحیح مسلم النہی عن الصلوٰۃ فی الاوقات الثلث، [5] عشاء کی بعد کی وتر نماز کو بھی وتر اسی لئے کہتے ہین کہ وہ طاق ہوتی ہے، یعنی تین جورات کی وتر ہے،

ہوتی ہین، نیز نماز کے خشوع وخضوع کا کمال بھی فوت نہین ہوتا، جو ایک رکعت ہونے مین فوت ہوجاتا، اس لئے مغرب مین رکعتون کی تعداد تین رکھی گئی، اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال انحطاط جسکو غروب کہتے ہین اسی وقت ہوتا ہے، اسلئے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہئے، اس مفہوم کی تشریح اُس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے، جس مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے،

أَوْتِرُوا يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ فَإِنَّ اللهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ (ابوداؤد)

اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو، کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے،

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام اور سکون کے بعد بیدار ہوتا ہے، یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے، طبیعت موزون ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم اس وقت سراپا اثر اور مجسم کیف نظر آتا ہے، اس لئے یہ وقت نماز و دعا کے لئے خاص طرح سے موزون ہے، اور قرآن مجید مین اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظون مین کیا گیا ہے،

إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا (بنی اسرائیل-۹) صبح کی نماز کی قرأت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے،

اس بنا پر شریعت محمدیہ نے اس وقت کی نماز مین رکعتون کی تعداد کے بجاے اس کی اصلی کیفیت کو پیش نظر رکھا، یعنی رکعتین تو دو ہی رہین، مگر حکم دیا گیا کہ قرأت لمبی کردیجائے، اور سورتین بڑی بڑی پڑھی جائین، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نمازون کی ایک رکعت مین تقریباً پندرہ آیتین تلاوت فرماتے تھے، مگر صبح کی نماز مین ساٹھ آیتون سے لیکر سو آیتون تک قرأت کرتے تھے،[1] اور اسی نسبت سے رکوع وسجود بھی ہوتا تھا،[2]

رکعتون کی تعداد اگرچہ آنحضرت صلعم اور صحابہ کی سنت متواترہ سے ثابت ہے، اور تمام مسلمان اس تواتر پر بلا استثنا عامل بھی ہین، تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک مین نماز خوف سے ظاہر ہوتا ہے، جسمین

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب القراءۃ، [2] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ وتخفیفہا فی تمام

یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصّے ہوجائین، پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہوکر ایک رکعت اداکرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے، پھر اگلا حصہ دشمن کے سامنے کھڑا ہوجائے، اور دوسرا امام کے پیچھے آکر ایک رکعت اداکرے، اس طرح امام کی دو رکعتین ہوجاتی ہین، اور مقتدیون کی جماعت کے ساتھ ایک ایک، اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشارون سے علٰحدہ علٰحدہ اداکرتے ہین، جب نمازِ خوف مین قصر کی دو رکعتین ثابت ہوئین، تو اصل رکعتین چار ہونگی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازون مین ہے، نمازِ قصر کی آیات سورۂ نسا کے پندرہوین رکوع مین ہین،

نماز کے آدابِ باطنی قرآن پاک اور احادیث نبویہ مین نماز کے لئے متعدد لفظ آئے ہین، مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح، اور ذکرِ الٰہی، اور یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات، و آداب کو ظاہر کرتے ہین، نماز جسم و روح دونون کی عبادت ہے، اگر اس مین جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو، اور روح مین اہتزاز پیدا نہ ہوجائے تو ایسی نماز گُلِ بے رنگ اور شرابِ بے کیف سے زیادہ نہ ہوگی،

اقامتِ صلوٰۃ، نماز پڑھنے کے لئے قرآنِ پاک مین جابجا "اقامتِ صلوٰۃ" (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہین، بلکہ نماز کو اس کے آداب اور ارکان و سنن کیساتھ اداکرنے کے ہین، چنانچہ خوف کی حالت مین جہان نماز کے بعض آداب و ارکان و شرائط کو معاف کردیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے، فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ "پھر جب تم کو اطمینان ہوجائے تو نماز کو قائم کرو" اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہین کہ نماز کو اس کے تمام آداب و ارکان و شرائط کے ساتھ بجالایا جائے، اس بنا پر نماز مین اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع و خشوع ملحوظ رہنا چاہئے، جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے،

قنوت: نماز کے آداب باطنی مین دوسری چیز قنوت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَقُوْمُوا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ، (بقرہ-۳۱) اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو،

صحابہ کہتے ہین کہ ہم لوگ پہلے نماز مین باتین کریا کرتے تھے لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا، قرآن پاک مین جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے، لغت مین (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہین چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، نماز کے جس قنوت کا اس آیت مین ذکر ہے، اس کے متعدد معنون مین سے ہر معنی نماز مین مقصود ہے کیونکہ نماز مین ذکر و قرأت، تسبیح و استغفار، سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتون اور باتون سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے، عبادت بھی ہے، اس مین دیر تک قیام بھی ہے، اور عاجزی کا اظہار بھی ہے، اگر ان مین سے کوئی بھی کسی نماز مین کم ہو تو اسی قدر نماز کے اوصاف مین بھی کمی ہو جائیگی،

خشوع، تیسری چیز خشوع ہے، چنانچہ قرآن پاک مین نمازیون کی یہ صفت آئی ہے

اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ (وہ مومنین کامیاب ہین) جو اپنی نماز مین خشوع وخضوع کرتے ہین، (مومنون-۱)

خشوع کے لغوی معنی یہ ہین، بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھین نیچی ہونا یعنی ہر ادا سے مسکنت عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا، (لسان العرب) اس لئے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی، بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے، اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہو گئی،

تبتّل، تبتل کے اصلی معنی کٹ جانے کے ہین، اور اس کے اصطلاحی معنی ہین خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے، مگر قرآن پاک مین جہان اس کا حکم ہے، سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے، چنانچہ سورۂ مزمل

مین ہے،

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ	اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر کے سوا تمام
نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ	رات اٹھ کر نماز پڑھ، آدھی رات یا اس سے کچھ کم و
عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ؕ اِنَّا	بیش، اور اس مین قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر
سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۚ اِنَّ	ایک بھاری بات اتارنے والے ہین، بیشک
نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ	رات کو اُٹھ کر نماز پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے
قِيْلًا ؕ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ؕ	اور مؤثر ہوتا ہے، تیرے لئے دن کو بڑی
وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ	فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز
تَبْتِيْلًا ؕ (مزمل-۱)	سے کٹ کر اُس کی طرف ہو جا،

یعنی نماز کی حالت مین خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئین، صحیح مسلم[1] مین حضرت عمرو بن عبسہ سلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت صلعم نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو کر کے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوا، پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی، اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا جسکا وہ سزاوار ہے، اور اپنے دل کو خدا کے لئے ہر چیز سے خالی کر لیا، (وفرغ قلبہ للہ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت پیدا کیا ہو، یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے،

تضرع، تضرع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہین، (لسان العرب) نماز مین بندہ پر عاجزی، زاری اور عجز و الحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہئے ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا،

[1] صحیح مسلم اوّل باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا،

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ط — تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کیساتھ اور دھیمی آواز سے پکارو، (اعراف-۷)

اخلاص، نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصلی جوہر اخلاص ہے، یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو، کیونکہ اگر ایسا نہین ہے تو نماز نماز نہین، بلکہ ریا، اور نمایش ہوگی، اور بعض اہلِ حق کے نزدیک شرک لازم آیگا، فرمایا،

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ط (اعراف-۳) — اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو،

اس سے معلوم ہوا کہ نماز مین اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے،

ذکر "نماز" خدا کی یاد کے لئے ہے، اگر دل مین کچھ اور زبان پر کچھ ہو، تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی، اسیلئے فرمایا،

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ-۱) — میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر،

ظاہر ہے کہ "یاد" صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہین ہے، اس کے ساتھ دل کی نیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہئے، اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے،

فہم و تدبر، نماز مین جو کچھ پڑھا جائے، اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے، اگر بے پروائی کی وجہ سے معنون کی طرف دل متوجہ نہ ہوا، تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا، اسی لئے نشہ کی حالت مین نماز پڑھنے کی ممانعت کیگئی ہے، کہ اس حالت مین سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو مین نہین، فرمایا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ، (نساء-۷) — نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ مین ہو، یہانتک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو

اس آیتِ پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز مین جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت مین نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے، کہ اس مین بھی انسان فہم

اور تدبر سے عاری ہو جاتا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ نماز مین جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ، کیونکہ اگر نیند کی حالت مین نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کے بجائے اپنے آپکو برا بھلا کہنے لگو[1]، دوسری روایت مین ہے کہ فرمایا "نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہئے، تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے[2]"، حاکم کی مستدرک مین ہے، کہ آپ نے فرمایا "جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے، اس کو سمجھتا بھی ہے، یہانتک کہ نماز ختم کرے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا[3]"

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہین جن کے بغیر نماز کامل نہین ہوتی، جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا، نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے، اور اس لئے اس آیت ذیل کے مصداق دونون ہین،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ، الَّذِينَ هُمْ عَنْ	پھٹکار ہو ان نمازیون پر جو اپنی نماز سے
صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ، الَّذِينَ هُمْ	غفلت برتتے ہین، جو دکھانے کی نماز
يُرَاءُونَ ۔ (ماعون-۱)	پڑھتے ہین،

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے "ان نمازیون پر جو اپنی نماز سے غافل ہین پھٹکار ہو" نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہین، کہ نماز کے لئے جو ظاہری آداب، مثلاً وقت کا لحاظ، اور ادائے ارکان مین اعتدال وغیرہ، اور جو باطنی آداب مثلاً خشوع وخضوع، تضرع وزاری، اور فہم و تدبر وغیرہ ضروری ہین، ان سے نماز مین تغافل برتا جائے،

---

[1] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب امر من نعس فی صلاتہ جلد اصفحہ ۲۹۲ [2] بخاری وابوداود ومسند احمد عن انس [3] مستدرک (ترغیب و ترہیب حافظ منذری جلد اول ص۸۳ مصر) اس سے ان مسلمانون کو جو عربی زبان نہین سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہئے، اور چاہئے کہ نماز مین جو سورتین اور دعائین وہ پڑھتے ہین، اُن کے معنی ذہن نشین کر لین، اور یہ ہر مسلمان کے لئے بہت آسانی سے ممکن ہے، بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے،

نماز کے گذشتہ آداب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات، تعلیمات اور عملی مثالین ہین جنہین آپ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے، ایک دفعہ مسجد نبوی مین ایک شخص نے آکر نہایت عجلت مین نماز پڑھی، آپ نے فرمایا: اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہین پڑھی[۱] اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی، آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ! کیسے نماز پڑھون؟ فرمایا "اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قرأت کرو، اس طرح اطمینان و سکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو"

نماز مین نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے، اس سے انسان کی توجہ ہٹتی، اور حضور قلب مین خلل پڑتا ہے، اس لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ نماز مین ادھر اُدھر نہ دیکھا کرو، کیا تمھین یہ ڈر نہین کہ تمھاری نظر پھر واپس نہ آسکے[۲] آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تک بندہ نماز مین دوسری طرف ملتفت نہین ہوتا خدا اس کی طرف ملتفت رہتا ہے، اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے، تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے[۳] طبرانی مین ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "جب تم مین سے کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو، تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے، یہان تک کہ نماز سے فارغ ہوجائے، اور نماز مین منہ پھیر کر ادھر اُدھر نہ دیکھ، کیونکہ جب تک تم نماز مین ہو خدا سے باتین کر رہے ہو[۴] مسند بزار مین ہے کہ جب بندہ نماز مین ادھر اُدھر دیکھتا ہے، تو خدا فرماتا ہے تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے، تو میری طرف دیکھ دوسری دفعہ بھی خدا یہی فرماتا ہے، پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اسکی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے[۵]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا "سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے" صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ نماز کی چوری کیا ہے، فرمایا "رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا، اور خشوع نہ ہونا"[۶] ایک دفعہ آپ نے نماز سے

---

[۱] صحیح بخاری، صحیح مسلم و ابوداؤد کتاب الصلوۃ [۲] مسند احمد عن جابر بن سمرہ [۳] مسند احمد جلد ۵ ص ۱۷۲ و ابوداؤد باب الالتفات فی الصلوۃ [۴] طبرانی فی الاوسط عن ابی ہریرہ بحوالہ کنز العمال جلد ۴ ص ۱۰۱ [۵] کنز العمال جلد ۴ ص ۱۰۱ [۶] مسند احمد عن قتادہ، ودارمی باب من لا یتم الرکوع والسجود، و ابن ابی شیبہ و ابن خزیمہ و ابن حبان، و عبد بن حمید و عبدالرزاق، و طبرانی فی الاوسط، اخیر فقرہ بعض روایتون مین نہین ہے

فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ اے فلان تو خدا سے نہین ڈرتا، کس طرح نماز پڑھتا ہے، جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتین کرتا ہے، پس سوچنا چاہئے کہ اس سے کس طرح باتین کرے[1] صحیح مسلم مین ہے کہ آپنے فرمایا کہ کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہین پڑھتا، کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو یہ نہین سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے، تو اپنے ہی فائدہ کیلئے نماز پڑھتا ہے[2]، نماز کی حالت مین تھوکنا اور خصوصًا سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے، آپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ نماز کی حالت مین خدا تمھارے سامنے ہوتا ہے، تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے[3] تھوکو؟ دوسری روایتون مین ہے کہ آپ نے فرمایا، نماز مین کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے باتین کرتا ہوتا ہے[4]، مسلم کی ایک اور روایت مین ہے کہ آپنے فرمایا، نماز مین خدا تمھارے منہ کے سامنے ہوتا ہے[5]:

نماز مین سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپنے ہدایتین فرمائی ہین، ارشاد ہوا کہ جب نماز ہو رہی ہو (اور تم باہر سے آؤ) تو دوڑ کر مت آؤ، بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون، اور وقار طاری ہو[6]، اس سے اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اُس کی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیون کے سکون مین خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہون تو نماز سے پہلے اُن سے بھی فراغت کر لیجائے، مثلاً بھوک ہو اور کھانا رکھا ہو، اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھا لینا چاہئے تا کہ نماز اطمینان سے ادا ہو[7]، اسی طرح اگر استنجا یا قضاے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لیجائے تب نماز پڑھی جائے[8]،

---

[1] مستدرک حاکم فی الصلوٰۃ جلد اول ص۲۳۶ وعلی شرط مسلم، [2] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الامر بتحسین الصلوٰۃ، [3] صحیح مسلم کتاب المساجد باب النہی عن البصاق فیہا، وحاکم فی المستدرک وابوداؤد، [4] صحیح بخاری ومسلم کتاب الصلوٰۃ والمساجد، [5] ایضًا باب النہی عن البصاق فیہا، [6] صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار، [7] صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وترمذی باب کراہتہ الصلوٰۃ بحضرۃ الطعام،
[8] صحیح مسلم وابوداؤد وموطاے امام مالک وترمذی وحاکم فی الصلوٰۃ،

آغاز اسلام مین لوگ نماز کی حالت مین ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے، لیکن مدینہ آکر یہ اجازت منسوخ ہوگئی، ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی دفعہ نماز مین سلام کیا، اور جب آپنے جواب نہ دیا، تو نماز کے بعد انھون نے اس کا ذکر کیا، فرمایا[1]،

اِنَّ فِی الصَّلٰوۃِ لَشُغلاً، نماز مین اور ہی مصروفیت ہوتی ہو۔

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار مین دل محو ہوجائے اور توجہ ہٹ جائے، مکروہ ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے گل بوٹون کی ایک چادر اوڑھکر نماز پڑھی، پھر فرمایا "اسکے گل بوٹون نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا، اس کو ابوجہم (تاجر کا نام) کے پاس لیجاؤ اور انسے سادہ چادر لے آؤ[2]" اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے سامنے دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا آپنے نماز پڑھی تو خیالات مین یکسوئی نہ رہی، آپنے اس کو اتروا دیا[3]،

نماز کے اوقات کی تعیین مین بھی یہ اصول مدِ نظر رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہئین جنمین نسبتہ سکون میسر ہوتا ہو، اسی لئے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہئے، تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے، اس لئے ذرا توقف کا حکم دیا گیا، گرمی کے دنون مین چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے، اس لئے فرمایا کہ یہ دوپہر کی گرمی (گویا) جہنم کی آگ ہے، اس لئے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو،

فَاِنَّ الصَّلٰوۃَ مَشْھُوْدَۃٌ مَحْضُوْرَۃٌ[4] کیونکہ نماز مین حضور ہوتا ہے،

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہوجائے کہ اُسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے، گذر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ "جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم خدا کو نہین

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الکلام فی الصلوۃ [2] صحیح مسلم باب کراہۃ الصلوۃ فی ثوب لہا اعلام، [3] صحیح بخاری و مسلم کتاب اللباس [4] صحیح مسلم باب النہی عن الاوقات الثلث،

دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو بہرحال دیکھ رہا ہے[1]"۔ کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی، اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے، ایک صحابی جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکی چل رہی ہے، یا ہانڈی ابل رہی ہے[2]۔

رات کی نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عجیب ذوق و شوق کا عالم طاری ہوتا تھا، قرآن پڑھتے چلے جاتے، جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم و کرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے[3]۔ آپ نے فرمایا کہ نماز دو دو رکعت کرکے ہے، اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے، اور تضرع و زاری ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے، اور ہاتھ اٹھا کر اے رب اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا، تو اس کی نماز ناقص رہی[4]"

ایک دفعہ آپ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قرات کر رہے تھے، آپ نے فرمایا "لوگو! تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے، تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو[5]"

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کچھ ہدایت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمھاری نماز ایسی ہونی چاہئے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اسی وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو[6]" کیا نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لیکر اترا ہے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتیں کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو د

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان، [2] ترمذی و ابوداؤد باب البکاء فی الصلوٰۃ، [3] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۲،
[4] ابوداؤد باب صلوٰۃ النہار، و ترمذی باب ماجاء فی التخشع فی الصلوٰۃ ص۵۲ مطبوعہ دہلی، [5] ابوداؤد صلوٰۃ اللیل،
[6] مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۴۱۲ عن ابی ایوب،

انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا موثر ذریعہ ہے، اسی لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کیساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے،

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ	اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ
بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ،	قرآن کو مانتے ہیں، اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت
(انعام-۱۱)	کرتے ہیں،

نماز کی اس نگہداشت، اور محافظت کے دو معنی ہیں، اور دونوں یہاں مقصود ہیں، یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت،

نماز کے اخلاقی تمدنی اور معاشرتی فائدے

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا، اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے، تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے، مہذب و متمدن ہوجاتا ہے، متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے، اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا، اب اکسیر بنجاتا ہے،

۱- نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے، انسان کا شرم و حیا کی نگہداشت کے لئے، اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے، عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے، بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہانتک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج

کے لئے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں، اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں، آیت نازل ہوئی،

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۳)   ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

مردوں کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لئے پیشانی سے لیکر پاؤں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا، وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا، اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کرکے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن قومیں، زیب و زینت اور حسن و آرایش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بیحیائی پر اتر آتی ہیں، مرد گھٹنوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں، نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے، اور ان متمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی، چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا، اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے، اور کہدیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی،

۲-اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے، جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے، اقرأ کے بعد دوسری ہی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا، طہارت

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، (مدثر - ۱)   اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ،

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے، اور نماز کی درستی کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان

کا بدن، اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہوں، اہلِ عرب کو دوسری وحشی قوموں کیطرح طہارت و نظافت کی مطلق تمیز نہ تھی، یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجدِ نبوی میں آکر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہؓ اس کو مارنے کو دوڑے، آپنے ان کو روکا، اور اس بدو کو اپنے پاس بلاکر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ "یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس قسم کی نجاستوں کیلئے یہ موزوں نہیں ہے" اور صحابہ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہادو، ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ گذرے تو فرمایا کہ "اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا" غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی، اہلِ عرب اور عام مسلمانوں کو پاک و صاف رہنے کا خوگر بنایا، اور استنجا، بیت الخلاء، اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی نا آشنا ہیں،

نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہ طہارت کا اہتمام کرتے تھے، خدا نے ان کی مدح فرمائی،

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا ۚ	اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ،	کہ وہ پاک و صاف رہیں، اور اللہ تعالیٰ پاک
(توبہ - ۱۳)	و صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے،

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کر سکتا ہے؟

۴- نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہے، دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں، اُن کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا

کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے نتھنوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں

دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو، حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصول پر مبنی ہیں، نمازیوں کو پنجوقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے،

اہل عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے ہیں، جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا،

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہل عرب نہاتے کم تھے، ان کے کپڑے عموماً اون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے، جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے، اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتوں پہنے رہتے تھے، اس لئے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے، تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی، اسی بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا، آنحضرت صلعم نے فرمایا،

غسل یوم الجمعۃ واجب علی کل محتلم، (بخاری کتاب الجمعۃ)	جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے،

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا، اور صفائی ونظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا، جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں، فرمایا،

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (مائدہ-۲) اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔

پابندی وقت ۴- انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اُس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائین، انسان فطرۃً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابند اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کامون کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائین، جیسا کہ کاروبار کے کامون مین آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کامون کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اُس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے، اور اُسکا وقت فضول برباد نہین ہوتا، نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہین، اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہین، خصوصاً نماز با جماعت کے، اُن کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہین، ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہین، اور نماز کے اوقات اُن کے کامون کا معیار ہو جاتے ہین، وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا اُن کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ مشہور صحابی حضرت سلمانؓ فارسی کا مقولہ ہے،

الصلوٰۃ مکیالٌ فمن اوفی اوفی بہ ومن طفف فقد علمتم ما قال اللّٰہ للمطففین[1]

نماز ایک پیمانہ ہے، جس نے اس سے پورا ناپا، اسکو پورا ناپ کر دیا جائیگا، اور جس نے ناپنے مین کمی کی تو تمھین کم ناپنے والون کی سزا معلوم ہے۔

اس قول کے جان اور مطلب ہو سکتے ہین، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے، اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے۔

صبح خیزی ۵- طب اور حفظانِ صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوعِ آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہین، جو لوگ نماز کے پابند ہین وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہین کر سکتے، جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائیگا، صبح کو وقت پر آنکھ نہین کھل سکتی۔ اسی لئے آنحضرت

[1] کنز العمال مسند و باب الصلوٰۃ، جلد چہارم ص۲۴۳ بحوالہ مصنف عبدالرزاق،

صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نمازِ عشا کے بعد بے کار باتین کرنے سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا ہے[1] تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے، اور صبح خیزی مسلمانون کی عادت ہو جائے، اور صبح کو مؤذن کی پرتاثیر آواز :-

الصلوٰۃ خیرٌ من النوم، سونے سے نماز بہت بہتر ہے،

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے:

خدا کا خوف ۶- ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے، جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے، تو رحمتِ الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگون سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہنیگے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے، اس کے پاؤن بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہین، غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے، اور برائیون سے بچاتی ہے، اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے،

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت، ۵) بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے،

ہشیاری ۷- نماز عقل، ہوش، بیداری اور آیاتِ الٰہی مین تدبر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لئے دعائے مغفرت کا نام ہے اس لئے وہ تمام چیزین جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم و احساس کو کھو دین، نماز کی حقیقت کی منافی ہین، اسی لئے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہین ہوئی تھی، اس کو پی کر نشہ کی حالت مین نماز پڑھنا جائز نہ تھا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی نشہ کی حالت مین تم نماز کے قریب نہ جاؤ

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب مایکرہ من السمر بعد العشاء،

تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ، (نساء - ۷) یہانتک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو،

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزون سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم کر دین قطعاً پرہیز کریگا،

مسلمان کا امتیازی نشان

۸ - مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین، و منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونون گروہون مین کوئی امتیاز نہین کرسکتا تھا، احکام مین حج ایک ایسی چیز ہے جسکے اہل عرب مدت سے خوگر تھے، اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، خلائق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کرلیتا تھا، جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جزو تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس مین حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی، زکوٰۃ بھی کوئی حد فاصل نہین ہو سکتی تھی، کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے، اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہو سکتی تھی، اس کے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت پر بھی گران نہین ہو سکتی تھی، فقراء کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اسکا معیار نہین قرار دیا جاسکتا، کیونکہ روزہ مین چھپے چوری کھا پی لینے کا موقع بہ آسانی حاصل ہو سکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے جو ان دونون گروہون مین حد فاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک نے اسی غرض سے نماز مین سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا،

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی " (نساء - ۲۱) اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہین تو کسلمندی کے ساتھ اٹھتے ہین،

نیز فرمایا،

وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ،" (بقرہ - ۵) خضوع و خشوع والون کے علاوہ نماز سب پر گران ہے،

خصوصاً عشا اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہین آنحضرت صلعم نے فرمایا،

لیس صلاۃ اثقل علی المنافقین من منافقین پر فجر و عشا سے زیادہ کوئی نماز

الفجر والعشاء[1] گران نہین ہے،

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہین کہ جب ہم (صحابہ) کسی کو عشاء اور صبح کی نماز دن مین غیر حاضر پاتے تھے، تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے،[2]

مدینہ آکر نماز مین قبلہ کی تبدیلی جہان اور مصلحتون سے تھی، وہان ایک مصلحت یہ بھی تھی، کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہو سکے، کہ معظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے، بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہین سمجھتے تھے، مدینہ مین یہود آباد تھے، جن مین کچھ مسلمان ہو گئے تھے، وہ بیت المقدس کیطرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے، اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہین کرتے تھے، اس لئے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ کے قبلہ بنانے سے ہو سکتی تھی، چنانچہ قرآن پاک مین ہے،

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا	اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہین بنایا
لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ	لیکن اس لئے تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی
عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً	کرتے ہین، اُن سے الگ کر دین جو اُلٹے
إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ	پاؤن پھر جائینگے، اور یہ قبلہ گران ہوا لیکن
(بقرہ - ۱۷)	ان پر جنکو خدا نے راہ دکھائی،

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہیگی، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا، اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے[3]،

۹- باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے، اس فرض کے انجام دینے کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہئے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازین ہین، چنانچہ ابو داؤد مین ہے،

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم و | آنحضرت صلعم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل صلوٰۃ العشاء فی الجماعۃ [2] مستدرک حاکم (علی شرط الشیخین) جلد اول ص ۲۱۱ [3] بخاری باب فضل استقبال القبلہ

جیوشہ اذا علوا الثنایا کبّروا و   چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تھا، تو

اذا ھبطوا سبحوا فوضعت الصلوٰۃ علی ذالک، (ابوداؤد) تسبیح کہتا تھا، نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی،

صف بندی، ایک افسر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیون (نمازیون) کی باہم محبت اور دستگیری اور ایک تکبیر کی آواز پر پورے صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانون کو صفِ جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے، اوران کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے، جاڑون مین پانچ وقت وضو کرنا ظہر کے وقت دھوپ کی شدت مین گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت لہو ولعب کی دلچسپیون سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعاؤزاری کرلینا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت کو چھوڑکر حمد باری مین مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہین کہ ہم فرضی راحت وتکلیف سے بے پروا ہوکر عمل کی طاقت اپنے مین پیدا کرین، اور کام کی ضرورت کے وقت احساسِ فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھین اور اس کے لئے عارضی تکلیفون کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائین، ہفتہ مین ایک دن نمازِ جمعہ کے لئے شہر کے سب مسلمانون کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پرآرام سے پرآرام وقت مین ممکن تھا، مگر اس کے لئے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ مین بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہین، اور نمازِ جمعہ کا ہر پابند شہادت دیگا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلاتِ وقت کے اتفاقات مین اس کے لئے کس قدر مفید ثابت ہوتی ہے،

۱۰- تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیلِ اخلاق ہے، لیکن اصلاحِ اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہروقت بیدار، اور اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہے، تمام عبادات مین صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ اولاً تو ہرشخص پر فرض نہین ہین، اس کے ساتھ روزہ سال مین ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمر مین ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے، اس لئے یہ فرائض نفس کے تنبّہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہین ہوسکتے، برخلاف انکے

نماز دن مین پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے، سجدہ، رکوع، قیام و قعود، جہر و اخفا، تسبیح و تہلیل، تکبیر و تشہد نے اس کے ارکان و اعمال مین تنوع و امتیاز پیدا کر دیا ہے جنمین ہر چیز نفس مین تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے، اور ہر چوبیس گھنٹہ مین چند گھنٹون کے وقفہ سے نفس انسانی کو ہشیار اور قلب خفتہ کو بیدار کرتی ہے، اس طرح نفس کو رات دن تنبّہ ہوا کرتا ہے،

الفت و محبت

۱۱۔ نماز مسلمانون مین باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن مین پانچ دفعہ جمع ہون، اور باہم ایک دوسرے سے ملین تو اُن کی بیگانگی دور ہوگی، ان مین آپس مین محبت اور الفت پیدا ہوگی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہین گے۔ قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے،

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا	خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو، اور مشرکون
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ لا مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا	مین سے نہ ہو، ان مین سے جنھون نے اپنے دین
دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ط (روم ع-۴)	مین پھوٹ ڈالی، اور بہت سے جتھے ہوگئے،

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانون کو جتھابندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے، کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہیگی، تو غلط فہمیون کا موقع کم ملیگا،

غمخواری

۱۲۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانون مین باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے جب امیر و غریب سب ایک جگہ جمع ہونگے، اور امرا اپنی آنکھ سے غریبون کو دیکھین گے تو اُن کی فیاضی کو تحریک ہوگی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی، اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی،

ابتدائے اسلام مین اصحاب صفہ کا ایک گروہ تھا، جو سب سے زیادہ مستحق اعانت تھا، یہ گروہ مسجد مین رہتا تھا صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لیجا کر مسجد مین لٹکا دیتے تھے، جس پر یہ گروہ گذر اوقات کرتا تھا، اکثر صحابہ اور خود آنحضرت صلعم نماز سے فارغ ہوکر ان لوگون کو

ساتھ لاتے اور اپنے گھروں میں کھانا کھلاتے تھے۔ اب بھی مساجد خیرات وصدقات کا ذریعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ۔ (بقرہ-۱)

اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے صرف کرتے ہیں۔

اجتماعیت

۱۳- اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے، اس لئے تمام قوموں نے اس کے لئے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کئے ہیں۔ جن قوموں کو مذہبی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے، ان میں بھی اس اجتماعیت کی نمائش کلبوں، کانفرنسوں، اینوورسریوں، اور دوسرے جلسوں، جلوسوں، اور مظاہروں سے کی جاتی ہے۔ لیکن یہ اجتماعیت جہاں فائدے پہنچاتی ہے، وہاں اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے۔ اجتماعیت کا مرجا تی ہے۔ اگر مفید کام پیش نظر نہ ہوا تو وہی رنگ رلیوں، رقص وسرود، شرابخواری، قماربازی، چوری، بدنظری بدکاری، رشک وحسد بلکہ قتل وغارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالیں عرب مشرکوں میں بھی ملتی تھیں، اور اب بھی ملتی ہیں، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہوں اور فسادوں کا مرکز بنجاتے ہیں۔ اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتا، تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا۔ ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لئے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس سے قلب انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے۔ اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کے بجائے نیکی کے رخ کی طرف بہے۔ چنانچہ اسلام نے اسی لئے روزانہ جماعت کی عام نمازیں ہفتہ میں جمعہ کی نماز، اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں۔ کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو اور مشرکانہ بدیوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیاد ہی دعوت خیر پہ رکھی گئی تھی۔ حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مرتب بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں توبہ وانابت کو قرار دیا۔ اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال کا

اخلاص عمل کی بنیاد پر قائم ہے،

کامون کا تنوع

۱۴۔ انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمرنگی کے باوجود تفنن اور تجدد کا طالب ہے، لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضا و جوارح ہر وقت اسی ایک کام مین مصروف رہین، تو سکون و اطمینان، عیش و راحت، اور دلچسپی کی لذت، جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے، مفقود ہو جائے، مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چیخ اُٹھے، اسی لئے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے جس مین انسان کو حرکت و سکون دونون کا یکسان موقع ملتا رہتا ہے، رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیاتِ الٰہی مین شمار کیا گیا ہے کہ اس تغیر و تبدل سے نظامِ عالم مین نیرنگی پیدا ہوتی ہے، اور اس تقسیم سے انسانون مین اپنے ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان پر فرض ہے، اور نہ سال مین ایک دفعہ یا عمر بھر مین صرف ایک دفعہ فرض ہے، بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آکر توڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی، اور عصر پر پہنچکر ختم ہوئی، پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا، بعد ازین خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشا پر جاکر منتہی ہوئی، اب نیند آگئی، اور صبح تک بیخبری رہی، اٹھے تو دعاؤن کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا، وہ دولتمند جو جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہین حاصل کرتے، وہ اس روحانی "انٹرول" (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہین، یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹون تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا تھا، وہ چند منٹ مین ہاتھ منھ دھو کر دعا و تسبیح اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہو گیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لئے نئی قوت پیدا کر لی،

تربیت

۱۵۔ انسان کی عملی کامیابی، استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے، کہ جس کام کو اس نے شروع کیا، پھر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری، اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے، جس کام مین اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو، بلکہ دن مین کئی دفعہ

نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بار سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انسان مین، استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے، اس لئے انسان مین اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھکر کوئی اور چیز نہین ہو سکتی، اس لئے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح مین کہا،

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج-۱) وہ جو اپنی نماز مداومت کیساتھ ادا کرتے ہین،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

احب العمل الی اللہ ادومه وان قل، (ابوداود باب ما یومر به من القصد فی الصلوٰۃ) محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو،

نظم جماعت ۱۶-کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہین رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام مین نماز با جماعت مسلمانون کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربون کے سامنے پیش کر کے اُن کی زندگی کا خاکہ کھینچا، اور بتایا کہ مسلمانون کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا، اور یکسان حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ "جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہوگے تمھارے دل بھی آپس مین نہ ملین گے"[1]

مساوات ۱۷-یہی جماعت کی نماز مسلمانون مین برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درسگاہ ہے، یہان امیر و غریب، کالے گورے، رومی حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہین ہے، سب ایک ساتھ ایک درجہ اور

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف عند الاقامۃ و بعدها و ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف،

ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگون ہوتے ہیں. جماعت کی امامت کے لئے حسب و نسب نسل و خاندان، رنگ روپ، قومیت اور جنسیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی. بلکہ علم و دانش فضل و کمال اور تقوی و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے. یہاں شاہ و گدا، اور شریف و رذیل کی تفریق نہیں، سب ہی ایک زمین پر ایک امام کے پیچھے، ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں. اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا، اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے. کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درسگاہ کہیں اور بھی قائم ہے؟

اطاعت (۱۰)- جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعۃ امام کے ناممکن ہے. جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز باجماعت مسلمانوں کی اس زندگی کا رمز ہے. کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں. اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہئے، جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کیلئے بانگِ درا اور صدائے جرس ثابت ہو،

اطاعتِ امام کے لئے ایک طرف تو قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہئے جس کی تعلیم مقتدیوں کو نماز میں ہوتی ہے. دوسری طرف امام کو اخلاقِ صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہئے جو ہمیشہ لوگوں کے پیش نظر رہے، نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے، وہ ایک دائمی حرکت ہے. جو قوم کے اعضاء و جوارح کو ہر وقت اطاعت گذاری کے لئے تیار رکھتی ہے. اس کے ساتھ نماز پنجگانہ اور جمعہ و عیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے. اس لئے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب، اس پر نکتہ چینی اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزون ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں. ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش و عشرت میں مصروف ہو نماز صبح میں شریک نہیں ہو سکتا، ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریک جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا، چنانچہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب بنو امیہ کا زمانہ آیا تو صحا

کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا، اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیاں کین، احادیث مین بھی اس زمانہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے، جس مین ائمہ وقت پر نماز ادا کرنے مین غفلت کرینگے

معیار فضیلت

۱۹- نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم و فضل اور تقوی کے کوئی اور قید نہین ہے، اس لئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ہر وقت ممکن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جماعت مین جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقرء) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے آئے، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان مین سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن ہین انھین کو قرآن زیادہ یاد ہے، چنانچہ آپ نے انھین کمسن صحابی کو ان کا امام مقرر فرمایا، اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگون مین اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویق و ترغیب بھی پیدا ہوتی ہے،

روزانہ کی مجلس عمومی

۲۰- آنحضرت صلعم اور خلفاے راشدین کے زمانہ مین یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا، یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی، یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی، تو مسلمانون مین منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے، اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے، یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانون کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا، جس کے لئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل و سستی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا،

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار، اور اس کے مذہبی و اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانون کا شیرازہ بندھا تھا، اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے، مسجد مسلمانون کے ہر قومی اجتماع کا مرکز، اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی، جس طرح

آج ہر جلسہ کا افتتاح اُس کے نصب العین کے اظہار و تعیین کے لئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے، اُن کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا، ان کی ہر چیز اُس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی، ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دار الامارۃ تھا، وہی دار الشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درسگاہ، اور وہی معبد تھا،

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے، اور جماعت کے فائدہ کے لئے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا، اور اختلافِ باہمی کو تہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت مین فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سرلشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز انہین رموز و اسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانون کو نظم و جماعت، اطاعت پذیری و فرمانبری، اور وحدتِ قوت کا سبق دن مین پانچ بار سکھاتی ہے، اسی لئے اس کے بغیر مسلمان، مسلمان نہین، اور نہ انکی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیادِ امامت ہے، نہ زندگی ہے، اور نہ زندگی کا نصب العین ہے، اسی بنا پر داعیِ اسلام علیہ السلام نے یہ فرما دیا،

العھدُ الذی بیننا وبینھم الصلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر، (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)	ہمارے اور اُن کے درمیان جو معاہدہ ہے، وہ نماز ہے، تو جس نے اسکو چھوڑا، اُس نے کفر کا کام کیا،

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالبِ بے جان، شرابِ بے نشہ اور گلِ بے رنگ و بو ہو کر رہجاتا ہے، اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اُس سے رخصت ہو جاتی ہے، اسی لئے نماز اسلام کا اوّلین شعار ہے، اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے،

عرب کی روحانی کایا پلٹ

وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھون نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہین دیکھا تھا، وہ جس کی

روح ربّانی تسکین و تسلّی کے احساس سے خالی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے دفعۃً کیا ہوگیا؟ اب عبادت الٰہی اوسکے ہر کام کا مقصد بن گئی۔ اب اس کو اپنے ہر کام مین اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی، اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہین چاہتی تھی، اُس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہین آتی تھی، اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا، اُس کی آنکھین اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھین، اس کی روح یادِ الٰہی کی تڑپ اور ذکرِ الٰہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلّی نہ پاتی تھی،

دل راکہ مردہ بود حیاتے زنو رسید — تا بوے از نسیم میش در مشام رفت

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی، کہ

وَلَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا (نساء۔۲۱) — اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں،

دعوتِ حق اور فیضِ نبوت کے اثر و برکت نے ان کی یہ شان نمایان کی، کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتین بھی اُن کو ذکرِ الٰہی سے غافل نہ کرسکین،

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، (نور۔۵) — ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہین کرتا،

اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، غرض ہر حال مین ان کے اندر خدا کی یاد کے لئے بیقراری تھی،

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ، (آل عمران۔۲۰) — جو خدا کو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے ہین،

راتون کو جب غافل دنیا، نیند کے خمار مین ہوتی، وہ بستر دن سے اٹھکر خدا کے سامنے سربسجود اور راز و نیاز مین مصروف ہوتے تھے،

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ — جن کے پہلو (رات کو) خوابگاہون سے علیحدہ

رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا، | رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار

(سجدہ ع-۲) | کو پکارتے ہیں،

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ، | اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو

(مرسلات -۲) | تو نہیں جھکتے،

اب ان کی یہ صورت ہو گئی کہ

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا | تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ

مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز (فتح -۴) | میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کی تلاش کرتے ہیں

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی، کہ

وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ | اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو اُن کے دل

الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ ج (زمر-۵) | جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہکتے جاتے ہیں،

آفتابِ نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینوں میں خشیتِ الٰہی کا جوہر پیدا کر دیا،

اَلَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ | وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو اُن کے

(انفال-۱ وحج-۵) | دل دہل جاتے ہیں،

یہ خود قرآنِ پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے، خواہ وہ کھیتی کرتے ہوں، یا تجارت، یا محنت مزدوری، مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی، قتادہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے، لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا، تو یہ شغل و عمل اُن کو یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ اس کو

پوری طرح ادا کرتے تھے[1] حضرت ابن عمرؓ کہتے ہین کہ ایک دفعہ وہ بازار مین تھے، نماز کی تکبیر ہوئی، دیکھا کہ صحابہؓ نے فوراً دکانین بند کردین اور مسجد مین داخل ہوگئے[2]

صحابہؓ تمام تر راتین خدا کی یاد مین جاگ کر بسر کرتے تھے، یہان تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتون مین بھی وہ عبادتِ الٰہی مین مصروف رہتے تھے، خدا نے گواہی دی،

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ	بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دوتہائی رات
ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ	کے قریب، اور آدھی رات اور ایک تہائی رات
مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ط	کے بعد اٹھتا ہے، اور تیرے ساتھ ایک جماعت
(مزمل - ۲)	بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے،

اس زمانہ مین صحابہ کو راتون کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہان ملتا تھا، جلوۂ دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہین کسی مخفی گوشہ مین جمع ہوتے تھے، ذوق و شوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے، دیر تک سجدہ مین پڑے رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے اس والہانہ اندازِ عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے، قرآنِ پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ مین اسطرح ادا کی ہے،

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ، الَّذِيْ	اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات
يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ، وَتَقَلُّبَكَ فِي	کو جب تو نماز کے لئے اٹھتا ہے، اور سجدہ مین
السّٰجِدِيْنَ، (شعراء - ۱۱)	پڑے رہنے والون کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے

مدینہ منورہ مین آکر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبانِ مبارک سے نکلا وہ یہ تھا،

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَاَفْشُوْا	اے لوگو! غریبون کو کھانا کھلاؤ، اور سلام کو پھیلاؤ

[1] صحیح بخاری باب التجارۃ فی البز مرسلاً۔ [2] فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۲۵۳ بحوالہ عبد الرزاق۔

السلام وصلوا والناس نیام (ترمذی)　　اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہوں،

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انھون نے راتون کا سونا چھوڑ دیا، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگون کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا، چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ رات بھر نماز مین مصروف رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ "عثمان! تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی"[1]، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہین کہ صحابہ راتون کو اُٹھ اُٹھ کر نماز پڑھتے تھے، اور بہت کم سوتے تھے[2]، حضرت ابو ہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے ایک مین خود نماز پڑھتے تھے، دوسرے مین اُن کی بیوی، اور تیسرے مین ان کا غلام، اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا[3]، حضرت عبد اللہ بن عمرو ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت[4] فرمائی، حضرت ابو درداءؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز مین گذار دیتے تھے، حضرت سلمانؓ فارسی اُن کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ اُن کے ہان جا کر مہمان ہوئے، جب رات کو حضرت ابو درداءؓ عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے منع کیا، پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا، حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، کہ اب نماز کا وقت[5] ہے، کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عمداً قضا کی ہو، یہانتک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت مین بھی وہ اس فرض سے غافل نہین رہتے تھے، ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پرخطر کام کے لئے کہین بھیجا تھا، جب وہ منزلِ مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، ان کو خوف تھا کہ اگر کہین ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا، تو وقت نکل جائے گا اور اگر عصر مین تاخیر کی جائے تو حکم الہی کی تعمیل مین دیر ہو جائے گی، اس مشکل کا حل انھون نے اس طرح کیا، کہ وہ اشارون مین نماز پڑھتے جاتے اور چلتے

[1] ابو داؤد باب القصد فی الصلوٰۃ [2] ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ فی وقت قیام النبی صلعم من اللیل [3] صحیح بخاری کتاب الاطعمہ باب الحشف، [4] صحیح بخاری کتاب الصوم، [5] صحیح بخاری کتاب الصوم،

جاتے تھے[۱]، سخت سے سخت مجبوری کی حالت مین بھی نماز اُن سے ترک نہین ہوتی تھی، چنانچہ بیماری کی حالت مین وہ دوسرون کا سہارا لے کر مسجد مین حاضر ہوتے تھے[۲]، پھر وہ جس خضوع و خشوع، محویت اور استغراق کیساتھ نماز ادا کرتے تھے، اس کا نظارہ بڑا پُر اثر ہوتا تھا، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو اُن پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی، کہ کافر عورتون اور بچون تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا[۳]، حضرت عمرؓ نماز مین اس زور سے روتے تھے، کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی[۴]، حضرت تمیمؓ داری ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت مین صبح کر دی، بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے[۵]، ع شب شود صبح و ہمان محو تماشا باشم، حضرت انسؓ قیام اور سجدہ مین اتنی دیر لگاتے تھے، کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہین[۶]، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ جب نماز مین کھڑے ہوتے تھے تو کبھی کبھی سورتین پڑھ ڈالتے تھے، اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ستون کھڑا ہے، اور جب سجدہ مین جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے، کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطحِ جامد سمجھکر ان کی پیٹھ پر آکر بیٹھ جاتے تھے[۷]،

ایک رات میدانِ جنگ مین ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لئے متعین ہوتے ہین، ایک صاحب سو جاتے ہین، اور دوسرے نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے ہین، دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن مین ترازو ہو جاتا ہے، کپڑے خون سے تر بتر ہو جاتے ہین، مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے، نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہین، ساتھی کہتے ہین کہ تم نے اس وقت مجھے کیون نہ جگایا، جواب ملتا ہے، مین نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی، پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کئے بغیر نماز توڑ دون

[۱] ابو داؤد باب صلوۃ الطالب، [۲] نسائی کتاب الامامہ باب المحافظۃ علی الصلوۃ، [۳] صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب اذا بکی الامام فی الصلوۃ، [۴] صحیح بخاری کتاب الہجرۃ، و کتاب الصلوۃ، باب المسجد یکون فی الطریق، [۵] اسد الغابہ تذکرۂ حضرت تمیمؓ داری، [۶] صحیح بخاری باب المکث بین السجدتین، [۷] حالات عبد اللہ بن زبیرؓ اصابہ و اسد الغابہ وغیرہ، [۸] ابو داؤد کتاب الطہارۃ، باب الوضوء من الدم،

اس سے بھی زیادہ پُر اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں، تیروں کا مینہ برس رہا ہے نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوند رہی ہیں، سر گردن، دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ دفعۃً نماز کا وقت آجاتا ہے، فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بنجاتی ہیں اور ایک اللہ اکبر کی آواز یکایک موت و حیات سے بے پروا ہو کر زمین پر جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں،

نور کا تڑکا ہے، اسلام کے دائرہ کا مرکز، فاروق اعظمؓ امام نماز ہیں، پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں، دفعۃً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے، آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں، خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں، حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں، پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہو لیتا ہے تب خلیفۂ وقت کو اٹھایا جاتا ہے[1]۔

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے ان کو نماز کے لیے جگایا تو بولے "ہاں جو شخص نماز چھوڑ دے، اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں" چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی[2]،

حضرت علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوتے ہیں، یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں[3] کہ ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کر دیتی ہے، اور کچھ دیر کے بعد وہ داعئ اجل کو لبیک کہتے ہیں، امام مظلوم حسینؓ بن علیؓ کربلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں، عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدان جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں، ہزاروں اشقیا آپ کو نرغہ میں لیے ہوتے ہیں، اتنے میں ظہر کا وقت آجاتا ہے، آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں[4]،

---

[1] صحیح بخاری واقعۂ شہادت عمرؓ [2] موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب العمل فیمن غلب علیہ الدم [3] الریاض النضرۃ للمحب الطبری جلد ۲ ص ۲۴۶ [4] تاریخ طبری کبیر ص ۲۴۴، ج ۷، واقعات سنہ ۶۱ھ،

نماز میں جس خضوع و خشوع کا حکم ہے، صحابہ کرام نے اس کے یہ نمونے پیش کیے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے اس روحانی ذوق و شوق میں خلل انداز ہوئی تو انھوں نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا، حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، ایک خوشنا چڑیا نے سامنے آکر چہچہانا شروع کیا حضرت ابوطلحہؓ دیر تک ادھر ادھر دیکھتے رہے، پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی دل میں کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا، یہ کہکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، اور کہا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ باغ راہ خدا میں نذر ہے،

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے، باغ اس وقت نہایت سرسبز و شاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا، پھلوں کی طرف نظر اٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی، جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، انکی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا، راہ خدا میں دیتا ہوں، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا۔[۱]

---

[۱] یہ دونوں واقعے موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب مایشغلک عنہا میں مذکور ہیں،

زکوٰۃ،

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق ومخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے، اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظامِ جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا رکن **زکوٰۃ** ہے، جو آپس مین انسانون کے درمیان ہمدردی، اور باہم ایک دوسرے کی امداد، اور معاونت کا نام ہے، اور جس کا اہم فائدہ نظامِ جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ بہم پہنچانا ہے، زکوٰۃ کا دوسرا نام **صدقہ** ہے، جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی، اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے، لیکن فقہی اصطلاح مین "زکوٰۃ" صرف اُس مالی امداد کو کہتے ہین، جو ہر اُس مسلمان پر واجب ہے، جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو،

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب مین زکوٰۃ بھی اُن عبادات مین سے ہے، جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفون مین فرض بتائی گئی ہے، لیکن اُن کے پیروؤن نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا، کہ بظاہر اُن کے مذہبی احکام کی فہرست مین اس کا نام بھی نظر نہین آتا، حالانکہ قرآنِ پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفون سے ہوتی ہے، کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزء لاینفک تھی، اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزء رہی ہے، بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا، اُس مین نماز اور زکوٰۃ دونون تھین،

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، (بقرہ-۱۰) (ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا) کہ کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ،

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ، (مائدہ-۳) (اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے رہتے زکوٰۃ،

حضرت اسمٰعیلؑ کے ذکر مین ہے،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ	اور قرآن مین اسمٰعیل کا ذکر کر، بے شک وہ وعدہ
صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا وَ	کا سچا تھا، اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا۔ اور وہ اپنے
كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ	لوگون کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا، اور وہ اپنے
وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا. (مریم-۴)	رب کے نزدیک پسندیدہ تھا،

حضرت عیسیٰؑ کہتے ہین،

وَاَوْصَانِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ	اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ
حَيًّا، (مریم-۲)	دینے کی تاکید کی،

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانورون مین ایک عشر یعنی دسوان حصہ (احبار ۲۷-۳۰-۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا، (خروج ۳۰-۱۳، ۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج کھلیان کی منتشر بالین اور پھل والے درختون مین کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے، جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی، یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ مین جمع کیجاتی تھی، اس کا ساتھوان حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسوان حصہ حضرت ہارونؑ کی اولاد (لاوین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی، اور ہر تیسرے سال مین دسوان حصہ بیت المقدس کے حاجیون کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا، اسی مد سے عام مسافرون، غریبون، بیوائون اور یتیمون کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا[۱]، اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم، جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف وآلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی[۲]،

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعتِ موسوی کے ان ظاہری قواعد مین کوئی ترمیم نہین کی،

۱؎ انسائیکلوپیڈیا برطانیکا طبع یازدہم مضمون "خیرات" (CHARITY) باب یہودیون مین "خیرات" ۲؎ توراۃ خروج ۳۰-۱۶ و ۳۸-۲۶

بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا، انجیل لوقا (۱۸-۱۰) میں ہے کہ جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نمایش، اور فخر کے لیے دیتا ہے، اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے"، اسی انجیل کے ۲۱ویں باب کی پہلی آیت میں ہے

"اگر کوئی دولتمند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی "قارقم" ڈالے، اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے، تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولتمند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لٹا دے، کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذر جانا آسان ہے مگر دولتمند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ (متی ۱۹-۲۴)

ساتھ ہی انھوں نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے، (متی ۱۷-۲۴)

توراۃ کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں تک محدود تھی اس لیے ان ہی دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے، سونا چاندی اور ان کے سکوں کی چونکہ قلت تھی اس لیے ان کی زکوٰۃ کا ذکر ایک ہی دو جگہ ہے، اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی، علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے، تصریحاً معلوم نہیں ہوتی، نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے، یعنی وہ کہاں خرچ کیجائے، اسکی تفصیل بھی خود توراۃ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے،

غرض وجوہ جو کچھ ہوں، مگر حالت یہ تھی کہ یہودنے اس فرض کو بھلا دیا تھا، اور خصوصاً عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ (بقرہ ۸ - ۱۰)

(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا، پھر تم پھر گئے، مگر تم میں سے تھوڑے اور تم دھیان نہیں دیتے۔

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا، مگر یہ حکم ہر ایک کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا۔ دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے، تاہم ان کے لیے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا، اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب الادا تھی جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا، اس نے نہایت خوبی اور دقت نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا۔ انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے، اس لیے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا، ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیے، سونا چاندی، اور جانور اور پیداوار، اور ان میں سے ہر ایک کی علحدہ علحدہ شرحیں مقرر کیں، سونے چاندی میں چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسواں حصہ متعین کیا، جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد اور ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں، پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعیین و تحدید کی، اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

یہ تو اجمال تھا، اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعت محمدی کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کرنا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت اسلام کی تعلیم، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ وحی میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوق الٰہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں

ان دونون فریضون کا باہم لازم وملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے، کہ اسلام مین حقوق اللہ کے ساتھ حقوقِ عباد کا بھی یکسان لحاظ رکھا گیا ہے، قرآنِ پاک مین جہان کہین نماز کا ذکر ہے، اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآن پاک مین بیس مقامات پر "اقام الصلوٰۃ" کے بعد ہی ایتاء الزکوٰۃ آیا ہے، مثلاً اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ یا اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اُس کے دینے اور نہ دینے والون کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام مین زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے، بارگاہِ نبوی مین آکر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہین، تو ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے، صحیحین کی کتاب الایمان مین اس قسم کی متعدد حدیثین ہین جنمین یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے، بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائطِ بیعت مین داخل کی گئی ہے، چنانچہ حضرت جریر بن عبد اللہؓ بجلی کہتے ہین کہ مین نے رسول اللہ صلعم سے بیعت تین باتون پر کی تھی، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا[1] وفد عبد القیس نے ۵ھ مین نبوت کے آستانہ پر حاضر ہوکر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کین تو آپ نے اعمال مین پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو جگہ دی[2]،

۹ھ مین جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو اسلام کا داعی بناکر یمن بھیجا ہے، تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ "پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا، جب وہ یہ جان لین تو ان کو بتانا کہ دن مین پانچ وقت کی نماز اُن پر فرض ہے، جب وہ نماز پڑھ لین تو انھین بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے دولتمندون سے لیکر اُن کے غریبون کو دی جائیگی،"

صحابہؓ مین جو لوگ شریعت کے راز دان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب اہلِ عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابو بکرؓ نے اُن کے خلاف تلوار کھینچ لی، حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا

---

[1] یہ دونون حدیثین صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول صفحہ ۱۸۱ مین ہین، [2] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیۃ،

کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہین، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے" حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا
خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ مین فرق کریگا مین اس سے لڑونگا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم! جو رسول اللہ
صلعم کے زمانہ مین بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑیگا[1]، حقیقت مین یہ ایک لطیف نکتہ تھا جسکو
صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا[2]، اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت
کی گردن جھکا دی،

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے، اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادون
پر قائم ہے، جن مین سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے، اسلام کا نظام روحانی نماز باجماعت سے
جو کسی مسجد مین ادا ہو، قائم ہوتا ہے، اور نظام مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال مین جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب
ہوتا ہے، اسی لئے یہ دونون چیزین، اسلام مین ساتھ ساتھ نظر آتی ہین، اور ان کی انفرادی حیثیت کیساتھ
ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدی نے خاص زور دیا ہے، نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر
بھی انجام پا جاتی ہے، لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ بیت المال
کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے. مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہین
یہی سبب ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت مین جب بعض قبیلون نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال مین
داخل نہ کرین گے بلکہ بطور خود اس کو صرف کر دین گے، تو شریعت محمدی کے شناسائے راز نے ان کی اس
تجویز کو قبول نہین کیا، اور بزور ان کو بیت المال مین زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا، کہ اگر ان کی یہ بات تسلیم
کر لیجاتی، تو اسلام کی وحدت کا سررشتہ اسی وقت پارہ پارہ، اور مسلمانون کی امامت وجماعت کا نظام

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ملتقطا، [2] درحقیقت حضرت ابو بکر صدیقؓ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت
تھی، فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ ...... فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ
(توبہ - ۱) ان مشرکون کو مارو جہان پاؤ........ تو اگر وہ توبہ کرین اور نماز کھڑی کرین، اور زکوٰۃ
دین تو ان کو آزادی دے دو، نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم ص۱۰۹۶، باب کراہیۃ الاختلاف،

سی وقت درہم برہم ہو جاتا،

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبر گیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے، اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے،

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل

جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آکر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی، اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہوئی، لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا بعض مورخوں اور محدثوں کو اس بنا پر کہ ۸ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے، اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس سے پریشانی ہوئی ہے، حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مترادف تھا، اصلی مقدار، نصاب سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے، خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم "نماز" اور دوسرے کا "زکوٰۃ" ہے، اسلیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق جب بلند ہوئی، تو اس پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے، اسی طرح بیکس اور لاچار انسانوں کی دستگیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے بعثت کے وقت آپ کی نسبت فرمایا، "آپ قرابتداروں کا حق پورا کرتے ہیں، قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریب کو کماتے ہیں، مہمان کو کھلاتے ہیں، لوگوں کی مصیبتوں میں مدد دیتے ہیں[1]"، غور کرو کیا زکوٰۃ انہی فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہیں اور ان ہی دو اجمالی

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب اول۔

حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے،

سورۂ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورہ ہے، لیکن اس سرزمین میں وہ تمام بیج موجود ہیں، جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکامِ اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا، اس میں نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (مدثر-۱) اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر،

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے جو اس سورہ میں موجود ہے، اس کے بعد ہے،

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرْ (مدثر-۱) اور بدلا بہت چاہنے کے لیے کسی پر احسان نہ کر۔

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں، مدثر کے بعد سورۂ مزمل اتری، اس میں بہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں، اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کی گئی ہے،

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا (مزمل-۲) اور نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دو، اور جو تم آگے بھیجوگے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤگے،

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کرکے حبشہ گئے ہیں، اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلاکر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہیں، اور حضرت جعفرؓ نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے، اس میں ہے "اور وہ پیغمبرؐ ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزے رکھیں، اور زکوٰۃ دیں"[1] اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی میں ہوچکا تھا، اور وفد عبد القیس کے (جو تقریباً ۵ھ میں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپؐ نے جن احکام کی تعلیم دی ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی[2]، ۶ھ میں جب نجاشی نے نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد، ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے،

---

[1] مسند احمد جلد اول ص ۲۰۲ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ،

اسلام کی تعلیمات دریافت کین تو انھون نے دوسری چیزون کے ساتھ زکوٰۃ و صدقہ کا[1] بھی تذکرہ کیا، ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۵ سنہ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی،

لیکن چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تعلیم صرف نظریون کا پیش کرنا نہ تھا، بلکہ امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند بنانا تھا، اس لئے حالات کے اقتضا اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزا اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی، مکہ معظمہ مین مسلمانون کی پریشانی، پراگندگی، شکستہ حالی، اور غربت و مسکینی کی جو کیفیت تھی اس کی بنا پر اتنا ہی اُن کے لئے بہت تھا، کہ وہ کسی یتیم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلادین، چنانچہ اس زمانہ مین اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی،

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ، اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ، يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ، اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ، (بلد-۱)	اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے، کسی (قرضدار یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن مین ناتے کے کسی بن باپ کے بچہ کو، یا خاک مین پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا،

عام قریش پر جنھون نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہین سنا، عتاب آیا،

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ، (ماعون-۱)	وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب کے کھلانے پر اپنے کو آمادہ نہین کرتا،
كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ، (فجر-۱)	یہ بات نہیں، بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہین کرتے اور آپس میں محتاج کے کھلانے کی تاکید نہیں کرتے،

[1] صحیح بخاری جلد اول آغاز کتاب الزکوٰۃ و کتاب التفسیر،

اور مسلمانون کے اخلاص، باہمی ہمدردی، اور ان کے جذبۂ ترحم کی تعریف فرمائی، کہ

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَّ	اور وہ (حاجتمند ہونے کے باوجود) محتاج یتیم اور
يَتِيمًا وَّأَسِيرًا، إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ	قیدی کو کھانا کھلاتے ہین (اور کہتے ہین) کہ ہم تم کو
لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا،	صرف خدا کے لئے کھلاتے ہین، تم سے نہ بدلا چاہتے
(دھر-۱)	ہین نہ شکریہ،

مدینہ منورہ آکر جب مسلمانون کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انھون نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ مین صدقۃ الفطر واجب ہوا[1]، یعنی یہ کہ سال مین ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ مین خیرات کرے، تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گذارین، اس کے بعد مسلمانون کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کیگئی، انھون نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! ہم کیا خیرات کرین،

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ، (بقرہ-۲۷)	وہ پوچھتے ہین کہ وہ کیا خیرات کرین،

ارشاد ہوا،

قُلِ الْعَفْوَ، (بقرہ-۲۷)	کہدو (اے پیغمبر) کہ تمھاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے، (اسکو خیرات کرو)

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ مین اسلام کا پہلا قدم ہے، صحیح بخاری[2] مین حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانون کو یہ حکم تھا، کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ مین خیرات کردین، آیندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھین[3]، کہ اس وقت اسلام اور مسلمانون کی حالت اسی کی مقتضی تھی، کچھ دنون کے بعد جب مسلمانون کو فتوحات نصیب ہوئین زمینین اور جاگیرین ہاتھ آئین تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا،

[1] تاریخ طبری طبع یورپ صفحہ ۱۲۸۱
[2] کتاب الزکوٰۃ مع فتح الباری
[3] جلد ۳ صفحہ ۲۱۶

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ (بقرہ - ۳۷)

اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں، اور جو ہم تمھارے لیے زمین سے پیدا کریں، انہیں سے کچھ خیرات میں دو،

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (بقرہ - ۱)

اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے اس میں سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں،

صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا، خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بے قرار رہتے تھے، چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے تو غریب نادار صحابہؓ نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے رسول! جس کے پاس نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا وہ محنت و مزدوری کرکے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے، انھوں نے پھر گذارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا کہ وہ فریاد خواہ حاجتمند کی مدد کرے، انھوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اسکی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا "تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے، یہی اس کا صدقہ ہے"[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پُر اثر تعلیمات اور نصیحتوں کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لیے بازار جاکر بوجھ اٹھاتے تھے، اور اس سے جو کچھ ملتا تھا اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے،[2]

لیکن بایں ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا، اور اسلیے اسکا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا، رمضان ۸ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سررشتہ میں منسلک کردیا، اور اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی،

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ

(اے محمد رسول اللہ) ان کے مال میں سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ [2] ایضاً

وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا، صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اسکے ذریعہ سے تم ان کو پاک وصاف کرسکو، (توبہ - ۱۳)

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے، اس کی وصولی کے لیے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا[۱]، اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی، یہ تمام احکام و قوانین سورۂ برارت میں مذکور ہیں، جو ۹ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے،

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین | اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط و تفریط تھی، توراۃ میں جو عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا، وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا، (استثنا ۱۴-۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی، اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعیین تھا، کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب الادا ہو کہ انسان باربار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو، اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں مسکینوں اور قابل امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے، اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی، کیونکہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لیے ۱۲ مہینوں کا سال مقرر کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصلی سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے، اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور ان کا بیوپار کرنا ہے، آمدنی کے ان تمام ذریعوں کیلیے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں، جاڑا، گرمی، برسات، ربیع اور خریف، گذر جائیں تاکہ پورے سال کے آمد و خرچ اور نفع و نقصان کی میزان لگ سکے، اور زمیندار، کاشتکار، تاجر، نوکر، صناع، ہر ایک اپنی آمدنی و سرمایہ کا حساب کتاب کرکے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے، بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل

[۱] ابن سعد جلد مغازی ص ۱۱۵ و تاریخ طبری جلد ۴ ص ۲۲، مطبوعۂ یورپ،

کی افزائش مین بھی اوسطاً ایک سال[1] لگتا ہے، ان تمام وجوہ سے ہر منظم جماعت، ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے، شریعت محمدی نے بھی اس بارہ مین اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے، اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے، چنانچہ اس کا کھلا ہوا اشارہ سورۂ توبہ مین موجود ہے، جس مین زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہین، زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے،

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ	مہینون کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہین
شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ	جس دن اللہ نے آسمانون کو اور زمین
وَالْاَرْضَ ، (توبہ ۔ ۵)	کو پیدا کیا،

زکوٰۃ کی مقدار توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل مین زکوٰۃ کی مقدار، پیداوار کا دسوان حصہ تھا، اور نقد مین آدھا مثقال جو امیر و غریب سب پر یکسان فرض تھا، لیکن زمین کی مختلف قسمین ہوتی ہین، کہین زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے، اور کہین نہر کے پانی سے، جہان مزدوری اور محنت کا اضافہ ہوجاتا ہے، نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہین، بعض مرتبہ دولت بے محنت، مفت ہاتھ آجاتی ہے، اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اس لئے سب کا یکسان حال نہین ہوسکتا، انجیل نے حسب دستور اس مسئلہ کا کوئی حل نہین کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت کاملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پولیٹکل اکانمی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے نظری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کردی، اس سلسلہ مین سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین، دونون حقیقتون کو اپنے نظام مین جمع کرلیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دیدی کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم و بیش جو چاہے، اور جب چاہے خدا کی راہ مین دیدے، اس کا نام

---

[1] بکری کی مدت حمل چھ مہینے، گائے کی نو، اونٹ کی گیارہ، اور بھینس کی بارہ مہینے ہے،

انفاق یا عام خیرات و صدقہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کردیا کہ ہر شخص کی دولت مین غریبون اور محتاجون اور دوسرے نیک کامون کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصّہ ہے، اور اس کا نام زکوٰۃ ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے قرآنِ پاک مین فرمایا،

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۙ وَ اَلَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۙ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (معارج-۱)

جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہین، اور جن کے مالون مین مانگنے اور محروم کا معلوم حصّہ ہے،

اس آیت سے صاف و صریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانون کی دولت مین غریبون کا جو حصّہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملًا رائج ہے، چنانچہ قرآنِ پاک مین مَعْلُوْمٌ اور مَعْلُوْمَاتٍ کے الفاظ جہان آئے ہین، وہان بھی مقصود ہے، اس سے ثابت ہوا کہ عرب مین جو قوم کسی نہ کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اوسکی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کرلیا تھا، عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے، جس کا حکم توراۃ مین مذکور ہے، اور اس کی شرح بھی اس مین مقرر ہے، یعنی پیداوار مین دسوان حصّہ، اور نقد مین نصف مثقال، آنحضرت صلعم نے اپنی حکمتِ ربّانی سے اجناس زکوٰۃ پر مختلف شرحین مقرر فرمائین، جو قیمت کے لحاظ سے اسی "شرحِ معلوم" کے مساوی ہین، اور ان شرحون کو فرامین کی صورت مین لکھکر اپنے عمال کے پاس بھجوایا، یہی تحریری فرامین تدوینِ حدیث کے زمانہ تک بعینہ محفوظ تھے، اور تدوینِ حدیث کے بعد ان کو بعینہ کتبِ حدیث مین درج کیا گیا جو آجتک موجود ہین،

اس تمام تفصیل کا مخرج قرآنِ پاک مین بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے، اس لئے اصول کا اقتضا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو، زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے، اور جیسے جیسے محنت بڑھتی، اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے، زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے، عرب مین یہ دستور تھا کہ قبیلون کے سردار

چوتھ وصول کرتے تھے، اسی لئے وہ اپنے سرداروں کو مُرَبّاع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے، شاید دوسری پرانی قوموں مین بھی یہ دستور رہا ہو، ہندوستان مین مرہٹون نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا، مگر چونکہ اسلام کو حکومت اور سپاہیون کے ساتھ زیادہ رعایت مدِّ نظر تھی، اس لئے اُس نے چار کو پانچ کردیا، اس طرح چوتھ (۱/۴) کے بجائے دولت کا پانچوان حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا، جس کو رسول اور اُن کے بعد اُن کے نائب اپنے ذاتی ضروریات، اہل وعیال کے نان ونفقہ اور نادار مسلمانون کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مد مین صرف کرسکین،

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے، "خمس" ہے، قرآن نے کہا،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ	اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچوان
خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی	حصہ خدا کے لئے، اور رسول کے لئے اور قرابتمند
وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ	کے لئے اور یتیمون اور مسکینون اور مسافر
(انفال - ۵)	کے لئے ہے،

نکتہ، اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے، جہاد یا دشمنون سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلاے کلمۃ اللہ ہے، غنیمت کا مال حاصل کرنا نہین، اور اگر کوئی صرف حصول غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ مین جہاد نہ ہوگی، اور نہ اس کا کوئی ثواب ملیگا، اس کی طرف خود قرآن پاک مین اشارہ موجود ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد حدیثون مین اس کی تشریح فرمادی ہے، اس بنا پر درحقیقت وہ مالِ غنیمت جو لڑائی مین دشمنون سے ہاتھ آتا ہے، ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانون کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس مین پانچوان حصہ نظام جماعت کا حق ہے، یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہم یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آجائے، اس مین سے پانچوان حصہ خدا

اور رسول کا ہے، تاکہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف مین آئے، وہی ہے جس کی بنا پر، رکاز یعنی دفینہ مین، جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آجائے خمس (یعنی پانچوان حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے،

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے، اس مین سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے، توراۃ نے ہر قسم کی پیداوار پر عُشر یعنی دسوان حصہ مقرر کیا تھا، شریعتِ محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ، پیداوار کی مختلف قسمون پر مختلف شرحِ زکوٰۃ کی تفصیل کی، سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہین، تاکہ اُن سے حسب منشار خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جاسکے، اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اسی بنا پر سبزیون اور ترکاریون پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہین رہ سکتین، کوئی زکوٰۃ مقرر نہین فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس مین نشو ونما اور ترقی کی صلاحیت نہین مثلاً آلات، مکان، لباس، سامان، اسباب، سواری، قیمتی پتھران پر بھی زکوٰۃ نہین رکھی گئی، کچھ دنون تک باقی رہنے والی اور نشو ونما پانے والی چیزین چار ہین، زمین، جانور، سونا چاندی یا اُن کے سکے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چارون چیزون پر زکوٰۃ مقرر ہوئی،

زمین کی دو قسمین کی گئین، ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے، مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے مین کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہین ہوتا، بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی عُشر ($\frac{1}{10}$) مقرر کیا گیا، زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاص محنت اور مزدوری سے ہو، مثلاً کوئین سے پانی نکال کر، لانا، یا نہر بنا کر پانی لانا، تو اس مین قسم اوّل سے بھی نصف یعنی بیسوان حصہ ($\frac{1}{20}$) مقرر ہوا، نقدی سرمایہ جس کی ترقی، حفاظت، نشو ونما، اور افزایش مین انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اور جس کی افزایش

کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس مین ہر قدم پر چوری، گم شدگی لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسوان (۱/۴۰) حصہ مقرر ہوا[1]، (جانورون کا ذکر آگے آتا ہے)

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ مین شرحِ زکوٰۃ کی کمی و بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے انسان کی اصلی ضرورت جس پر اُسکا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکون کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہو جاتی ہے، اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہین، لیکن سونے چاندی کے مالکون اور تاجرون کی جو دولت ہے، وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام مین نہین آتی، بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہین، وہ کاشتکارون کی پیداوار کو خریدکر ان کو نقد روپیہ دیتے ہین، جس سے ان کی دوسری ضرورتین پوری ہوتی ہین، پھر وہ اس پیداوار کو لیکر گاؤن گاؤن، شہر شہر اور ملک بملک پھرتے ہین، اور اسکی بھی اجرت ادا کرتے ہین، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے مین صرف ہوتی ہے، اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول مین صرف کرنی پڑتی ہے، سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہین پیدا ہوتی ہے، اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل مین انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گران تر ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینون کے مالک عموماً دیہاتون مین رہتے اور شہرون سے دور ہوتے ہین، نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکون سے بھی محروم رہتے ہین، اس لئے نسبتہً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات، اور مستحقین کی امداد مین اس "انفاق" یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہین، جن کو عموماً نقد صورت مین دولت کے مالک، اور تاجر پورا کیا کرتے ہین، اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ اُن کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہلِ زمین سے مختلف رکھی جائے،

زکوٰۃ کی شرحِ مقدار کی تعیین مین اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ خُمس مین جونکہ

---

[1] یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد مین بیان کیا ہے،

امامت و حکومت کے تمام ذاتی و قومی مصارف شامل ہین، اس لئے وہ کل کا خمس یعنی $\frac{1}{5}$ مقرر ہوا، اور زکوٰة کے مصارف جیسا کہ سورۂ توبہ رکوع ۸ مین مذکور ہین، صرف آٹھ ہین، اس بنا پر آٹھ مصارف کی شرح مقدار $\frac{1}{5}$ کا $\frac{1}{8}$ حصہ (یعنی $\frac{1}{40}$) مقرر ہوا، یعنی سونا چاندی کی زکوٰة مین ان آٹھ مصرفون کے لئے مجموعی رقم چالیسوان حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے، ان دو سو درمون کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے تو ۴۰ ہو جائیگا، یہ کل زکوٰة کی شرحین $\frac{1}{5}$ و $\frac{1}{10}$ و $\frac{1}{20}$ و $\frac{1}{40}$ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہین، اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم و تحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے

جانورون پر زکوٰة توراة مین ہر قسم کے جانورون مین دسوان حصہ زکوٰة کا تھا، لیکن چونکہ ہر قسم کے جانورون مین نسل کی افزایش کی صلاحیت اور مدتِ افزایش (زمانۂ حمل) یکسان نہین ہوتی، نیز جانورون مین دسوین بیسوین کا حصہ شائع ہر تعداد پر چسپان نہین ہو سکتا، اس لئے ان مین دسوین بیسوین کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی، شریعتِ محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا، چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدایش اور افزایش کی مدت کیفیت اور کمیت) کی بنا پر اوّلاً بے نسل یا کم نسل کے جانورون کو زکوٰة سے مستثنیٰ کر دیا، مثلاً خچر، گھوڑے[1] (یا ہندوستان مین ہاتھی) پر کوئی زکوٰة نہین، دوسرے جانورون کی مالیت اور قوت و کیفیت افزایش کے لحاظ سے حسبِ ذیل شرح معین ہوئی، یہ وہ شرح نامہ ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمتِ ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا، اور زبانی نہین، بلکہ فرامین کی صورت مین لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا، اور خلفائے راشدین نے اسی کی نقلین حدودِ حکومت مین بھجوائین، اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے۔

نام جانور	تعداد	شرحِ زکوٰة
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہین،

[1] اجارہ ۲۷۔۔۔ حنفیہ کے نزدیک خیل متناسلہ اور تجارت کے گھوڑون مین زکوٰة ہے، سواری اور جہاد کے گھوڑون مین نہین

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	۵ سے ۹ تک	ایک بکری،
〃	۱۰ 〃 ۱۴ 〃	دو بکری،
〃	۱۵ 〃 ۱۹ 〃	تین بکریان،
〃	۲۰ 〃 ۲۴ 〃	چار بکریان،
〃	۲۵ 〃 ۳۵ 〃	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
〃	۳۶ 〃 ۴۵ 〃	اونٹ کا دو سالہ بچہ،
〃	۴۶ 〃 ۶۰ 〃	تین سال کا اونٹ کا بچہ
〃	۶۱ 〃 ۷۵ 〃	چار سال کا اونٹ،
〃	۷۶ 〃 ۹۰ 〃	دو سال کے دو بچے،
〃	۹۱ 〃 ۱۲۰ 〃	تین سال کے دو بچے،
〃	۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر	دو سال کا ایک بچہ،
〃	اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ،
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہین،
〃	۴۰ 〃 ۱۲۰ 〃	ایک بکری،
〃	۱۲۱ 〃 ۲۰۰ 〃	دو بکریان،
〃	۲۰۱ 〃 ۳۰۰ 〃	تین بکریان،
〃	پھر ہر سو پر	ایک ایک بکری،
گائے، بیل، بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہین،

نام جانور	تعداد	شرح زکوۃ
گائے، بیل، بھینس	۳۰	ایک، دو سالہ بچھڑا،
〃	۴۰	تین سال کا ایک،
〃	۶۰	دو سال کے دو بچھڑے،
〃	۷۰	ایک تین سال اور ایک دو سال کا،
〃	۸۰	تین سال کے دو،
〃	۹۰	〃 تین
〃	۱۰۰	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک
〃	پھر ہر دس مین	ایک دو سالہ،

نصاب مال کی تعیین شرح زکوٰۃ کے تعین کے سلسلہ مین شرائعِ سابقہ مین ایک اور کمی تھی جس کی تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے کر دی یعنی دوسری شریعتون مین قانونی خیرات کی تعیین ہے، اُن مین امیر و غریب اور کم اور زیادہ دولت والون کی تفریق نہین کی گئی تھی، مثلاً اگر دس بیس روپے والون، یا دس پانچ گائے اور بکری والون سے یہ زکوٰۃ وصول کیجاتی، تو ان پر ظلم ہوتا. توراۃ مین غلہ اور مویشی پر جو عُشر اور نقد پر جو آدھا مثقال مقرر کیا گیا ہے، اس مین اس کا لحاظ نہین کیا گیا ہے، بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ مین تو یہان تک کہہ دیا گیا ہے کہ

"خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب

کم نہ دے" (خروج ۳۰-۱۵)

لیکن شریعتِ محمدی نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا، اور غریبون، ناداروں، مقروضون، اور اُن غلامون کو جو سرمایہ نہین رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہین، اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت

کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہین کی، اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا۔ سونے کی زکوٰۃ کو وہی آدھا مثقال رکھا لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائیگا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مثقال[1] سونے کا مالک ہو، اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درم چاندی کے سکّے ہین، یعنی ایک اوقیہ چالیس[2] درہم کے برابر ہے، وہ کم سے کم معیار دولت جس پر زکوٰۃ نہین حسب ذیل ہے،

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہین،
غلہ اور پھل	پانچ وسق[3] سے کم پر زکوٰۃ نہین،
اونٹ	پانچ عدد 〃 〃 〃
گائے، بیل، بھینس،	۳۰ عدد 〃 〃 〃
بھیڑ، بکری،	۴۰ عدد 〃 〃 〃
سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہین
چاندی	۲۰۰ درم سے کم پر زکوٰۃ نہین،

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحون مین جو کیسان زکوٰۃ کی ناہمواری تھی وہ دور ہوگئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہوگئے،

ان مذکورۂ بالا اشیار کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف ہے، مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہین، پانچ وسق غلہ، دو سو درم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا درحقیقت ایک ہی معیار ہے، ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درم کے برابر ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دو سو درم برابر ہین،

[1] موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا سات تولہ کے، اور دو سو درم چاندی ۵۲ روپیے کے برابر ہے،
[2] سنن ابی داؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الزکوٰۃ وحد الغنی جلد اول ص ۱۶۴ اصح المطابع لکھنو،
[3] ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادۃً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو،

اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ مین چالیس درہم، یا ۴ مثقال تھی، یعنی پانچ اوقیہ، اور پانچ وسق کی قیمت وہی دو سو درہم یا ۲۰ مثقال ہوگی،

زکوۃ کے مصارف اور ان مین اصلاحات

حضرت موسیٰؑ کی شریعت مین تین قسم کی زکوۃ تھی، ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے طلائی و نقرئی ظروف و سامان کے بنانے مین خرچ کیجاتی تھی (خروج ۳۰-۱۲) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جابجا کونون اور گوشون مین کچھ ڈالنے اور پھل چھوڑ دیئے جائین، وہ غریبون اور مسافرون کا حصہ تھا، (احبار ۱۹-۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانورون کا دسوان حصہ خدا کے نام نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل و عیال کے بیت المقدس جاکر جشن منائے اور کھائے اور کھلائے، اور لاویون مین جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمتگذار ہین، نام بنام تقسیم کیا جائے (اس کے بدلے مین وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے)، اس کے بعد یہ چیزین بیت المقدس کے خزانہ مین جمع کردیجاتی تھین کہ ان سے مسافرون، یتیمون، اور بیواؤن کو کھانا کھلایا جائے، (استثناء ۱۴: ۲۶ سے ۲۹ تک)

شریعتِ محمدیہ نے مذہب کی حقیقت مین سب سے بڑی جو اصلاح کی،

۱- وہ عبادت مین خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطون کا حذف کرنا تھا، یہان ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے، اس بنا پر مفت خور کاہنون اور عبادت گاہون کے خادمون کی ضرورت ساقط ہوگئی اور اس لئے زکوۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا، کلیۃً اڑ گیا،

۲- عبادت مین سادگی پیدا کرکے ظاہری رسمون اور نمایشون سے اس کو پاک کر دیا گیا، اس لئے سونے چاندی کے سامانون، قربانی کے برتنون، اور محرابون کے طلائی شمعدانون کی ضرورت ہی نہین رہی،

---

[1] ہدایہ جلد اول، باب الزکوۃ فی التجارۃ،

۳۔ حج اُن ہی پر واجب کیا گیا جن کے پاس زاد راہ ہو، اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی، اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہو گئی،

۴۔ زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے مین صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات مین خرچ ہو گئی تو اس مین ایثار کیا ہوا،

۵۔ اس طرح وہ تمام سامان اور رقمین جوان مدون سے بچین، غریبون، مسکینون، اور مسافرون وغیرہ کو دے دی گئین،

گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ مین بعض اور اصلاحین بھی کی ہین، مثلاً

۶۔ شریعتِ سابقہ مین ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہین کیجاتی تھی، بلکہ ذخیرہ مین جمع ہو کر، اس کا کھانا پکا کر غربا مین تقسیم ہوتا تھا، لیکن عام انسانی ضرورتین صرف کھانے تک محدود نہین ہین، اس لئے شریعتِ محمدیہ نے اس رسم مین یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دیجائے تاکہ وہ جس طرح چاہین اپنی ضروریات مین صرف کرین،

۷۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی، شریعتِ محمدیہ نے بیس مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کر کے اس کو بھی تمامتر مستحقین کے ہاتھون مین دیدیا،

۸۔ غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا، اور وہین سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا، یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزون ہو سکتا ، مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم مین منتشر پیرؤون کے لئے یہ بالکل ناکافی تھا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اوسی تمام کے مستحقین مین صرف کیجائے،

۹۔ بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤن کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے

جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے، اور جب نہ ملتی تو طعن و طنز کرنے لگتے، اسلام نے ایسے لوگون کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادتِ بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کر دی، اور بتا دیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہین، اور اس رقم سے کس کس کو مدد دیجا سکتی ہے، چنانچہ سورۂ توبہ کے ساتوین رکوع مین اسکا مفصل ذکر ہے،

۱۰- اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کیجاتی، اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتا دیئے جاتے، تو یہ تمام سرمایہ خلفاء اور سلاطین کے ہاتھون مین کھلونا بنجاتا، اور سلطنت کی دوسری آمدنیون کی طرح یہ بھی انکے عیش و عشرت کے پر تکلف سامانون کے نذر ہوجاتا، اس لئے تاکید کر دیگئی، کہ جو غیر مستحق اس کو لیگا، اس کیلئے یہ حرام ہے، اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دیگا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانون مین زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف مین خرچ ہوتی ہے،

۱۱- اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیرون پر عائد کرتا ہے، تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہوسکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے، حضرت موسیٰ کی شریعت مین زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارون اور ان کی اولاد (بنولادی) کو ٹھہرایا گیا تھا، کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی بدگمانیون کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعی طور پر حرام قرار دی،

۱۲- قرآن مجید مین زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ	زکوٰۃ کا مال تو غریبون، مسکینون، اور زکوٰۃ کے
وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي	صیغہ مین کام کرنے والون، اور ان لوگون کیلئے
الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ	ہے جن کے دلون کو اسلام کی طرف ملانا ہے،
وَابْنِ السَّبِيلِ، فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ	اور گردنون چھڑانے مین جو تاوان بھرین ان مین

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ،	اور خدا کی راہ میں، اور مسافر کے بارہ میں، یہ خدا کی
	طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے، اور خدا جاننے والا اور حکمت
(توبہ ۔ ۸)	والا ہے (اس لئے اس کی یہ تقسیم علم و حکمت پر مبنی ہے)

فقرا میں ان خوددار اور مستور الحال شرفا کو ترجیح دی ہے جو دین، اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجتمند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے، اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا،

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	ان مفلسوں کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک رہے
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ	ہیں اور زمین میں (روزی حاصل کرنے کے لئے)
الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ	چل پھر نہیں سکتے، ناواقف ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے
بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا	اُن کو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرہ سے
(بقرہ ۔ ۳۷)	پہچانتے ہو، کہ وہ حاجتمند ہیں، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ اُن کی اہمیت، اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہئے، چنانچہ اسی سورہ میں فرمایا،

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى	اور جس نے خدا کی محبت پر (یا مال کی محبت کے
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	باوجود) قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں،
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ	مانگنے والوں، اور غلاموں یا مقروضوں کی گردن
(بقرہ ۔ ۲۲)	چھڑانے میں مال دیا،

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے،

قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ (بقرہ ۔ ۲۶)	کہو جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے ماں باپ، رشتہ داروں،
الْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ	یتیموں، مسکینوں، اور مسافر کے لئے،

۵۔ ضرورتمندون مین ترجیح

اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابتمندون اور رشتہ دارون کے دینے سے، اجنبی بیگانہ اور بے تعلق لوگون کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے، اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی، کہ اپنے لوگون کے دینے مین کچھ نہ کچھ نفسانیت کا، اور ایک حیثیت سے خودغرضی کا شائبہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہین، اور ان کا نفع و نقصان اپنا ہی نفع و نقصان ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا، ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہین وہ تمامتر تعلقات کی کمی و بیشی پر مبنی ہین جو جتنا قریب ہے، اتنا ہی زیادہ آپکے حقوق اُس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہین، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابتمندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہوجائین، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے، پھر اہل و عیال کا، اون کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال مین کچھ بچ رہے، تو اس مین حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابتدار ہین، چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم مین اسی اصول کی رعایت کیگئی ہے،

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت دارون کو ترجیح دیجائے، تو دوسرے غریبون کا حق کون ادا کرے گا، ایک قسم کا مغالطہ ہے، دنیا مین ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ دارون کی خبرگیری کرے تو کل انسانون کی خبرگیری ہوجائیگی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور ہوجانا چاہیے، مستحقین مین باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے، اس کا مدار دو چیزون پر ہے، ایک تو دینے والون سے ان اشخاص کے قرب و بعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کی حاجتون اور ضرورتون کی کمی و بیشی، قرابتمندون کی ترجیح کے یہ معنی نہین ہین کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو ان کو اُن لوگون پر ترجیح ہے جن کی ضرورت، اور حاجتمندی ان سے کہین زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر دو ضرورتمند برابر کے حاجتمند ہون اور ان مین سے ایک آپکا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا، یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی و بیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی، نہ کہ پہلا سبب؟ اور یہ انسان کی فطرت ہے، کہ ایسی حالت مین وہ اپنے عزیزون

اور دوستون کو ترجیح دے،

فقراء اور مساکین مین سے ان لوگون پر جو بے حیائی کے ساتھ دربدر بھیک مانگتے پھرتے ہین، ان کو ترجیح دی گئی ہے جو فقر وفاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہین، لیکن اپنی عزت وآبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہین جانے دیتے، اور لوگون کے سامنے ہاتھ نہین پھیلاتے ہین، یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا "مسکین وہ نہین ہے جس کو ایک دو لقمے دربدر پھرایا کرتے ہین" صحابہؓ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے؟ ارشاد ہوا "وہ جس کو حاجت ہے، لیکن اس کا پتہ نہین چلتا، اور وہ کسی سے مانگتا نہین"[1]

اس تعلیم کے دو مقصد ہین، ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والون کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دیگا، اور وہ کہین نہ کہین سے پا ہی جائین گے، اس لیئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہین، اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینون کی طرف ہونی چاہیئے، جو صبر وقناعت کے ساتھ فقر وفاقہ کی تکلیف برداشت کرتے ہین، کہ ان کی خبر بہتون کو نہین ہو سکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہجاتے ہین، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کردے، کہ بے حیا گداگرون کی عزت اس کی نگاہ مین نہایت کم ہے، اور وہ ہر حال مین اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے،

شریعت نے مصارفِ زکوٰۃ کی تعیین وتحدید اس غرض سے بھی کی ہے، تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو، اور ہر کس وناکس اُس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے، جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان واسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا، چنانچہ وحی الٰہی نے ان کی پردہ دری، ان الفاظ مین کی،

وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ — اور بعضے ان مین سے ایسے ہین جو تجھ کو (پیغمبر کو)

فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطَوْا — زکوٰۃ بانٹنے مین طعن دیتے ہین، اگر ان کو اس مین سے

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب المسکین الذی لا یجد غنی ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ،

مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ، وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا
مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ
سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ
إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ . إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ
لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ
وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً
مِنَ اللَّهِ ۔

(توبہ ۔ ۷ و ۸)

ملے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائیں، اور کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی رہتے. جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے کہ ہم کو اللہ بس ہے. ان کو اللہ اپنی مہربانی سے اور اس کا رسول دے رہیں گے، ہم کو تو خدا ہی چاہیے، زکوۃ تو حق ہے غریبوں کا، مسکینوں کا، اور اس کا کام کرنے والوں کا، اور ان کا جنکا دل (اسلام کی طرف) پرچانا ہے، اور گردن چھڑانے میں، اور خدا کی راہ میں، اور مسافر میں یہ حصے خدا کیطرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں،

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی، آپ نے فرمایا۔ اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مال زکوۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے، بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں، اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں[1]۔

اسلام میں زکوۃ کے مصارف ہشتگانہ:

یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں فقراء اور مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے. جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لولے، لنگڑے، مفلوج، کوڑھی، یا وہ محنت کر سکتے ہیں، لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں، کہ وہ

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوۃ، باب من یعطی الصدقۃ وحد الغنی،

اپنی روزی کمانے کی فرصت نہین پاتے جیسے مبلغین، مذہبی معلمین، بالغ طالب العلم، جو لِلْفُقَرَاۗءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ مین اسی طرح داخل ہین جسطرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک مین اصحاب صفہ داخل تھے، اور وہ کم نصیب بھی داخل ہین جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہین اور فاقہ کرتے ہین، وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس مین سے اپنے کام کی اُجرت پا سکتے ہین، اور وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ (جن کی تالیف قلوب کیجائے) مین وہ لوگ داخل ہین، جنکو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے، یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے، وَفِي الرِّقَابِ (گردن کے چھڑانے مین) اس سے مقصود وہ غلام ہین جن کی گردنین دوسرون کے قبضہ مین ہین اور اُن کو خرید کر آزاد کرنا ہے، اور وہ مقروض ہین، جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہین کرسکتے، وَالْغٰرِمِيْنَ (تاوان اٹھانے والون) سے مراد وہ نیک لوگ ہین جنھون نے دوسرے لوگون اور قبیلون مین مصالحت کرانے کیلئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کیجا سکتی ہے، وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (خدا کی راہ مین) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کامون کو شامل ہے[1]، اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی، یا سفر حج، یا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جا سکتے ہین، اور وَابْنِ السَّبِيْلِ (مسافر مین) مین مسافرون کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافرون کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستون کی درستی، پلون اور مسافر خانون کی تعمیر بھی داخل ہوسکتی ہے[2]، یہ ہین زکوٰۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن مین اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم

---

[1] اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے، مگر یہ تحدید صحیح نہین معلوم ہوتی، ابھی آیت گذر چکی لِلْفُقَرَاۗءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہان فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہین، بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے، مگر ان کا استدلال جو لِلْفُقَرَاۗءِ کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے، ہوسکتا ہے کہ لام انتفاع ہو، جیسے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا، [2] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، باب الصدقات،

رقم کو خرچ کرنے کی تاکید ہے،

سکینون، فقیرون اور معذورون کی امداد

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگون کی امداد کیجائے، نادار تیمون، بیواؤن اور ان لوگون کی خبرگیری کیجائے جو اپنی کوشش اور جد و جہد کے باوجود روزی کا سامان نہین کر پاتے، یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریبًا ہر قوم مین اور ہر مذہب مین ضروری خیال کیا گیا ہے، اور ان مستحقین کی یہ قابلِ افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہین، لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کئے ہین جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے،

غلامی کا انسداد

غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلامون کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، ان کے ساتھ نیکی، احسان اور حسنِ سلوک کی تاکید کی، اور ان سب سے بڑھکر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا کہ اس سے غلامون کو خرید کر آزاد کیا جائے، لیکن چونکہ غلامون کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زرفدیہ ہر ایک شخص برداشت نہین کر سکتا تھا، اس لئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی، انسانون کے اس درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست مین نظر نہین آسکتی، پیغمبر اسلام علیہ السلام کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانون کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرادی، کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے، جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائین، یا اس رسم کا دنیا کی تمام قومون سے خاتمہ نہ ہو جائے،

مسافر

گذشتہ زمانہ مین سفر کی مشکلات اور دقتون کو پیش نظر رکھ کر یہ بآسانی سمجھ مین آسکتا ہے کہ مسافرون کی امداد اور ان کے لئے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی، صحرا اور بیابان، جنگل اور

میدان، آبادی اور ویرانی، ہر جگہ آنے جانے والون کا تانتا لگا رہتا تھا، اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہین جو اپنے اہل وعیال، عزیز وقریب، دوست واحباب، مال و دولت سے الگ ہوکر اتفاقات اور حوادث کے سیلاب سے بہکر کہان سے کہان نکلجاتے ہین اُنکے پاس کھانے کیلئے کھانا، پینے کیلئے پانی سونے کیلئے بستر اوڑھنے کیلئے چادر نہین ہوتی اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آجاتی ہے۔ اس لئے ضرورت تھی، کہ اُن کے آرام وآسایش کا سامان کیا جائے، اسی اصول پر سرائین، کنوین، مسافرخانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے اور اب بھی بنوائے جاتے ہین،

آپ کہہ سکتے ہین کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد مین یہ تمام تخیلین افسانۂ کہن اور داستان پارینہ ہوگئی ہین، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریان، بڑے سے بڑے بینک، اور آمد ورفت کا سامان کرنے والی کمپنیان قائم ہوگئی ہین، اور سفر وحضر مین کوئی فرق نہین رہا ہے، مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولتمندون اور سرمایہ دارون کی راحت وآسایش کے لیے ہوا ہے اور ان کے ان نئے طریقون نے پرانے طریقون کے پرانے آثار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے، آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پررونق شہرون سے لے کر معمولی دیہاتون تک مین جہان امیر اور دولتمند مسافرون کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریسٹران، قہوہ خانے اور آرام خانے موجود ہین، وہان اس پورے مسیحی ملک مین حضرت مسیحؑ کی طرح ایک غریب مسافر کے لئے کہین سر رکھنے کی جگہ نہین، کسی کی جیب مین جب تک کسی بنک کا نوٹ اور چک نہین اس کے لئے ہوٹلون اور اقامت خانون کے تمام دروازے بند ہین، کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟ کیا یہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکون کے طول وعرض مین جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامون کے قبضہ مین آئے، سراؤن، مسافر خانون، کنوؤن، اور مہمان خانون کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہوگیا کہ ایک غریب مسلمان اسپین کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤن مین بہ آرام وآسایش پہنچ جاتا تھا، اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے

تک اهلاً باهلٍ واوطاناً باوطانٍ کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا، اور آج بھی اس نظام کی بدولت اُن اسلامی ملکون مین جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور و طریق سے واقف نہین ہین، غریب مسافرون کو وہی آرام و آسایش حاصل ہے، اور امرا، اور دولتمندون کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہان گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق،

منعم بکوہ و دشت و بیابان غریب نیست ۔ ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

جماعتی کامون کے اخراجات کی صورت

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ مین نہین بندہ جاتے حقیقت مین جماعت کا وجود نہین ہوتا، لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہین، جماعت کے کمزورون، معذورون، اور مفلسون کی مدد، جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت مین اس کے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمد و رفت اور سفر کے وسائل کی ترقی و تعمیر، جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والون، اور مقروضون کی امداد کرنا، جماعت کے ان کارکنون کو معاوضہ دینا، جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی خدمات بجالائین، اور اس رقم کی فراہمی اور نظم و نسق کے فرائض انجام دین، زکوٰۃ اسی نظام جماعت کا سرمایۂ دولت ہے،

زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات

زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ "زکوٰۃ" کے اندر ہے،" زکوٰۃ" کے لفظی معنی "پاکی" اور "صفائی" کے ہین، یعنی گناہ اور دوسری روحانی، قلبی اور اخلاقی برائیون سے پاک و صاف ہونا، قرآن پاک مین یہ لفظ اسی معنی مین بار بار آیا ہے، سورۂ والشمس مین ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا، (شمس-۱) — مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف کیا اور نامراد ہوا، وہ جس نے اسکو میلا اور گندہ کیا،

ایک اور سورہ مین ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی، (اعلیٰ-۱) — مراد پایا وہ جو پاک و صاف ہوا،

یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کے اُن تین عظیم الشان خصوصیتون مین سے ایک ہے جنکا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتون مین آیا ہے،

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (بقرہ ع ۱۵)

وہ نبی خدا کی آیتین پڑھ کران کو سناتا ہے، اور اُن کو گناہون سے پاک وصاف کرتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی باتین سکھاتا ہے،

تزکیۂ نفس

ان آیتون سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی وصفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدی مین کتنی ہے ؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتون کا اصل مقصد ہے، انسانون کی روحانی ونفسانی بیماریون کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف ورجا اور تعلق ومحبت کا نہ ہونا ہے، اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے، لیکن دوسرا بڑا سبب، ماسوی اللہ کی محبت، اور مال ودولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے، زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے، غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہؓ سے باغ وبستان کی محبت کے سبب سے جو ان کی دولت تھی، غزوۂ مین عدم شرکت کا جرم صادر ہوا ہے، اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے، وہان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے قرآن پاک مین ارشاد ہے،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (توبہ - ۱۳)

ان کے مالون مین سے زکوٰۃ لے کر ان کو پاک وصاف بنا،

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال مین سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ مین دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبتِ مال ہے دل سے دور ہو جاتا ہے، بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے، مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے، دوسرون کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے، شخصی خود غرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے، اور یہی وہ دیوارین

ہین جنپر تہذیبِ نفس اور حسنِ خلق کی عمارت قائم، اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے،

قرآن مجید مین سود اور صدقہ مین جو حدِ فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے،

یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰو وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ، (بقرہ-۳۸) خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے،

لیکن اس کا یہ مطلب نہین کہ درحقیقت سود مین نقصان اور صدقہ کے مال مین اضافہ ہوتا ہے کیونکہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے، بلکہ اُخروی ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت مین اضافہ کرتا ہے، لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے، جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے، اور قومی صدقہ و عطا سے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے، اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے، اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ مین پڑ جاتا ہے، تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک اُنگلی تک نہین ہلاتی، لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لیے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے،

ایک اور بات یہ ہے کہ سود خوار اس قدر حریص اور طماع ہو جاتے ہین کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے، اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہین وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہین کہ اُن کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے، سود خوار اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص مین اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسرون کو قتل کرکے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے، آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کرکے اس کے تمام اصل و منافع پر بیک دفعہ قبضہ کر لیتا ہے، لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسرون کی دولت ناجائز طریق سے نہین لوٹتا، بلکہ خود دوسرون کو اپنے مال سے دیتا ہے، اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا بھی نہین لوٹتا، وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے، دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہرون کی منڈیان اور کوٹھیان اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویر ہین، اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے، پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے جو تمام

اخلاقی محاسن کا سنگِ بنیاد ہے، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے، یہ ارشاد فرمایا کہ لیس الغنیٰ من کثرۃ العرض ولکن الغنیٰ غنی النفس[1]۔ تونگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ دل کی بے نیازی کا نام ہے، اسی حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں مین کیا ہے "تونگری بدل ست نہ بمال" دوسرے لفظون مین یون کہو، کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہین، بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہین، بلکہ صبر و قناعت کے بدولت حاصل ہوئی ہے، اس بنا پر کیا کسی کو زکوٰۃ و صدقہ کے مطہر، مزکی، اور مصلح اخلاق ہونے مین شبہہ ہوسکتا ہے؟

سود خوار کو دوسرون کے لوٹنے سے اتنی فرصت کہان ملتی ہے، کہ وہ دوسرون کی مدد کا فرض ادا کرے، وہ تو ہمیشہ اس تاک مین رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتون اور دقتون مین پھنسین، اور وہ اُن کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے، لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہین، وہ ہمیشہ قابلِ ہمدردی اشخاص کی ٹوہ مین لگے رہتے ہین تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے انکی مدد کرکے اُس کے زخمِ دل پر مرہم رکھ سکین،

باہمی اعانت کی عملی تدبیر زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبون اور حاجتمندون کی امداد ہے، انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے، جس کے ساتھ تمام مذہبون نے ہمدردی کی ہے، اور اس کی تسلی اور تسکین کیلئے دوسری دنیا کی توقع اور اُمید کے بڑے بڑے خوش آیند الفاظ استعمال کئے ہین، لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہلِ مذاہب کی شیرین کلامی سے دور نہین ہوسکتی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے پہلے، اور وہی پچھلے پیغمبر ہین جنھون نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور اس کی تکلیفون اور مصیبتون کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی، خود اپنی زندگی غریبون اور مسکینون کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ "خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا، اور مسکینون ہی کے زمرہ مین میرا حشر کر" آپ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غریبون اور مسکینون کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزمِ قدس

[1] بخاری کتاب الرقاق باب الغنیٰ غنی النفس۔

کے مقرب درباری، اور اسلام کے معرکون کے مخلص جانباز تھے، آپ کی نظر مین کسی انسان کی غربت اور تنگدستی اس کی ذات اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی، نہ دولت و امارت عزت و وقار کے مرادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری نفضیلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی، حضرت مسیح نے فرمایا کہ مبارک ہین وہ جو دل کے غریب ہین، کیونکہ آسمان کی بادشاہت انھین کی ہے[1]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ اختصار و ایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا،

اِن المکثرین ھم المقلون[2]، جو دولتمند ہین وہی غریب ہین،

اس کے دوسرے معنی یہ ہوے کہ جو غریب ہین وہی دولت مند ہونگے،

پھر انھین خوشخبری دی کہ غریب (جنکو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہین دینا ہے) دولت والون سے ۴۰ سال پہلے جنت مین داخل ہونگے[3]،

اسلام نے ان روحانی تسلیون اور بشارتون کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی تکلیفون اور مصیبتون کو کم کرنے کی عملی تدبیرین ہین، جنکا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے، اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب و تشویق تک محدود نہین رکھا، بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیرین اختیار کین، ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے، یہ اخلاقی خیرات ہے، جس کا نام قرآن کی اصطلاح مین "انفاق" ہے لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہین کرتی اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا جس کا سالانہ ادا کرنا اسکا مذہبی فرض ہے، اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبون اور محتاجون کی امداد و اعانت کے لئے مخصوص کیا، اور رسول اللہ صلعم نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابل تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لئے سپرد فرمایا، چنانچہ آپ نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا، تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے

---

[1] متی ۵، ۳ [2] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکثرون ہم المقلون، [3] جامع ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء ان فقراء المہاجرین یدخلون الجنۃ قبل اغنیاءہم

پھراس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ

توخذ من اغنیاءھم وترد علیٰ فقرائھم[1] | وہ ان کے دولتمندون سے لیکران کے غریبون کو لوٹا دیا جائے،

صحابہؓ نے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونون قسمون کی خیراتون پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے، وہ بازار جاکر مزدوری کرتے تھے، تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب و معذور بھائیون کی اخلاقی اعانت مین خرچ کرین، اوراس معاملہ مین خود آپ نے یہان تک اس طبقہ کی دلجوئی کی کہ فرمایا" اگرکسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے بات ہی کرنا اس کا صدقہ ہے" اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو، خدا نے تعلیم دی،

فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡهَرۡ، وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ، (ضحیٰ-۱) | تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مانگنے والے کو جھڑک،

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجتمند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو، کہ وہ شرمندہ ہو، بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اسکی توفیق عنایت کی، احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائیگا، فرمایا،

لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِكُمۡ بِالۡمَنِّ وَالۡاَذٰى (بقرہ-۳۶) | تم اپنی خیرات کو احسان دھرکر یا طعنہ دے کر برباد نہ کرو،

اس لطف، اس مدارات، اوراس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی، اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے

---

[1] صحیح بخاری، جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیہ،

کی مدد کا سبق پڑھایا، اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا، یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا عام حکم دے دیا جاتا، تو کبھی اس پر اس خوبی، اس نظام، اور اس پابندی کیساتھ عمل نہ ہو سکتا، اور آج بھی مسلمانون کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے، اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمانون مین اگر امیر کم ہین تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہین، جیسے دوسری قومون مین نظر آتے ہین، تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانون کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت مین ہے، اور اسکی تنظیم کی طرف سے غفلت برتی جارہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے،

دولتمندی کی بیماریون کا علاج

دولتمندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب مین ایک معرکۃ الآرا بحث کی حیثیت سے چلا آرہا تھا، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذہب ہین جنمین نہ تو دولتمندی کی کوئی تحقیر کیگئی، اور نہ مفلسی و غربت کو سراہا گیا ہے، بلکہ گویا اس بحث کو نامنفصل چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن عیسائیت اور بودھ مت، دو ایسے مذہب ہین جنمین دولت کی پوری تحقیر کیگئی ہے، عیسائیت کی نظر مین دولتمندی اور تمول، نجات کی راہ کا کانٹا ہے، بلکہ کوئی انسان اُس وقت تک نجات نہین پا سکتا جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ مین لٹا نہ دے، انجیل مین ہے کہ ایک نیکوکار دولتمند نے حضرت عیسیٰؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب مین فرمایا،

"اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال، اور محتاجون کو دے
کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملیگا، تب آ کے میرے پیچھے ہولے"

وہ دولتمند یہ تعلیم سُن کر غمگین ہو کر چلا گیا، تب انجیل مین ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا،

"مین تم سے سچ کہتا ہون کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت مین داخل ہونا مشکل ہے،
بلکہ مین تم سے کہتا ہون کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا اس سے آسان ہے،
کہ دولتمند خدا کی بادشاہت مین داخل ہو" (متی ۱۹-۲۱-۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگون کو ترکِ دنیا کی تلقین کی ہے، اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے، اور ایسے لوگون کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہون تو بھیک کا پیالہ لیکر لوگون کے دروازون پر کھڑے ہو جائین، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، ان دونون طریقون کو ناپسند فرمایا، اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اُس برائی کو دوسرون کی طرف منتقل کر دینا، ان کی خیر خواہی نہ ہوئی دشمنی ہوئی، اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسرون کو دیکر خود اسی حال مین پہنچانا کہان کی دانشمندی اور اصلاح ہے، اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکسان مفید نہین ہے، نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے، جس طرح دولتمندی دنیا مین ہزارون سیہ کاریون کی محرک ہے اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزارون جرائم کا باعث ہے، اور ان دونون خرابیون سے انسانون کا بچانا ایک نبوتِ عظمیٰ کا فرض تھا، دولت بہ حیثیت دولت، اور غربت بہ حیثیت غربت نیک و بد اور خیر و شر دونون صفتون سے پاک ہے، بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولتمند ایک نیکوکار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ مین خدا کی ایک نعمت ہے لعنت نہین، ہنر ہے، عیب نہین، خیر ہے، شر نہین، چنانچہ قرآن پاک مین متعدد موقعون پر دولت کو "خیر" اور "فضل" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے،

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ مین دے دین، آپ نے فرمایا کہ "تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے، کہ وہ لوگون کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرین" آپ کے حلقہ بگوشون مین دولتمند بھی تھے، اور غریب بھی، اور دونون آپ کے دربار مین برابر کی حیثیت رکھتے تھے، ایک دفعہ غریبون نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے دولتمند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہین، ہم جو نیکی کے کام کرتے ہین وہ وہ بھی کرتے ہین اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے

لہ بخاری کتاب الوصایا باب ان یترک ورثتہ اغنیاء خیر من ان یتکففوا الناس،

ہین، جو ہم نہین کر پاتے، آپ نے ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو، دولتمند صحابیون نے یہ سنا تو وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے، غریبون نے پھر جاکر عرض کی تو آپ نے فرمایا" یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے[1]۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا مین ہمیشہ سے غیر منفصل اور نا طے شدہ چلا آرہا تھا، اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کر دیا، ایک دفعہ آپ نے تقریر مین فرمایا کہ "لوگو! مجھے تمھاری نسبت جو ڈر ہے، وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے" صحابہ نے پوچھا "یا رسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے؟" فرمایا" دنیا کا باغ و بہار (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟ سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے وہ فتنہ کیونکر ہو سکتی ہے آپ نے سوال سنکر ذرا تامل کیا، پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھے، پھر فرمایا" بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے، لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے، جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو جب بعض جانور حرص و طمع مین آکر حد اعتدال سے زیادہ کھالیتے ہین تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہوجاتی ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے، جب اسکا پیٹ بھر جاتا ہے، تو وہ دھوپ کے سامنے ہوجاتا ہے، اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے، فضلہ باہر پھینکدیتا ہے، اور پھر چرنے لگتا ہے دولت ایک خوشگوار چیز ہے، تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کیلئے بہترین مددگار ہے، لیکن جو شخص اسکو صحیح طریقہ سے حاصل نہین کرتا، اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے، اور سیر نہین ہوتا[2]۔"

اس تقریر مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرمادیا اور بتادیا کہ نفس دولت خیر و شر نہین ہے، بلکہ اس کا درست و نادرست طریقۂ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے، اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کیجائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کیجائے تو وہ نیکیون اور بھلائیون کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اور اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہین، تو وہ بری اور شر انگیز ہے، اخلاقی محاسن و معائب، امیر و غریب

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ و کتاب الزہد والرقاق باب ما یحذر من زہرۃ الدنیا

دونون کے لئے یکسان ہین، ایک سخی وفیاض ومتواضع امیر اور ایک قناعت پسند اور صابر وشاکر غریب اسلام کی نظر مین فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہین، اسی طرح ایک متکبر بخیل امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہین، اس لئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امراء اور دولتمندون کے اخلاق کی اصلاح کیجائے اور دوسری طرف غریبون اور فقیرون کی امداد اور دستگیری کے ساتھ ان کے اخلاق وعادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام مین زکوٰۃ اسی عظیم الشان دوطرفہ اصلاح کا نام ہے،

اس سلسلہ مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سب سے پہلے حصولِ دولت کے ناجائز طریقون، دھوکا فریب، خیانت، لوٹ مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی، سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہین کی، اور اس کے سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبون کے لوٹنے کے سب سے عام طریقہ "سود" کو حرام مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا، جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و سیراب کرے، اسی کی ملک قرار دی، چنانچہ فرمایا "زمین خدا کی ہے، اور سب بندے خدا کے بندے ہین جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے" (طیالسی صفحہ ۲۰۴) متروکہ جائداد کا مالک کسی ایک کو نہین بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزون کو اس کا حصہ دار بنا دیا، ممالکِ مفتوحہ کو امیرِ اسلام کی شخصی ملکیت نہین، بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا، فطرت کی ان بخششون کو جو انسانی محنت کی ممنون نہین جیسے پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف مین دیا، اور بن لڑائی کے دشمنون سے حاصل کی ہوئی زمینون کو امراء اور دولتمندون کے بجائے خاص غریبون اور بیکسون کا حق قرار دیا، اور اسکی وجہ بھی ظاہر کردی،

مَآ اَفَاۤءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى	بستیون والون کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو
فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	ہاتھ لگادے وہ خدا اور اس کے رسول اور رشتہ دارون
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ	اور تیمون اور غریبون اور مسافرون کا حق ہے تاکہ وہ الٹ
بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ، (حشر-۱)	پھر کر تم مین سے دولتمندون ہی کے لینے دینے مین نہ رہجائے،

اس کے بعد اس سلسلہ مین دولتمندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا مین انسانیت کا بدترین نظہر اور آخرت مین بڑی سی بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا، اور جو اس گناہ سے پاک ہو اسی کو کامیابی کی بشارت دی. فرمایا،

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، (حشر-۱)	اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی لوگ ہین مراد پانے والے،

بخل کا مبتلا دوسرون کے ساتھ بخل نہین کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اسکی بدولت اس دنیا مین اپنے آپ کو ہردلعزیزی اور نیکنامی بلکہ جائز آرام وراحت تک سے اور آخرت مین ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا،

وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ، (محمد-۴)	اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے، اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو،

اس آیت پاک مین درپردہ یہ بھی واضح کردیا، کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو وہ درحقیقت تمھاری نہین، اصل مالک خدا ہے، اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اسکو اپنی ملکیت مین سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے، خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے، اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے، دنیا کی تمام برائیون اور بدیون کی جڑ ہے، اس آیت پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھودتی اور بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے،

پھر دولت کے ان مجازی مالکون اور امینون کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت مین اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا،

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ، (تکاثر-۱)	پھر اس دن تم سے تمھاری نعمت کا حساب پوچھا جائیگا

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے، کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں، ان لوگوں کو جو اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں تنبیہ کی،

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ الَّذِي جَمَعَ مَالًا — برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا، اور عیب چنتا ہو، جو

وَّعَدَّدَهٗ ۙ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ — مال کو سمیٹ کر رکھتا ہو، اور اس کو گن گن کر، وہ خیال

كَلَّا (ہمزہ-۱) — کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ سدا رہیگا ہرگز نہیں

فرمایا رشک کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے، ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے، اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے، اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے، اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے[1]، جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہوں اور کار خیر میں خرچ نہ کرتے ہوں، ان کو خطاب کیا،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ — وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں، اور

وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ — اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اُن کو

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ، — دردناک عذاب کی بشارت دیدو،

(توبہ-۵)

اس آیتِ پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیئے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہئے، کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہئے ورنہ جو شخص ایسا نہ کریگا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا، دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے، (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں، لیکن اہل راز صحابہ اور علماء امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھولدی، حضرت موسیٰؑ کی توراۃ میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی

[1] بخاری کتاب العلم باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ،

خیرات کی کوئی تعلیم نہیں، اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے، یہ دونوں تعلیمیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے، اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی تخیل ہے مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے، اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے، اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے، اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کردیئے، ایک قانونی، اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی یعنی نصف مثقال نقدین اور عُشر پیداوار میں، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے، جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع، اور صاحبِ نصاب پر واجب ہے، اور اسکا وصول اور خرچ کرنا، جماعت کا فرض ہے، اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے، اس کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا، اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی، صحابہؓ میں دونوں قسم کے لوگ تھے، وہ بھی تھے جو کل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے، جیسے حضرت ابوذرؓ، اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں پر لاکر ڈال دیتے تھے، جیسے حضرت ابوبکرؓ اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک وقت لٹا دیتے تھے، جیسے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے، جیسے حضرت علیؓ مرتضیٰ، اور بعض انصار کرام، خدا نے انکی مدح فرمائی

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَ	اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور
يَتِيمًا وَأَسِيرًا (دھر - ۱)	یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں،
وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ	اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ

لہ بخاری کتاب الزکوۃ باب مادی زکوۃ فلیس بکنز، ۲ ترمذی کتاب المناقب فضائل ابی بکر، ۳ اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۳۱۶،

خصاصۃ (حشر-۱) . وہ خود حاجت مند ہون ،

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتون کے موافق، اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے، اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے، اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے، جس سے اہلِ حاجت اور نیک کامون کے لئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے، اور ساتھ ہی اہلِ دل اور اہلِ استعداد کے مرتبۂ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے، اور اس کی خوبیان اور برائیان بھی بیان کر دی ہین، تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہپرون سے اڑ کر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرین ،

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات مین اسلام کے اس آخری مرتبۂ کمال کی تشریح ان الفاظ مین فرماتے ہین ،

"واین طائفہ، جان و مال در باختہ اند و با ہیچ کس ما سوا اللہ نہ پرداختہ اند، گفتۂ ایشان است، الفقیر مالہ مباح و دمہ ھدر یعنی درویش صادق آن بود کہ بخون و مال ورا دعوی نبود . . . . اگر مالش برند خوش گردد، گوید الحمد للہ کہ حجابے از پیش من برداشتند تا گفتہ اند، زکوٰۃ نعمت دنیا نزدیک این طائفہ محمود نباشد، از انکہ بخل نا ستودہ است، و بخلی تمام باید تا دویست درم را در بند کند، و یکسال محبوس دارد، آنگاہ پنج درم از ان بدہد،

اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو بار دیا ہے اور خدا کے سوا کسی سے دل نہین لگایا، اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور جسکا خون معاف ہو، اسکو اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ نہ ہو . . . . اگر لوگ اسکا مال اٹھا لیجائین تو خوش ہو کہ الحمد للہ اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پردہ پڑا تھا وہ اُٹھ گیا، یہانتک کہ ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کرکے زکوٰۃ دینا کچھ اچھا نہین ہے، کیونکہ بخالت تعریف کے قابل نہین، اور اس کے لئے کہ سال مین دو سو درم جمع ہون اور پھر وہ ایک سال تک بند پڑے رہین، تب جا کر ایک سال کے بعد پانچ درم انہین سے خدا کی راہ مین دے، بڑی بخالت کی بات ہو

اس کے بعد حضرت شبلی کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے،

یکے از فقہاء بر سبیل آزمائش شبلی رحمۃ اللہ علیہ را
پرسید کہ زکوٰۃ در چند لازم آید. گفت جواب بر
مذہب فقیہاں خواہی، یا بر مذہب فقیراں ؟
گفت بر ہر دو جواب فرما. شبلی گفت. بر مذہب
فقیہاں از دو صد درم بعد از حولانِ حول پنج درم
باید داد، و بہ مذہب فقیراں در حال ہر دو صد
درم باید داد و جان بشکرانہ بر سر باید نہاد. فقیہ
گفت ما این مذہب از ائمۂ دین گرفتیم. شبلی گفت
ما این مذہب از صادق رب العالمین گرفتیم یعنی
ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ. او ہر چہ داشت پیش
سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہاد و جگر گوشۂ خویشتن
بشکرانہ داد، (مکتوب ۴۴ - سہ صدی)

کسی نے حضرت شبلی سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے
پر ہوتی ہے، فرمایا فقہاء کے مسلک پر جواب چاہتے
ہو، یا فقراء کے، کہا دونوں کے، فرمایا فقہاء کے
مذہب کے مطابق ایک سال گذرنے پر دو سو درم
میں سے پانچ درم، اور فقراء کے مسلک پر فوراً
پورے کے پورے دو سو، اور اس نذرانہ کی خوشی
میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہئے، فقیہ
نے کہا ہم نے یہ مذہب ائمۂ دین سے حاصل کیا ہے،
فرمایا ہم نے یہ مسلک صدیق اکبر سے حاصل کیا ہے
کہ جو کچھ تھا وہ سب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے
رکھ دیا، اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہ صدیقہ)
کو شکرانہ میں دیا،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی، آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے. جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہلِ استحقاق میں تقسیم ہو جاتا. اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے تو گھر میں آرام نہ فرماتے. مگر عام امت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو، تا کہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولتمندوں کے ہر طبقہ کے لئے یکساں کھلا رہے. اور اس لئے تا کہ بے قیدی و عدم پابندی لوگوں کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو. مقدار معین کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی. تا کہ جماعت کے مجبور و معذ

افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے،

اشتراکیت کا علاج

دنیا مین امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے، ہر تمدن کے آخری دور مین، قوم کے مختلف افراد کے درمیان، دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے پیدا ہو جاتی ہے، بعض طبقے نہایت دولتمند ہو جاتے ہین جن کے خزانون کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہین ہوتا، اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہین جنکے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا، اور سونے کیلئے ایک بالشت زمین بھی نہین ہوتی اور دولتمند طبقون کی خود غرضی خود پسندی، عیاشی، اس حد تک پہنچ جاتی ہے، کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیون کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا تک دینے کے روادار نہین ہوتے، اور وہ یہ سمجھتے ہین، کہ یہ اتفاقی دولت، خدا کیطرف سے نہین، بلکہ ان کے علم و ہنر سعی و کوشش اور دست و بازو سے حاصل ہوئی ہے، اس لئے ان سست و ناکارہ افراد کا اس مین کوئی حصہ نہین، قارون کو جب زکوٰۃ و خیرات کا حکم ہوا، تو اس نے جواب مین یہی کہا

إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِىٓ ۚ (قصص ـ ۸) مجھکو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب ملا ہے،

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونون کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے،

یونان کے آخری دور مین یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ مین یہی شکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ فضا مین بھی آب و ہوا، اقتصادی مشکلات کے ابر و باد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے، اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہین، لیکن دنیا مین مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے، یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے جو نقشے بنا رہے ہین، وہ انسانی فطرت و طبیعت کے اس درجہ مخالف ہین کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا، اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے، دولت و

سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھون مین جانے سے روکا جائے، سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائداد صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہین دیا، نفع عام کی چیزین اشخاص کے بجائے جماعت کی ملک قرار دین، قیصریت اور شہنشاہیت کے بجائے، جماعت کی حکومت قائم کی، زمینداری کا پرانا اصول جس مین کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدلدیا؛ اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی، انسانی فطرت کے خلاف یہ نہین کیا کہ سرمایہ کو لیکر تمام انسانون مین برابر تقسیم کر دیا جائے، تاکہ دنیا مین کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیون کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی تاکہ وہ اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو، اور جماعت کا فرض قرار دیا، کہ وہ اس رقم سے قابلِ اعانت لوگون کی دستگیری کرے، یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتون سے محفوظ رہا، اور آج بھی اگر اسلامی ممالک مین اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اُتنے رقبہ مین جتنے مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی حکومت ہے، پیدا نہین ہو سکتے، خلافتِ راشدہ کے عہد مین حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب مین دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام مین قرآنِ پاک کی اس آیت کے مطابق، کہ "جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہین اور خدا کی راہ مین خرچ نہین کرتے" یہ فتوی دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے[1]، اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ مین دیدے، اور شام کے دولتمند صحابہؓ نے اُن کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ مین دیکر بچاتے ہین؛ تو حضرت ابوذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی، اور نہ عوام مین کوئی فتنہ پیدا کر سکی، کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا، اور عرب کے آرام و آسایش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ مین کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہین رہا[2]،

اقتصادی اور تجارتی فائدے

زکوٰۃ مین ان روحانی اور اخلاقی فائدون کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۶۰، [2] فتح الباری شرح بخاری جلد ۶ صفحہ ۴۵۱ وطبقات ابن سعد ترجمۂ عمر بن عبد العزیز صفحہ ۲۵۶

فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں، اوپر گذر چکا ہے کہ زکوٰۃ انہیں چیزون مین واجب ہوتی ہے جن مین دو صفتین پائی جائین یعنی بقا اور نمو، بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکین کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت مین نہ چندان فائدہ ہے، اور نہ وہ دوسرون کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لئے سبزیون اور ترکاریون پر زکوٰۃ نہین ہے، اور نمو سے یہ مقصد ہے، کہ ان مین یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو، اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھرون مین یا غیر مزروعہ زمین اور مکان مین بھی زکوٰۃ نہین ہے، ان دونون نکتون سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھین، بلکہ محنت، کوشش اور جد و جہد سے اس کو ترقی دین ورنہ اصل سرمایہ مین سال بسال کمی ہوتی جائیگی، جس کو فطرۃً کوئی برداشت نہین کر سکتا، اسطرح زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہین ترقی دیجائے، کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال مین ایک خاص رقم ادا کرنا پڑیگی تو وہ کوشش کریگا کہ جہان تک ہو، یہ رقم منافع سے ادا کرے، اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے، اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہین چیزون کے ساتھ مخصوص کیا جنہین نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو، اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے، صحابۂ کرام اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار مین مصروف رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت مین ان لوگون کو جو تیمیون کے سرمایون کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت مین لگائین تاکہ اُن کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ مین سب صرف نہ ہوجائے،

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہان مال کا اکثر حصہ بیکار زمین مین مدفون رکھا جاتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی زبانِ وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کرکے یہ نکتہ بتادیا تھا،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ — اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑ کر رکھتے ہین

وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُم   اور اس کو خدا کی راہ مین نہین صرف کرتے، انکو

بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ (توبہ ۔ ۵)   سخت دردناک عذاب کی بشارت دو،

یہ "دردناک عذاب" قیامت مین تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا، اس دنیا مین بھی ان کیلئے اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہین، اور اس سے دولت کی افزایش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے، اس کو بیکار اور معدوم کر کے ملک کو فقر و محتاجی کے عذابِ الیم مین مبتلا کرتے ہین، اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہین، اس لئے امرار کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی مین ہے، کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کرین،

فقرا کی اصلاح اب دوسری طرف فقرا کا گروہ ہے، اس مین کوئی شک نہین کہ دنیا کے تمام شارعینِ مذاہب نے انسانون کے اس قابلِ رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اُس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے، کہ اس کو ٹھیس نہ لگنے اور وہ ٹوٹنے نہ پائے، اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتون سے اس کو تکلیف ہوگی کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا۔

گذشتہ مصلحین نے عموماً اس مین افراط و تفریط سے کام لیا ہے، بعض نے تو اس زخم مین صرف نشتر ہی لگایا ہے، اور مرہم کا کوئی پھاہا نہین رکھا، چنانچہ زردشتی مذہب مین سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے، اور اس کے بالمقابل بودھ مذہب مین اس زخم کو سر تا پا مادۂ فاسد بننے دیا گیا ہے، اور بھکشوون کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے، لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور اس پھوڑے کو دور کرنے کیلئے ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونون عمل کئے ہین، اس نے اس غمگین اور دردمند طبقہ کے زخم مین نشتر بھی لگایا ہے، اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس کی وہ مہربانیان، تسلیان، بشارتین اور عملی امداد و اعانت

کی تدبیرین ہین، جو اُس کے دل کی ڈھارس، اور اس کی امیدون کا سہارا ہین، اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہین، جو اس نے اس طبقہ کو دنائت، پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسرون کی دست نگری، اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کین، اس نے اہلِ حاجت کے لئے دوسرون سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہین کی، لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے،

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب مین ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو، اور غریبون اور مسکینون کو دے ڈالو، نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم اور رحم ومحبت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے، لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولتمندون کو سب کچھ غریبون اور مسکینون کو دیدینے کی ترغیب دے رہے ہین، اور اس سے دینے والون کے جذبۂ ایثار اور اُن کے جود وسخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہین، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو، گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی، اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہین، اور بے محنت کھانے، اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہین، اس طرح اُن کے لئے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی، اور تمام رذیل وپست اخلاق کا گڈھا تیار کر رہے ہین، جہان یہ تمام نجاستین آکر جمع ہونگی، کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوعِ بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنس بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبر اسلام علیہ السلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہین ہوئی، وہ انسانون کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بناکر بھیجے گئے ہین، غریب وامیر اور مسکین ودولتمند دونون آپ کی نگاہ مین یکسان ہین، اس لئے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہین دیا، بلکہ دونون طبقون کو ترازو کے دونون پلڑون مین رکھکر برابر باٹ سے ناپا ہے، اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات مین سے دونون کو مساوی حصہ دیا ہے،

یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے، جس پر نبیون کے خاتم اور دینون کے مکمل علیہ السلام کے سوا

دنیا کے کسی اخلاقی معلم، اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے، اور نہ وہ اپنے ہاتھ مین ترازو کے دونون پلون کو برابر رکھ سکا، اگر غریبون کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسرون کی اعانت و ہمدردی کے تمام دروازے بند کر دیئے جائین، تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امراء کا طبقہ اپنے اخلاقی معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک، اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہی مایہ ہو جائیگا، اور اگر غربار اور فقراء کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دیدی جائے تو انسانون کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائیگی، اسی لئے داعی اسلام علیہ السلام نے، انسانون کے دونون طبقون کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونون طبقون کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا، اور دونون کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقائص، اور کمزوریون کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی، ایک طرف تو اسلام نے امراء اور دولتمندون کے طبقہ کو خطاب کرکے کہا،

اَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ. (ضحیٰ - ۱) مانگنے والے کو جھڑکی نہ دے،

دوسری طرف خوددار و بے نیاز فقرا اور غریبون کے طبقہ کی مدح فرمائی،

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا. (بقرہ - ۳۷) ناواقف ان کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولتمند سمجھتے ہین تو انکو ان کی نشانی سے پہچانتا ہے، وہ لوگون سے لپٹکر نہین مانگتے،

اور بھیک مانگنے کو خلاف تقوی قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے، ان کو خطاب کرکے کہا

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى. (بقرہ - ۲۵) اور زاد راہ لیکر چلو کہ بہترین زاد راہ تقوی (بھیک نہ مانگنا) ہے،

ایک طرف دولتمندون کو فرمایا کہ تمہارا حسن اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اس کو خالی

مت لوٹاؤ، وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ "اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو۔" دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ تمھاری خودداری یہی ہونی چاہئے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ الیدُ العلیا خیر من الید السفلی[2] "اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا، اور دونوں کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔

صدقہ و خیرات درحقیقت وہ پانی ہے جو دینے والوں کے قلوب و نفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک و صاف بنا دیتا ہے لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لیکر باہر نکلتا ہے تو حرص و طمع کے پیاسے اس کو چلوؤں سے لیکر پینے لگتے ہیں، اسی لیے آنحضرت صلعم نے فرمایا۔

ان ھذہ الصدقات انما ھی اوساخ الناس[3] یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے،

اگر آج ان فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاقِ شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو نظر آجائیگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے،

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہیں، ان میں سے کونسی چیز ہے، جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقراء، اور مہذب گداگروں کا تمغائے امتیاز نہیں، اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوۃ دینے والوں کے دامن سے چھٹ کر فقراء اور گداگروں کے دامنِ دل کو نجس بنا دیتا ہے، تاہم اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرۃً ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جب نفیس الطبع سے نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے، گندہ سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ و خیرات کے قبول

---

[1] بخاری کتاب الزکوۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ [2] ایضاً باب الاستعفاف عن المسئلۃ [3] مسلم کتاب الزکوۃ باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقۃ۔

کرنے کی اجازت دی جائے، شریعتِ محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگون کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے، اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق و عادات پر جو برے اثرات طاری ہو سکتے ہین ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفید تدابیر اختیار کی ہین، اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہین جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱- اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصۃً لوجہ اللہ ادا کیا جائے، یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے، نہ اس کو ممنونِ کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع مین اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے دیا جائے کیونکہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی، اور دنارت ظاہر ہوتی ہے، تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے، اور بجائے اس کے لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو، اس کو اس کے اس فعل سے پہلے سے تو نفرت ہوگی، پھر رفتہ رفتہ شاید اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے، یا اُن مین بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہون، وہ اپنی نظر مین اپنی ذلت آپ محسوس کرکے، اپنی جان پر کھیل نہ جائین،

اسلام نے انہین باتون کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی، کہ دینے والون کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (دھر - ۱)

ہم تمکو خدا کے لئے کھلاتے ہین، ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہین چاہتے،

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمہاری احسان مندی اور شکر گذاری بھی نہین چاہئے، پھر صدقہ دینے والون کو یہ بھی تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے طعنہ دینے، یا لینے والے کو ذلیل و رسوا کرنے سے تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی، اور تمام ثواب حرفِ غلط کی طرح تمہارے نامۂ اعمال سے مٹ جائیگا، فرمایا،

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

جو لوگ خدا کی راہ مین اپنا مال خرچ کرتے ہین،

ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ، قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۔

اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہین، نہ طعنہ دیتے ہین، ان کا اجر ان کے خدا کے پاس امانت ہے اور نہ ان کو قیامت مین کوئی خوف ہے، اور نہ وہ غمگین ہونگے، کچھ نرمی کی بات کہکر اور چشم پوشی کرکے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے خدا تمھاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمھارے ایسے کامون پر بردباری سے درگذر کرنے والا ہے۔

(بقرہ - ٣٦)

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دلنشین تشبیہ سے واضح کیا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ،

مسلمانو! اپنے صدقون کو احسان جتاکر اور طعنہ دے کر برباد نہ کرو، جیسے کہ وہ اپنے صدقون کو برباد کرتا ہے جو محض لوگون کے دکھلانے کو دیتا ہے، اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہین لاتا، اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے، جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو اور اس پر ایک پانی پڑگیا ہو، جس نے اسکو صاف اور چٹیل کردیا کہ اب اسپر کوئی چیز جم نہین سکتی ہے، ان لوگون نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہین اٹھا سکے، خدا کافرون کو ہدایت نہین کرتا،

(بقرہ - ٣٦)

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے

خود کسی کو نہ دیں، بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں، اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تاکہ اس طرح غریب لینے والا اگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنونِ احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے، اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے، اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ فقراء اور معذوروں کو دربدر کی ٹھوکر کھانے کی رسوائی، اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے،

۲- اسی لئے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے، کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے، کیونکہ جب کسی کی ذلت اور فقر و فاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی، اور اس لئے اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ، دنیا میں گداگری، دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بنجائیگا اور یہ اخفا، اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے، کہ دینے والا، نمایش اور شہرت طلبی کی آلائشوں سے اپنے اخلاق کو محفوظ رکھ سکے گا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔[1]

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفاء الصدقۃ۔

لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں کہ جہاں صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے، اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خاص نیت ہو، یا خود سائل پیش دستی کرکے مجمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو، چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا،

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ) — اگر تم صدقہ کو کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقراء کو دو تو یہ بہت ہی بہتر ہے۔

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفاء کو عام خیرات کیساتھ مخصوص کیا ہے، مگر فرض زکوٰۃ کے لئے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے، کہ اس سے اسلام کے ایک رکن کی اشاعت اور تبلیغ

اور دوسرون مین اس کی پیروی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے، اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کئے جاتے ہین، لیکن ہمارے نزدیک آیتِ کریمہ کا مفہوم صاف ہے، زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہد نبویؐ مین تھا، یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملون کے سپرد کیجائے، اس لئے اخفار کا جو فائدہ فقرا کے حق مین ہے وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقیرون کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے، اسی لئے جس آیت مین اعلان کی اجازت ہے، اس مین فقرار کو براہ راست دینے کا حکم نہین اور جہان اخفار کے ساتھ دینے کا ذکر ہے، وہان فقرار کو دینے کی تصریح ہے، اس لئے اعلان اور اخفار کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہین ہے، بلکہ ادا کرنے کے طریقہ مین ہے، کہ اگر بیت المال اور نائبین بیت المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کرکے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونون کا حساب پاک رہے، اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے، لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے، تو اس مین حساب کتاب کی ضرورت نہین، اور براہ راست تم ہی کو ان کو دینا ہے، بیت المال کا پردہ بیچ مین نہین ہے، اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو، تاکہ دینے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے، پھر ترغیب، اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوقِ اسلام ادا کرنے مین اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکرون کی ضرورت ہو، ورنہ صحابۂ کرامؓ کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا، مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سی معمولی رقم کے لئے جب تک اخبارون کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیئے جائین، دینے والون کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہین ہوتی۔

۳- تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے، بلند ہمتی کا اقتضار یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچکر نہ ٹھہرے، اور اس کو دنیا کی تمام چیزین ہیچ نظر آئین، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ و صدقہ مین مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تاکہ مبتذل اور ادنی درجہ کی

چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو۔ کیونکہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور چھچھورپن پیدا ہوگا، کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اوس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بخالت، حرص اور کینہ پن، اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی، کیونکہ کوئی بری چیز کسی کو دیدینے کا منشا دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کے بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے۔ روایتوں میں ہے کہ اصحاب صفہ کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کسب معاش کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لئے لوگ کھجوروں کے بدمزہ خوشے لاکر مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے، اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بیتاب ہوجاتا تھا، تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھالیتا تھا، چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ، (بقرہ ۲ ۔ ۳۷)	مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمھارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے، بہتر حصہ خیرات کرو، اور ان میں سے ردی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو، حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم نہ لوگے لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ، اور یقین کرو کہ خدا تمھاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے، اور وہ خوبیوں والا ہے، (خوبیوں ہی والی چیز پسند کرتا ہے)

۴۔ فقراء اور مساکین کی دنائت اور حرص و طمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انھیں لوگوں کو زکوۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگدستی اور بے بضاعتی کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ

سے جانے نہین دیتے کیونکہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابۂ کرام مین سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفہ تھے، لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا، کہ پریشانیِ صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہین کر سکتی تھی، اس بنا پر اسلام نے اُن کو زکوٰۃ کا بہترین مستحق قرار دیا،

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	صدقہ ان فقرار کے لئے ہے جو خدا کی راہ مین
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ	گھرے ہوئے ہین، (بغرض معاش و تجارت) سفر
يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ	کی قدرت نہین رکھتے، جو لوگ ان سے ناواقف
تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ	ہین خودداری اور عدم سوال کی وجہ سے انکو
اِلْحَافًا،	مالدار سمجھتے ہین، تم صرف ان کے بشرہ سے انکو
(بقرہ-۳۷)	پہچانتے ہو، وہ لوگون سے گڑگڑا کر کچھ نہین مانگتے

آج مسلمانون نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑون شریف آدمی در در کی ٹھوکرین کھاتے ہین، اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہین،

۵- لیکن با این ہمہ حزم و احتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے، اس بنا پر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت مین اس کی اجازت دی، اور جہانتک ممکن ہوا لوگون کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی، چنانچہ آنحضرت صلعم نے بعضون سے اسکی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہین مانگین گے، انھون نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ مین اگر ان مین سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی کسی سے نہین کہتے تھے، کہ اٹھا دو[1]، ایک دفعہ آپ نے فرمایا جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگیگا نہین تو مین اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہون، آپکے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے مین یہ

[1] ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ

ضمانت کرتا ہون، چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہین مانگتے تھے،[1]

حکیم بن حزام ایک صحابی تھے، انھون نے ایک دفعہ آنحضرتؐ سے سوال کیا، آپ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیرین اور خوشرنگ چیز ہے، جو اس کو شرافت کے ساتھ لیگا اس کو اسمین برکت دیجائیگی، اور جو لالچ کے ساتھ لیگا، اس کو برکت نہ ملیگی، اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اسکا پیٹ نہ بھرے، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، حکیم نے کہا یا رسول اللہ آج سے مین پھر کسی سے کچھ نہ مانگون گا، اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ مین خلفا ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے، اور وہ انکار کرتے رہے، اور آخر تک اس انکار پر قائم رہے،

اس کی اور متعدد مثالین ہین، اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگون کے لئے جو صاحب دست و بازو ہون یعنی جنکے ہاتھ پاؤن، اور آنکھین صحیح و سالم ہون بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کر دی گئی، فرمایا کہ

لا تحل المسئلة لرجل قوی، ولا لذی مرة سوی۔ (ترمذی)	طاقت اور سکت والے اور صحیح و سالم آدمی کیلئے بھیک مانگنا حلال نہین،

صحیح بخاری مین ہے کہ آپ نے فرمایا،

والذی نفسی بیدہ لان یاخذ احدکم حبلہ فیحتطب علی ظھرہ خیر لہ من ان یاتی رجلا فیسألہ اعطاہ او منعہ (کتاب الزکوۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ)	قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ مین میری جان ہے کہ تم مین کسی کا رسی لیکر اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھ اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک مانگے، وہ اُسے دے یا نہ دے،

[1] ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب کراہیۃ المسئلہ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ،

آنحضرت صلعم نے اپنے زمانہ مین اس پر عمل بھی فرمایا، ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی، آپ نے فرمایا تمھارے پاس کچھ ہے؟ عرض کی ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے، آپ نے انکو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلھاڑی خرید دی، اور فرمایا کہ جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ، اور بیچو، انھون نے اس پر عمل کیا، تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کے لئے بچ گئے[1]۔

۶۔ لیکن جو لوگ بدقسمتی سے کسب معاش نہین کرسکتے، ان کو بھی الحاح، کثرت سوال، لجاجت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپ نے فرمایا۔

لیس المسکین الذی ترده الا کلة	مسکین وہ نہین ہے جس کو لقمہ دو لقمے دروازون
والاکلتان ولکن المسکین الذی	سے واپس لوٹا دیتے ہین، مسکین وہ ہے جو کو
لیس له غنیً ویستحی ولا یسأل الناس	بے نیاز نہین ہے، لیکن حیا کرتا ہے اور لوگون
الحافاً، (بخاری کتاب الزکوة باب قول الله لا یسئلون الناس الحافا)	سے گڑگڑا کر نہین مانگتا،

پھر یہ بھی بتادیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو، وہ ہر حال مین انسان کی شرم وحیا اور غیرت وآبرو کو برباد کردیتا ہے، فرمایا۔

مازال الرجل یسئل الناس حتی یاتی	آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہانتک کہ وہ قیامت
یوم القیامة لیس فی وجهه مضغة	کے روز اس طرح آئے گا، کہ اُس کے چہرہ پر گوشت
لحم، (بخاری کتاب الزکوة باب من سال الناس تکثرا)	کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا،

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا مین مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت وآبرو کی رونق خود دھوئی تھی۔

ان ضروری اصلاحات کیساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا، اور ان تمام برائیون اور بداخلاقیون کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانون مین پیدا ہوسکتی تھین، اور ساتھ ہی انسانی برادری کے

[1] ابوداؤد۔ کتاب الزکوٰۃ،

دونون طبقون کو ترازو کے پلڑے مین برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا، اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا پست و بلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کر دیئے، اور اُس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلون سے اس کو ڈرایا کرتی ہے،

آنحضرت صلعم کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتمند صحابہؓ مین یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین و ملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے، اور غریب صحابیون مین یہ قناعت اور خودداری پیدا ہو گئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے، دولتمند اپنی زکوٰۃ آپ لیکر بیت المال کے دروازون تک خود آتے تھے، اور غریب اپنے افلاس و حاجت کو خدا کے سوا دوسرون کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے، اور تیسری طرف آنحضرت صلعم کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال مین اتنا سرمایہ رہتا تھا، کہ زکوٰۃ کے کسی مصرحہ مصرف کے لئے کمی محسوس نہین ہوتی تھی، ضرورتمندون کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا[1]، اس طرح یہ ایک ایسا مالی و اقتصادی نظام تھا کہ بلانفع قرض دینے مین افراد کو جو تامل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا، اور سود کی لعنت کے بغیر داد و ستد کا راستہ کھلا ہوا تھا،

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۱۰۶۔

روزہ

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ)

روزہ کا مفہوم روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی مین اس کو "صوم" کہتے ہین، جس کے لفظی معنی "رُکنے اور چپ رہنے" کے ہین، بعض مفسرین کی تفسیرون کے مطابق، قرآنِ پاک مین اس کو کہین کہین "صبر" بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی "ضبطِ نفس" ثابت قدمی اور استقلال کے ہین، ان معنون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان مین روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشون سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعون مین اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزہ کے استعمال مین عام طور سے نفسانی خواہشون اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزین ہین، یعنی کھانا اور پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، انھین سے ایک مدتِ معینہ تک رُکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے، لیکن دراصل ان ظاہری خواہشون کیساتھ باطنی خواہشون اور برائیون سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی، خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت مین داخل ہے۔

روزہ کی ابتدائی تاریخ روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہین، انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصولِ معاشرت) مین چند وحشی قبائل کی تمثیل اور استقرار کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتدا اصل مین اس طرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ مین خود بھوکے رہتے ہونگے اور سمجھتے ہونگے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اسطرح مُردون کو پہنچ جاتا ہے؛[1] لیکن یہ قیاس اربابِ خرد کی نگاہ مین سندِ قبول حاصل نہ کر سکا

[1] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۴، طبع گیارہ،

بہر حال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ابتدا اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں، لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا اور غایت کی تشریح میں اپنے پیرووں کی وکالت کا محتاج نہیں، وہ بہ آواز بلند مدعی ہے،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۔ (بقرہ۔۲۳)	مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض کیا گیا، تاکہ تم پرہیزگار بنو،
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ، (بقرہ۔۲۳)	ماہ رمضان وہ مہینہ ہے، جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لئے سرتاپا ہدایت، ہدایت کی دلیلیں اور حق و باطل میں فارق بنکر آیا، تو جو اس رمضان کو پائے وہ اس مہینہ بھر روزہ رکھے، اور جو بیمار ہو، یا سفر پر ہو، وہ دوسرے دنوں میں رکھ لے، خدا آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو، اور (یہ روزہ اس لئے فرض ہوا) تاکہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو، اور تاکہ تم شکر بجالاؤ،

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام، بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی اہمیت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں،

روزہ کی مذہبی تاریخ قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کیساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعۂ احکام کا ایک جزو رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبر اُمّی جو بقول مخالفین عالم کی

تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب مین روزہ فرض عبادت رہا ہے، اگر یہ دعوی تمامتر صحت پر مبنی ہے، تو اس کے علم کے مافوق ذرائع مین کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعوی کی تصدیق مین یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہین، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار، روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے:

"روزہ کے اصول اور طریقے گو آب و ہوا، قومیت و تہذیب" اور گرد و پیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہین، لیکن بہ مشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہین، جس کے مذہبی نظام مین روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو"

آگے چل کر لکھتا ہے:-

"گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے"

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہین، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنون پر اکادشی کا روزہ ہے۔ اس حساب سے سال مین چوبیس روزے ہوئے، بعض برہمن کاتک کے مہینہ مین ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہین، ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہین، یعنی چالیس دن تک اکل و شرب سے احتراز کرتے ہین، ہندوستان کے تمام مذاہب مین جینی دھرم مین روزہ کے سخت شرائط ہین، چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہان ایک روزہ ہوتا ہے، گجرات و دکن مین ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہین، قدیم مصریون کے ہان بھی روزہ دیگر مذہبی تہوارون کے شمول مین نظر آتا ہے، یونان مین صرف عورتین تھسموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھین، پارسی مذہب مین گو عام پیروون پر روزہ فرض نہین، لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم اُن کے ہان موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشواؤن کے لئے تو پنجسالہ روزہ ضروری تھا۔

یہودیون مین بھی روزہ فریضہ الٰہی ہے، حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گذارے

[1] ان تمام حوالون کے لئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴ طبع یازدہم۔

(خروج، ۳۴: ۲۸) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں، لیکن چالیسویں دن کا روزہ اُن پر فرض ہے. جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے، اور اسی لئے اس کو عاشورا، (دسواں) کہتے ہیں، یہی عاشورا کا دن وہ دن تھا جس میں حضرت موسیٰ کو توراۃ کے دس احکام عنایت ہوے تھے، اسی لئے توراۃ میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے[1]، اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بتصریح مذکور ہیں[2]،

عیسائی مذہب میں آکر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا[3]، حضرت یحییٰ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گویا پیشرو تھے، وہ بھی روزے رکھتے تھے، اور ان کی اُمت بھی روزہ دار تھی[4]، یہودؔ نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں بہت سے روزے بڑھالئے تھے اور وہ زیادہ تر غم کے روزے تھے، اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنالیتے تھے[5]، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کردیا، غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے، حضرت عیسیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا،

"کیا براتی جب تک دولھا ان کے ساتھ ہے، روزہ رکھ سکتے ہیں جب تک دولھا ان کے پاس ہے روزہ نہیں رکھ سکتے، پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولھا ان سے جدا کیا جائے گا، تب انہیں دنوں میں روزہ رکھیں گے۔" (مرقس ۲-۱۸)

اس تلمیح میں دولھا سے مقصود خود حضرت عیسیٰ کی ذات مبارک اور براتی سے مقصود ان کے پیرو اور حواری ہیں، ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر اپنی امت میں موجود ہے، امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں،

---

[1] توراۃ، سفر الاحبار ۱۶-۲۹-۳۴ و ۲۳-۲۷ [2] اول سموایل ۷-۶ یرمیاہ ۳۶-۶ [3] متی ۴-۲ [4] مرقس ۲-۱۸ [5] قضاۃ ۲۰-۲۶، سموال اول ۷-۶ و ۳۱-۱۳ و لوقا ۹-۱۲ وغیرہ،

انھین فقرون سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزون کو نہین بلکہ غم کے مبتدعانہ روزون کو منع فرمایا، انھون نے خود اپنے پیروون کو بے ریا اور مخلصانہ روزے رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریون کو فرماتے ہین،

"پھر جب تم روزہ رکھو ریاکارون کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منھ بگاڑتے ہین کہ لوگون کے نزدیک روزہ دار ٹھہرین، مین تم سے سچ کہتا ہون کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر مین تیل لگاؤ، اور منھ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہین بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی مین دیکھتا ہے تجھ کو آشکار ا بدلہ دے" (متی ۶-۶-۷)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہین کہ ہم پلید روحون کو کس طرح نکال سکتے ہین، وہ اس کے جواب مین فرماتے ہین:-

"یہ جنس سوائے دعا، اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہین نکل سکتی" (متی ۱۷-۲۱)

اہل عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے، مکہ کے قریش جاہلیت کے دنون مین عاشوراء[1] (یعنی دسوین محرم کو) اس لئے روزہ رکھتے تھے، کہ اس دن خانۂ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا، مدینہ مین یہود اپنا عاشوراء[2] الگ مناتے تھے، یعنی وہی اپنے ساتوین مہینہ کی دسوین تاریخ کو روزہ رکھتے تھے،

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ، (بقرہ ۔ ۲۳)	مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا جس طرح تم سے پہلون پر لکھا گیا،

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے،

روزہ کی حقیقت | انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیون اور ناکامیون کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کیجئے،

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۴ [2] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول صفحہ ۲۶۸،

تو آخری نتیجہ یہ نکلیگا کہ وہ دنیا مین مختلف ضرورتون کا محتاج ہے، وہ مختلف اغراض کا پابند ہے، اسکے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہین، اخلاق جنکا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے، اگر تحقیق کیجائے، تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرضِ نفسانی پر مبنی نظر آئیگی اس لئے ہماری ہر قسم کی بدبختیان اور آلودگیان صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہین، ضرورت اور غرض، اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہین فرشتہ ہے،

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتون اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل مین آرزوؤن کا ایک ڈھیر ہے تمناؤن کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتون کا ایک انبار ہے، لیکن کیا خوشنما کپڑون، عالیشان عمارتون، لذیذ غذاؤن اور تیز رفتار سواریون کے بغیر ہم جی نہین سکتے؟ فرزند و عیال، زر و مال اور خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہون تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا؟ پادشاہون نے فقیرون کی زندگی بسر کی ہے اور زندہ رہے ہین، بروایتِ عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پرمسرت روحانی زندگی بسر کی

خود ساختہ ضرورتون کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتون کا وسیع دائرہ ایک دو نقطون مین محدود ہو کر رہ جائے، اور وہ مایۂ قوت و غذا یعنی کھانا اور پینا ہے، جس کے بغیر انسان زندہ نہین رہ سکتا، روح اور جان کا جسم مین باقی رہنا صرف سدِ رمق پر موقوف ہے، اور سدِ رمق صرف کھانے کے چند لقمون اور پانی کے چند گھونٹون پر موقوف ہے، اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتون کا مولد و منشا انہین چند لقمون اور چند گھونٹون مین افراط و وسعت، تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے، اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالمِ ناسوت اور عالمِ ملکوت کے دو باشندون مین اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی ایک چیز تمام فروق و امتیازات کو محیط ہوگی، انسان کے تمام جرائم اور گناہون کی فہرست اگر تیار کیجائے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل و خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈھے جائین، تو انہین دو چیزون

کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی،

اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب مین مادیات کی کثافتون سے بری اور پاک ہونے کے لئے اکل و شرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتون کا دائرہ کم کر دے اور آخر یہ کہ قوت وغذا کی طلب حرص سے بھی بے نیازی کے لئے متواتر کوشش جاری رکھے۔ کہ انسانون کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج ما بعد ہین، اگر یہ طلب وضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعۃً عالمِ ناسوت مین عالمِ ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے، اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے۔ اس مدت کے اندر انسانون کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغنا کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لئے ملاء اعلیٰ کی مقدس مخلوقات مین داخل ہو جانا چاہئے، اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت وعبادت ہے، اس لئے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے،

قرآن مجید نے ان تمام حقائق ورموز کو صرف ایک لفظ "تقویٰ" سے بے نقاب کر دیا ہے، اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب مین مشترک تھی اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت مین شریک کر لیا ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۔ (بقرہ-۲۳)	مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتون پر لکھا گیا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو،

روزہ کی غرض وغایت "تقویٰ" ہے یعنی اپنی خواہشون کو قابو مین رکھنا، اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچا لینا، اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لئے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا، لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتون کو بھی واضح کرتا ہے،

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (بقرہ - ۲۳) تاکہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو،

اس مفہوم کی توضیح کے لئے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑیگا،

رمضان کی حقیقت یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالم روحانی مین بھی اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور علل و اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، جس یقین کے ساتھ آپ یہ دعوی کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لئے قاتل ہے، اسی یقین کیساتھ طب روحانی کا واقف کار کہتا ہے، کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضان نبوت کے قبول کے لئے اپنی روح مین کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے، دنیا مین کب مبعوث ہوتا ہے، معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات مین ہوتا ہے، اور اپنے دعوی کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے، انکار و مزاحمت پر وہ کیون کر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے، اور پھر کیونکر دعوت کے منکر ناکام و خاسر اور اہل ایمان فلاح یاب و کامیاب ہوتے ہین انہین سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور مین آتی ہے، قرآن مجید مین تیرہ مقام پر سنۃ اللہ کا لفظ آیا ہے لیکن ان مین زیادہ اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے،

فلسفۂ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچکر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے، بعینہ اسی طرح انبیا علیہم السلام کے سوانح اور تاریخین بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کا اصولی قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہین،

پیغمبرانہ تاریخ کے انہین اصول و قوانین مین سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمال انسانیت کو پہنچکر فیضان نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لئے عالم انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص مین جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل و دماغ مین وحی الہی کا سرچشمہ موجین مارنے لگتا ہے، کوہ سینا کا پرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰ) جب توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا

اور پیاسا رہتا ہے[1]، کوہِ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس[2] روز و شب بھوکا اور پیاسا رہا[3]، اسی طرح فاران کا آتشین شریعت والا پیغمبر (آنحضرت صلعم) نزولِ قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ حرا، تمام مکہ کے ایک غار میں، ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے، اور بالآخر اسی اثنا میں ناموسِ اکبر "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ" کا مژدہ جانفزا لیکر نمودار ہوتا ہے[4]

یہ واقعہ کس ماہِ مبارک کا تھا؟

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (بقرہ۔۲۳) رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اترا،

یہ کس شبِ اقدس کی داستان ہے؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ. (دخان۔۱) ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا،

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (القدر۔۱) ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اتارا،

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا، اور پیغمبرِ امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لئے دستورنامہ[5] الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا، قرآن کا حامل اور اس وحیِ الٰہی کا مہبط ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ و تنہا بھوکا اور پیاسا[6] سر بہ زانو تھا، اس بنا پر اس ماہِ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادتگاہ[7]

---

[1] خروج ۳۴-۲۸ [2] متی ۴-۲ [3] صحیح بخاری حدیث بدء الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان باب بدء نزول وحی میں اور سیرۃ ابن ہشام بدء بعثت میں ہے، [4] روایات سے اگرچہ بتصریح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ غارِ حرا میں روزے رکھتے تھے، تاہم قرائن و اشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ اور عبادات کے ساتھ غارِ حرا میں روزے بھی رکھتے تھے، جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرۃ ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ ان دنوں میں تحنث اور عکاف کرتے تھے جس کا ایک جزء روزہ ہے، آج کل کے بعض علمائے مصنفین نے بھی ان قرائن سے یہی سمجھا ہے، کہ آپ ان دنوں روزہ سے رہتے تھے، (دیکھو خضری مصری کی التشریع الاسلامی صفحہ ۔ و صفحہ ۴ ۳)

مین یکسو تنہا رہنا (اعتکاف) نزولِ وحی کی رات مین (لیلۃ القدر) بیدار و سربسجود رہنا تمام پیروانِ محمدی کیلئے ضروری تھا کہ

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ   اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو،

(آل عمران - ۴)   خدا تمھین پیار کریگا،

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام مین کیا ہے؟ اور رمضان مبارک مین روزون کی تخصیص اسلام مین کس بنا پر ہے؟ اس لئے اس ماہِ اقدس مین بقدر امکان انھین حالات و جذبات مین متکیف ہونا چاہئے، جس مین وہ حاملِ قرآن متکیف تھا، تاکہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو، یہ جذبات و حالات جنکو قرآن کے مبلغ کی پیروی مین ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہین، یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکرگذاری اور خدا کی بڑائی ہے،

فرضیتِ صیام کا مناسب موقع سنہ ۲ھ

اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا، اور ان سے صرف جسم کی ریاضت مقصود ہوتی، تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرف عام مین فاقہ کشی کا نام ہے، اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے، اکثر یہ سعادت نصیب ہوجایا کرتی تھی، ظہورِ اسلام کے بعد کفار نے مسلمانون کو جن پریشانیون مین مبتلا کردیا تھا، اس نے ان کو عرب کے معمولی طریقہ کسبِ معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کردیا تھا، جن لوگون نے آنحضرت صلعم کی حمایت کی تھی، تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کرلئے تھے، اس حالت مین صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانون کی موجودہ زندگی کے لئے موزون ہوسکتا تھا، نماز و حج کی طرح اس مین کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ ایک خاموش طریقۂ عبادت تھا جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا، لیکن اسلام نے عبادات کو امراضِ روحانی کی دوا قرار دیا ہے، جنکا استعمال صرف اس وقت ہوسکتا ہے، جب امراضِ روحانیہ پیدا ہوجاتے ہین، یا اُن کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے، قوائے شہوانیہ اور

تغارت دنیا کی شیفتگی، اور لذات حسیہ کے انہماک و توغل سے جو روحانی مرض پیدا ہو سکتے تھے، مکہ مین یہ تمام ساز و سامان مفقود تھے، بلکہ خود کفار کے جور و ستم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا، اس لئے وہان اس روحانی علاج کی ضرورت پیش نہین آئی، آنحضرت صلعم مدینہ مین تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی، انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانون کو وجہ کفاف سے بے نیاز کر دیا، فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس مین روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وہ وقت آگیا یا عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت مین، مسلمانون کے سامنے آکر ان کو اپنا فریفتہ بنائے، اس لئے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا جس مین مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی، اور وہ پرہیز روزہ تھا، جو سنہ ۲ھ مین فرض ہوا[1] اس سے یہ شبہہ دور ہو جاتا ہے جو بعض ناواقفون کو ہوا ہے، کہ چونکہ آغاز اسلام مین مسلمانون کو اکثر فاقون سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا، حالانکہ اصول اسلام کے رو سے فاقہ مستون کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے، شکم سیرون کے لئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے، علامہ ابن قیم نے زاد المعاد مین لکھا ہے، کہ مرغوبات شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا، اس لئے روزہ وسط اسلام مین فرض کیا گیا، جب کہ لوگ توحید، نماز، اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے، اس لئے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لیے موزون تھا،

ایام روزہ کی تحدید روزہ ایک قسم کی دوا ہے، اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہئے تھا، اگر پورا سال اس دوا مین صرف کر دیا جاتا، تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانون کی جسمانی جد و جہد کا خاتمہ ہو جاتا، اور ان کی شگفتگی مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس مین دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا، اس لئے اسلام نے روزہ کے لیے سال کے ۱۲ مہینون مین سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لئے مقرر کیا، اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت

[1] تاریخ ابن جریر طبری واقعات سنہ ۲ھ و زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۲۴۷ مصر، و زاد المعاد ابن قیم جلد اول ص ۱۶۰ مصر،

تھی، تاکہ تمام افرادِ امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظامِ وحدت کا مظاہرہ کریں، اور اس کے لئے وہی زمانہ موزون تھا جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا یعنی رمضان، چنانچہ آنحضرت صلعم اس کے بعد جب تک زندہ رہے، اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گذارا، اور آج تک کل امتِ محمدیہ پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہِ صیام مانتی ہے، اور پورے مہینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے، چونکہ روزہ بہرحال مشقت کی چیز ہے، اس لئے قرآنِ پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے، تاکہ نفسِ انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو، پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ-۲۳) اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا،

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا، بلکہ

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ (بقرہ-۲۳) جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا،

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا گیا،

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ، (بقرہ-۲۳) چند گنے ہوئے دن،

مدت کی تعیین اب بھی نہیں، البتہ اس بلیغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے، اور فرمایا "چند گنے ہوئے دن" اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانیوں کا ذکر شروع کر دیا گیا، تاکہ طبیعت متوجہ رہے،

فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (بقرہ-۲۳) تو جو بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کی گنتی،

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہونگے، کہ اگر خاص زمانہ نہ ہوتا تو یہ کہنا بیکار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو، نیز یہ بھی اشارۃً پتہ چلتا ہے

کہ جو دن ہونگے وہ گنے ہوئے مقررہ ہونگے، ورنہ مَعْدُوْدَاتٍ (گنے ہوئے) اور عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، (دوسرے دنون کی گنتی) اور پھر آگے چل کر وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (تاکہ تم شمار کو پورا کرلو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی،

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، (بقرہ-۲۳)

اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے،

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے،

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۚ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (بقرہ-۲۳)

تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ بہتر ہے اُسکے لئے، اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو،

ان آیتون مین دیکھئے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا، اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی،

انہی تمہیدون کے بعد روزہ کے گنے ہوئے دنون کی تعیین کیجاتی ہے، کہ وہ ایک مہینہ ہے، اور جس کو ہلکا کرکے دکھانے کے لئے فرمایا گیا تھا کہ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ، چند گنے ہوئے دن، ظاہر ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دنون مین انتیس[۲۹] اور تیس[۳۰] دنون کے روزے چند گنتی کے دن تو ہین ہی، بہرحال

[۱] عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے جسکا اطلاق دس دنون سے زیادہ پر نہین ہوتا تو اسکو جاہئے کہ اَيَّامُ العرب کو جو تعداد مین سینکڑون ہین، زیادہ سے زیادہ نو لڑائیون مین محدود کرے، اسی طرح قرآن مین اللہ تعالیٰ نے جہان دنیا کے اور ہزارہا انقلابات کو اَيَّامُ اللّٰه کہا ہے (ابراہیم-۱) ان کو نو تک کے انقلابات عالم مین محدود کرے، یمن سے شام تک کے سرسبز راستہ کو جو مہینون مین طے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتین فرمایا، سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ (سبا-۲) اور فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (گذرے ہوئے دن) جسکا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر، اور تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کو زمانہ کے برسون اور صدیون پر کیا ہے، وہ نو دن سے زیادہ تو بڑھ سکین، جمع قلت وکثرت کا یہ قاعدہ وہ بھی کلی نہین بلکہ عمومی ان الفاظ کے لئے ہے جن کی جمع قلت وکثرت دونون مستعمل ہین، ایام کا لفظ اُن مین نہین اسکی صرف ایک ہی جمع آتی ہے، اور وہ اُنہی امور جو تعلیل کے بعد ایام بولا جاتا ہے، سند کے لئے دیکھو رضی شرح کافیہ، جلد دوم بحث جمع مکسر، اور لسان العرب لفظ یوم،

رمضان کو ماہِ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی، فرمایا،

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ — وہ رمضان کا مہینہ جس مین قرآن اتارا گیا، اور اس

هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی — قرآن مین لوگون کے لئے ہدایت ہے، اور ہدایت

وَالْفُرْقَانِ ۔ (بقرہ - ۲۳) — اور حق و باطل کی تمیز کی دلیلین ہین،

اب وہ مناسب موقع آیا جس مین یہ فرمایا جائے کہ ان چند دنون کے روزے اسی رمضان مین جس کی یہ عظمت ہے تم پر فرض کئے گئے" ارشاد ہوا،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ (بقرہ-۲۳) تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے

اب پورے ماہِ رمضان کے روزون کی تعیین و تحدید اور ایاماً معدودات کی تشریح ہو گئی، عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرف زمان[1] ترکیب نحوی مین اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے، وہ فعل اس ظرف زمانہ کو محیط ہوتا ہے، مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہین گے صَامَ شَهْرًا اس کے یہ معنی نہ ہونگے کہ مہینہ مین چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائیگا، اور اگر یون کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی مین یون کہین گے صَامَ سَنَةً (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیتِ پاک مین پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے، اور چونکہ لفظ "شہر" یعنی "مہینہ" کہا گیا ہے، اس لئے مہینہ کے شروع سے ان روزون کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری مہینہ جسکا عرب مین رواج تھا، اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوئے ہین جیسی روایت ہو، وہی ماہ صیام پر بھی صادق آئیگا، جیسا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوات تمام صحابۂ کرام، خلفاے راشدین اور جمیع فرقِ اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے، اور احادیثِ صحیحہ مین اس کی پوری تصریحات مذکور ہین،

ایک نکتہ قرآنِ پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ مین دیا ہے،

[1] تفصیل کے لئے دیکھو رضی جلد اول بحث مفعول فیہ ظرف زمان صفحہ ۱۹۳ ، طبع نولکشور ۱۲۸۶ھ

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ، (بقرہ-۲۳) تو جو اس مہینہ کو پاوے، تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے،

لفظ شَهِدَ کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ مین موجود اور حاضر رہنے کے ہین، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہین، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہین جو اس ماہ صیام مین موجود اور حاضر ہو، اس ماہ صیام مین غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتین ہین، ایک یہ کہ ماہ صیام آئے، اور شخص غیر حاضر ہو یعنی اس دنیا مین موجود نہ ہو، جس مین وہ ماہ صیام آیا، یا دوسری صورت یہ ہے، شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہ صیام کا وہان گذر نہ ہو، یہ صورت ان قطعات ارضی مین پیش آئیگی، جہان شب و روز کا وہ نظام موجود نہین جو باقی متمدن دنیا مین ہے، مثلاً جن مقامات مین کئی مہینون کے دن اور کئی مہینون کی راتین ہوتی ہین، کہ وہان رمضان کی آمد کا سوال ہی نہین، ہان اگر وہان کے مسلمان چاہین، تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار مانکر روزے رکھین اور کھولین، (جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحیح مین ہے ثابت ہے)

اسی طرح وہ ملک جہان بیس بیس گھنٹون کی راتین ہون، اور لوگ روزہ کا تحمل نہ کر سکتے ہون وہ آیت

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (بقرہ-۲۳) اور جو بمشکل روزہ رکھ سکین ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے پر عمل کر سکتے ہین،

لفظ اطاقۃ کے معنی مین بعض صاحبون کو یہ شبہ ہوا ہے کہ اس کے معنی صرف توانائی وسعت اور قدرت کے ہین بمشکل قدرت اور طاقت رکھنے کے نہین ہین، مگر یہ صحیح نہین، اطاقۃ طاقۃ کا باب افعال سے مصدر ہے، اس کا ثلاثی مصدر کم استعمال مین آتا ہے، اور طاقۃ کے لغوی معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ مین یہ لکھے ہین،

والطوق الطاقۃ ای اقصی غایتہ و	طوق کے معنی طاقت کے ہین یعنی قوت کی انتہائی
ھو اسم لمقدار ما یمکن ان یفعلہ	غایت، اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی

بمشقة منه — مشقت کے ساتھ کرسکے،

حضرت ابن عباسؓ[۱] غالباً یہی معنی قرار دیکر، حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی) اور بڈھے کو فرضیت سے مستثنیٰ سمجھتے تھے۔

روزہ پر اعتراض اور اُسکا جواب علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی، جو عام عبادات و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہین کہ وحشی انسانون کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہین کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے جسمانی زحمت کشی ہے، اور ان غلط فہمیون کے لئے دیگر مذاہب مین گو لغزشگاہین موجود ہین، چنانچہ جوگیون اور جینیون مین روزہ کی غیر معمولی مدت اور اسکی سختیان اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہین، یہودیون کی اصطلاح مین روزہ رکھنے کے لئے "نفس کو دکھ دینے" کی اصطلاح جاری ہے، چنانچہ توراۃ مین روزہ کے لئے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے، سفر الاحبار (۱۶-۲۹) مین ہے۔

"اور یہ تمھارے لئے قانون دائمی ہوگا کہ ساتوین مہینے کی دسوین تاریخ تم سے ہر ایک خواہ وہ تمھارے دیس کا ہو، خواہ پردیسی جس کی بود و باش تم مین ہے، اپنی جان کو دکھ دے"

توراۃ کے سفر العدد (۲۹-۷) مین ہے۔

"اور اس ساتوین مہینے کی دسوین تاریخ مقدس جماعت ہوگی، اور تم اپنی جانون کو دکھ دو، اور کچھ کام نہ کرو"

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات مین بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ "صوم" ہے، صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہین جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، خدا نے قرآن پاک مین مسلمانون کو جہان روزہ کا حکم دیا ہے، وہان یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیئے ہین،

[۱] ابو داؤد کتاب الصوم باب من قال ہی مثبتة للشیخ والحبلی،

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ۔۲۳)	خدا تمھارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا،

اسلام کا عام قانون ہے،

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، (بقرہ۔۴۰)	خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا،

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ مین کی ہے،

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف۔۱۹)	وہ ان کو نیکیون کا حکم دیتا ہے، برائیون سے روکتا ہے اور گندہ چیزون کو حرام کرتا ہے، اور اس طوق اور زنجیرون کو جوان کے اوپر پڑی ہین، ان سے اتارتا ہے،

ان امور کا منشاء یہ ہے کہ اسلامی عبادات و احکام مین کوئی چیز بھی اس غرض سے نہین رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ مین داخل ہے، اور اسی لئے اسلام نے روزہ کی ان سختیون کو جو لوگون نے بڑھا رکھی تھین، بتدریج کم کر دیا،

روزہ مین اصلاحات اسلام نے روزہ کی سختیون کو جس حد تک کم کیا اور اس مین جو سہولتین پیدا کین وہ حسب ذیل ہین،

۱۔ سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، ان مین اکثر روزہ صرف پیروون کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا، مثلاً ہندؤن مین غیر برہمن کے لئے کوئی روزہ ضروری نہین، پارسیون کے یہان صرف دستور اور پیشوا کے لئے روزہ ہے، یونانیون مین صرف عورتون کے لئے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروانِ مذہب کے لیے برابر طور سے ضروری ہے،

اسلام مین پیشوا، غیر پیشوا، عورت، مرد کی کوئی تخصیص نہین، اس نے تمام پیروون کو عام حکم دیا اور اس مین کسی

چیز کی کوئی تخصیص نہین کی،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ-۲۳) اس مہینہ مین جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے:

۲- اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب مین عمومًا شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال مین روزہ کی جو تاریخین جن موسمون مین متعین ہونگی، ان مین تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم مین چھوٹے یا بڑے دنون مین واقع ہوتے ہین، تو یا تو وہ مختلف ملکون مین ہمیشہ کے لئے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لئے آرام دہ ہین، اسلام کے روزون کی تاریخین قمری مہینون سے ہین، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنون کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہین، اس لئے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک مین ہر موسم مین آتا ہے، اور اس بنا پر اس کی سختی و نرمی بدلتی رہتی ہے،

۳- جہانتک دیگر مذاہب کی الہامی کتابون کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالتِ انسانی کی تخصیص و استثنا نظر سے نہین گذری، توراۃ مین تو یقینًا مذکور نہین بلکہ یہانتک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائیگا یا قتل ہوجائیگا[1]، بلکہ یہ ہے کہ اس پردیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہین مگر یہودیون کے پاس آکر رہا ہو، لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگون کو اس حکم سے مستثنیٰ کردیا، بچے مستثنیٰ ہین، عورتین ایام حمل و رضاعت اور دیگر مخصوص ایام مین روزہ سے مستثنیٰ ہین، بڈھے، بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہین، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرۃً قادر نہین مستثنیٰ ہین، بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اُتنے دنون کی قضا بعد کو رکھین، اور جو دائمی طور سے معذور ہین، وہ روزہ کے بجاے ایک مسکین کو کھانا کھلادین،

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ- اگر تم مین کوئی بیمار یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنون مین روزہ رکھلے، اور وہ لوگ

---

[1] احبار ۱۶-۲۹،

فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ، (بقرہ ۲۳-۲۳) جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہون اُن پر ایک مسکین کا کھانا ہے

ترمذی مین ہے،

عن انس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ وضع عن الحامل والمرضع الصوم حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتار دیا،

۴- اور مذہبون مین روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روز کا فاقہ تھا، یا روزہ کے دنون مین غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے انہین بھی توسط اختیار کیا، یعنی روزہ کے اوقات مین گو ہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹون کی رکھی،

۵- جینیون کے یہان، ایک ایک روزہ ہفتون کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے، یہودیون کے ہان پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صرف صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا،

ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ، (بقرہ ۲۳-۲۳) پھر روزہ کو رات تک ختم کرو،

۶- یہودیون کے ہان یہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے کھا لیتے، پھر نہین کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب مین یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے کھا لیتے سو جانے کے بعد کھانا پھر ناجائز تھا، ابتداءً اسلام مین بھی یہی قاعدہ تھا، ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر مین شام کا کھانا نہین تیار ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھین، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے کھانا پک چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئین، وہ سو چکے تھے، اس لئے کھانا نہین کھا سکتے تھے، دوسرے دن پھر روزہ کا دن تھا، ان کو غش آگیا، اس پر یہ آیت اتری،

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۔ (بقرہ ۲۳) اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہوجائے،

۷۔ جاہلیت مین دستور تھا کہ روزہ کے دنون مین، راتون کو بھی میان بیوی علٰحدہ رہتے تھے لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس مین مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہوجاتے تھے، اسلئے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لیے یہ ممانعت محدود کردی، اور رات کو اجازت دیدی،

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۔ (بقرہ ۲۳)

روزہ کی شب مین بیویون سے مقاربت تمہارے لیے حلال کیگئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم انکی، خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے تو اس نے معاف کیا، اب بیویوں سے ملو جلو اور خدانے تمہارے مقدر مین جو کچھ رکھا ہے، (یعنی اولاد) اس کی تلاش کرو،

۸۔ بھول چوک اور خطاؤ نسیان اسلام مین معاف ہے اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہین ٹوٹتا،

لے نے ہونے کی نوع حقی ہیں کئی صورتیں ہیں ہیں سے بعض ہیں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں

عن ابی ہریرۃ من اکل او شرب ناسیا فلا یفطر فانما ھو رزق اللّٰہ ۔ (ترمذی)

ابوہریرہ سے مروی ہے جو بھول کر کھائے یا پئے تو اس سے روزہ نہین ٹوٹتا، کہ یہ تو خدا کی روزی تھی

۹۔ اسی طرح اُن افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہین لیکن وہ قصداً سرزد نہین ہوئے، بلکہ بلا ارادہ از خود سرزد ہوئے ہین، روزہ نہین ٹوٹتا،

قال النبی صلعم لا یفطر من قاء ولا من احتلم ۔ (ابوداؤد)

پیغمبر خدا نے فرمایا جس کو قے ہوگئی، یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آگئی، اس کا روزہ نہین ٹوٹتا،

۱۰- یہودیون مین اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار، اور غم کی علامت تھے، اس لئے روزہ کی حالت مین وہ زیب وزینت نہین کرتے تھے، اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے، حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:-

"پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکارون کے مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہین، کہ لوگون کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہون، مین تم سے سچ کہتا ہون کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا، اور منہ دھو، تاکہ تو آدمی پر نہین بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی مین دیکھتا ہے، آشکارا تجھے بدلہ دے، (متی ۶-۱۶)

اسلام مین بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے، اس لئے روزہ کی حالت مین سر مین تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، خوشبو ملنا، اسلام مین روزہ کے منافی نہین، منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے، اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمایش کرکے ریا مین گرفتار نہ ہو، اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے مین اور خدا کے اس حکم کے بجا لانے مین نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے، بلکہ ہنسی خوشی، رضامندی اور مسرت ظاہر ہو،

۱۱- روزہ دوسری عبادتون کے مقابلہ مین ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس مین غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے، خود آنحضرت صلعم اکثر وبیشتر روزے رکھتے تھے، مہینون مین کچھ دن مقرر تھے، ہفتون مین بھی کچھ دن مقرر تھے ان کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسرے روزون کو صرف استحباب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی، بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا،

ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی و یسقینی　　　تم مین مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے،

(یعنی روحانی غذا)

لوگون نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کئے، جب مہینہ گذر گیا تو بطور

سرزنش کے فرمایا، کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا، تو مین اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا،

روزہ کے مقاصد | اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام مین روزہ کے کیا مقاصد ہین، گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے، مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہین،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تعلیم ربانی محض حکم کے طور پر نہین ہے، بلکہ وہ سرتاپا حکمتون اور مصلحتون پر مبنی ہے، اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادّی فوائد اور منفعتون کے چار گانہ ستونون پر قائم ہے، اور ان مصلحتون اور منفعتون کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے، اور بتا دیا ہے، چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا تین مختصر فقرون مین بیان کر دیئے ہین۔

۱۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ، (بقرہ-۲۳)	۱۔ تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو،
۲۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ، (بقرہ-۲۳)	۲۔ تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو،
۳۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (بقرہ-۲۳)	۳۔ تاکہ تم پرہیزگار بنو یا تم مین تقویٰ پیدا ہو،

اوپر گذر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبرون کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مین سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی، اور تا بامکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتون سے وہ پاک رہے، اور انھون نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا، یہان تک کہ وہ مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے، اور پیغامِ ربانی نے ان پر نزول کیا، حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کئے، تب توراۃ کی لوحین ان کو سپرد ہوئین، حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گذارے، تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے اُبلا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا مین ایک مہینہ یعنی ۳۰ دن مصروف

---

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۰۶،

عبادت رہے، اس کے بعد فیضانِ الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا،

حاملِ قرآن کی پیروی اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیا علیہم السلام کے ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے، یہودی بھی حضرت موسیٰؑ کی پیروی مین، ہم دنون کا روزہ مناسب اور صرف چالیسوین دن کا روزہ فرض سمجھتے ہین، عیسائیون کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی تقلید اور پیروی مین یہی چاہئے تھا، مگر انھون نے پال کی پیروی مین جیسے حضرت عیسیٰؑ کے اور احکام وسنن کی اتباع نہین کی اسکی بھی نہ کی، اسی طرح مسلمانون کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی مین یہ چند دن اسی طرح گذارین، چنانچہ فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ	اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگون پر انکے رسولون
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ،	کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکریہ مین) روزہ
(بقرہ - ۲۳)	فرض کیا گیا تھا، تم پر بھی فرض کیا گیا،

دینِ الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیمِ محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتون نے اپنے اپنے پیغمبرون کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز مین بھلا دیا، محمد رسول اللہ صلعم کی لاکھون اور کرورون امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے، اور اپنے رسول کی پیروی مین وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشون سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے،

شکریہ یہ روزہ انبیا علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہین ہے، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانون پر کیا، شکریہ ہے، اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتابِ الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایتِ روحانی جو ان ایام مین انسانون کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ، اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوجِ کمال

تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے، اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دیئے، اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہمدوش ثریا بنا دیا، قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے،

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ،	اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لئے (فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی
(بقرہ ۔ ۲۳)	اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو،

اس ہدایت ربانی اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکر گذاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں، اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عیدگاہوں میں جاتے، اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں،

تقویٰ روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فرمایا گیا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ	اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ	گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا، تاکہ
تَتَّقُوْنَ، (بقرہ ۔ ۲۳)	تم تقویٰ حاصل کرو،

۱۔ تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجھک معلوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے، اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی

افراط سے پیدا ہوتے ہین، روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن نوجوانون کا علاج جو اپنی مالی مجبوریون کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہین رکھتے، اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہین رکھتے، روزہ بتایا ہے، اور فرمایا ہے کہ "روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے"۔

۲۔ اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ روزہ کی مشروعیت مین ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس مین اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینون مین ایک مہینہ ہر مسلمان کو اسطرح بسر کرنا چاہئے کہ دن رات مین ایک وقت کھانا کھائے، اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ، محتاج اور غریب بھائیون کو کھلا دے، ــــ ان تمام احکام پر نظر ڈالئے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہین، تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع مین روزہ کا بدل غریبون کو کھانا کھلانا، قرار دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبون کو کھانا کھلانا، یہ دونون باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہین، ایسے لوگ جو فطرۃً کمزور، یا دائم المرض یا بہت بڑھے ہین، اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہون ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۝ اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہون، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دین، (بقرہ ع ۲۳)

حج مین اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے،

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (بقرہ ع ۲۴) تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے،

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام مین ادا کرین جس کو تمتع کہتے ہین ان پر قربانی واجب ہے، جو غریبون ہی مین تقسیم کیجاتی ہے، اگر یہ نہ ہو سکے تو،

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۝ (بقرہ ع ۲۴) تو دس روزے رکھین، تین حج مین اور سات گھر آکر،

حج مین جانور کا شکار منع ہے۔ اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اُسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے، جو مِنیٰ لیجا کر ذبح کیجائے۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو،

أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ صِيَامًا ۔ (مائدہ ۔ ۱۳)
یا چند مسکینون کا کھانا یا اسی کے برابر روزے۔

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے، تو اُس پر دس مسکینون کا کھانا واجب ہے، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہوسکے،

فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ، (مائدہ ۔ ۱۲)
تو تین دن کے روزے،

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کرلے، اور پھر اس کی طرف رغبت کرے، تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے، لیکن اگر یہ اس کی قدرت مین نہ ہو،

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، (مجادلہ ۔ ۱)
تو دو مہینے متواتر روزہ،

اور یہ بھی ممکن نہ ہو،

فَإِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا ۔ (مجادلہ ۔ ۱)
تو ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلانا،

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت، صدقہ وخیرات، غریبون کے کھلانے، بلکہ غلامون کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے،

۴ ۔ روزہ ہی امیرون اور پیٹ بھرون کو بتاتا ہے کہ فاقہ مین کیسی اذیت، اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے، اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیون کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقمون سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے، جو خود بھوکا نہ ہو اُس کو بھوک کی، اور جو خود پیاسا نہ ہو اُس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا۔ بقول حافظ ابن قیم سوز جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے، روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ

بیدار کرتا ہے، چنانچہ خود آنحضرت صلعم کا حال یہ تھا، کہ بعض صحابہ کہتے ہین کہ رمضان مین آپ کی سخاوت "بادِ رواں" کی طرح[لہ] ہوتی تھی، اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانون کے ہان اس مہینہ مین غریبون اور فقیرون کی امداد واعانت اور اُن کو شکم سیر کیا جاتا ہے،

۴- انسان گو کتنا ہی نعمت وناز کے گودون مین پلا ہو، اور مال ودولت سے مالامال ہو، تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی، اور سختیون کا خوگر بنائے جہاد کے ہر متوقع میدان کے لئے، بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر اور ضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدانِ جنگ مین بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہین کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے، جو ہر مسلمان کو سال مین ایک مہینہ کرائی جاتی ہے، تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے، اور دنیا کی کشمکش جدوجہد سختی ومحنت کا پوری طرح مقابلہ کرسکے، اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی "صبر" کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہوجائے،

۵- جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کردیتی ہے، اس سے کہین زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریون کا نشانہ بنا دیتا ہے، طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہین، کہ اکثر حالتون مین انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے، مختلف بیماریون کا یہ قطعی علاج ہے، طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ مین ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے، اسلام مین ہفتہ وار مسنون ومستحب روزے بھی ہین، مگر اسی کے ساتھ سال مین ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے، جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہین، ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریون کو دور کردیتا ہے، بشرطیکہ انھون نے از خود کھانے پینے اور افطار وسحور مین بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لیے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے،

[لہ] صحیح بخاری باب بدء الوحی

۶۔ انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتون پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام مین صرف ہو جاتا ہے، اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت مین صرف کیا جا سکتا ہے، اگر ہمیشہ نہین تو کم از کم سال مین ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کیجائے،

۷۔ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے، جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تبخرۂ معدی کی مصیبت سے پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے،

۸۔ روزہ بہت سے گناہون سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اس لئے یہ بہت سے گناہون کا کفارہ بھی ہے، چنانچہ اوپر جہان روزہ اور خیرات کی یکسانی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہین سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہون اور غلطیون کا کفارہ بھی ہے، بلکہ توراۃ مین تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا[1] ہے، اور اسلام مین بھی بہت سے موقعون مین یہ کفارہ بتایا گیا ہے، چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اسکو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینون کو کھانا کھلائے، اگر اسکی سکت نہ ہو

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ	تو تین دنون کے روزے یہ تمھاری قسمون کا
اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ	کفارہ ہے، جب قسم کھا بیٹھو، اور اپنی قسمون کا
(مائدہ — ۱۲)	لحاظ رکھو،

اسی طرح حج کی حالت مین شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینون کو کھانا نہ کھلایا جا سکے تو

اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ	یا اس کے برابر روزہ، تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا

[1] احبار ۱۶ - ۳۰ سے ۳۴ تک و ۲۳ - ۲۷،

اَمۡرٍ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ، (مائدہ - ۱۳) پچھلے، اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا،

علیٰ ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خونبہا یعنی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو،

فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کے لئے دو مہینے

(نساء - ۱۳) کے لگاتار روزے،

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے،

۹- اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائیگی، روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو، تھوڑی دیر کے لئے سرد کر دیتا ہے، کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل و دماغ، شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں، ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے، یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیتِ خاطر، یہ جذبات کا سکون، ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر، اور اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی بازپرس سے ڈر کے لئے بالکل موزوں ہے، اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے، اور نیکی اور نیک کاموں کے لئے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے، یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمامتر عبادتوں اور نیکیوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، اس میں تراویح ہے، اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے، اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے، اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی، لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی،[1]

---

[1] صحیح بخاری باب الوحی جلد اول صفحہ ۳،

۱۰- انہین باتون کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہین ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی موقع غرض وغایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض وغایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہئے کہ گویا روزہ ہی نہین رکھا گیا، یا یون کہنا چاہئے کہ جسم کا روزہ ہو گیا، لیکن روح کا روزہ نہ ہوا، اسی کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان الفاظ مین فرمائی ہے، کہ روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہین ہے، کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے[1]؛ ایک اور حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا "روزہ برائیون سے روکنے کی ڈھال ہے، تو جو روزہ رکھے اُسکو چاہئے کہ لغو اور فحش باتین نہ بکے، اور نہ جہالت (غصہ) کرے، یہانتک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو، اور گالی بھی دے، تو یہی کہے کہ مین روزہ سے ہون[2]؛ بعض حدیثون مین ہے کہ آپ نے فرمایا "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے، جب تک اس مین سوراخ نہ کر دے[3]، صحابہ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ اس مین سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے، فرمایا "جھوٹ اور غیبت سے[4]" چنانچہ بعض علماء کی رائے مین جسطرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے[5]؛

۱۱- تمام عبادات مین روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لئے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمایش سے بری ہے، جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسرون پر اس کا راز افشا نہین ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے،

۱۲- اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ۲۵۵، و ترمذی باب الصوم ص ۴۰۰، و ابو داؤد صوم ص ۲۳۶ و ابن ماجہ صوم ص ۱۲۲،
[2] صحیح بخاری صوم جلد اص ۲۵۲، صحیح مسلم صوم، جلد اص ۲۴۷ مصر و موطا امام مالک صوم ۹۷، نسائی ۳۵۵، [3] سنن دارمی صفحہ ۲۰۰، مجمع الفوائد بحوالہ نسائی صفحہ ۱۵۲ میرٹھ، [4] مجمع الفوائد بحوالہ طبرانی فی الاوسط صفحہ ۱۵۲ میرٹھ،
[5] فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۸۸،

لئے اپنا کھانا پینا اور ملذذات کو چھوڑتا ہے، اس لئے۔

الصوم لی وانا اجزی بہ[1]۔ روزہ میرے لئے ہے اور میں اسکی جزا دونگا،

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے، لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا، اور بعض علمائے کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے،

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی،

(زمر-)

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لئے روزہ دار بھی "صابرین" کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہونگے۔

۱۳ - روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے، اسی لئے مشکلات کے حل کرنے کے لئے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے،

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ۔ (بقرہ-۵) اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیونکہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اسلئے اسکی مہارت اور مشق کے لئے شریعت نے روزہ رکھا ہے۔ اسی لئے اس آیتِ بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لئے گئے ہیں[2]،

۱۴ - یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنہ میں ہے جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطا پوشی، گناہوں کی معافی، اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے،

---

[1] صحیح بخاری و موطا وغیرہ کتاب الصوم۔ [2] تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱ ص ۱۹۹، مصر۔

...... وَالصّٰٓىِٕمِيْنَ وَالصّٰٓىِٕمٰتِ	.... اور روزہ دار مرد اور روزہ دار
وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ	عورتین، اور اپنی شرمگاہون کی حفاظت کرنے والے
اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ	اور حفاظت کرنے والی عورتین، اور خدا کو زیادہ
مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ،	یاد کرنے والے اور یاد کرنے والی عورتین، انکے
(احزاب - ۵)	لئے اللہ نے تیار رکھی ہے، معافی اور بڑی ہی مزدوری

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادّی جرائم کا کفارہ ہے، اسی طرح ہمارے روحانی گناہون کا بھی کفارہ ہے ،

حج

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ۔ (آل عمران-۱۰)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن، اور انسان کی خداپرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ اس کے لفظی معنی "قصد اور ارادہ" کے ہیں، اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد وارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے، لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جاکر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے،

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی، اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختصر سی آبادی بنی، پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی، اس سے ترقی کرکے اس نے ایک قوم اور ایک ملک کا قالب اختیار کیا اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھاگئی،

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت ابراہیم خلیل کے عہد میں ایک خاص خاندان کا تبلیغی مستقر بنا، پھر حضرت اسمٰعیل کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصر سی آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا، پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کرلی، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا،

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصور احاطہ میں دو خاص باعظمت مکان بنائے جاتے تھے، ایک اُس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ، اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا، عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی، اور اسی محافظ دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی، اس کے معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا، نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداوارین اس میں جمع ہوتی تھیں، اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا،[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا، جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی، یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی، حضرت ابراہیم نے نبوت پا کر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو اس کے لئے تکلیفیں دیں، اور بالآخر ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی، یہ تمام وہ مقامات تھے، جنہیں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی، اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں، آثار، قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی، اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں، اور شام و فلسطین گئی تھیں، اور مصر میں ہکسوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں[2]،

حضرت ابراہیم نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رخ کیا، اور بحرمیت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا، اپنے بیٹے حضرت اسحاق کو کنعان (فلسطین) میں بسایا، اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جس کو ان کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں، اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسمٰعیل کی سکونت مقرر کی

[1] توراۃ اور بابل، کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد ملیں گے، اور میری تصنیف ارض القرآن میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں، [2] میری تصنیف ارض القرآن جلد اول میں اس پر مفصل بحث ہے۔

یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی جس پر سے مصر و شام سے حجاز و یمن، اور حجاز و یمن سے مصر و شام آنے جانے والے تاجرون، سوداگرون اور قافلون کا تانتا لگا رہتا تھا،

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے دو مقصد تھے، ایک یہ کہ تجارتی قافلون کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان کے ملنے مین تکلیف نہ ہو، اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری مین بہ آسانی شریک ہو سکے، اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کی تبلیغ کے لئے قومون کے یہ گذرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے یہان وہ عراق و شام کی جبار و قہار قومون کے حدود سے جو مشہور بت پرست، اور ستارہ پرست تھین علٰحدہ رہکر لوگون مین دین حق کو پھیلا سکتی تھی،

بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ جہان کہین ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آیا، وہان خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کرکے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے، چنانچہ تورات کتاب پیدائش مین ان کی تین قربانگاہون یا "خدا کا گھر" بنانے کے واقعات مذکور ہین،

"تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دیکے کہا کہ یہی ملک مین تیری نسل کو دونگا، اور اس نے وہان خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہان سے روانہ ہو کے اس نے **بیت ایل** (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا بیت ایل اس کے پچھم اور عئی اس کے پورب تھا، اور وہان اس نے خدا کے لئے ایک قربانگاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا" (۱۲-۷، ۸)

اس کے بعد ہے،

"اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت ایل مین اس مقام تک پہنچا، . . . . جہان اس نے شروع مین ایک قربان گاہ بنائی اور وہان ابراہیم نے خدا کا نام لیا، (۱۳-۴)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہان ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا، اور حکم ہوا،

"اٹھ اور اس ملک کے طول و عرض مین پھر کہ مین اُسے تجھکو دونگا، اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا

اور ممرے کے بلوطون میں جو حبرون میں ہیں جا رہا، اور وہان ایک قربان گاہ بنائی" (۱۳-۱۷-۱۸)

اسی قسم کی قربان گاہیں، اور خدا کے گھر، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، اور حضرت موسیٰؑ نے بھی بنائے اور آخر حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کی جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا، حضرت اسحاقؑ کے حال میں ہے، کہ جہان ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی،

"اور اس نے وہان مذبح بنایا، اور خداوند کا نام لیا، اور وہان اپنا خیمہ کھڑا کیا، اور وہان اسحاقؑ کے نوکرون نے کنوان کھودا" (پیدائش ۲۶-۲۵)

حضرت یعقوبؑ کو جہان مقدس رویا ہوئی، وہان،

"اور یعقوب صبح سویرے اٹھا، اور اس پتھر کو جسے اُس نے اپنا تکیہ کیا تھا، کھڑا کیا، اور اس کے سرے پر تیل ڈالا، اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا، اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا، اور سب میں سے جو تو مجھے دیگا، دسوان حصہ (عُشر) تجھے (خدا کو) دونگا" (۲۸-۱۸-۲۲)

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے،

"اور اگر تو میرے لئے پتھر کی قربانگاہ بنائے، تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو، کیونکہ اگر تو اس کے لئے اوزار لگائے گا تو اُسے ناپاک کریگا، اور تو میری قربان گاہ پر سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو، تاکہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو" (خروج ۲۰-۲۵-۲۶)

حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم کے بموجب،

"اور پہاڑ کے تلے ایک قربانگاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقون کے لئے بارہ ستون بنائے . . . . . . اور سلامتی کے ذبیحے بیلون سے خداوند کے لئے ذبح کئے اور موسیٰ نے آدھا خون لے باسنون میں رکھا، اور آدھا قربانگاہ پر چھڑکا" (خروج ۲۴-۴-۶)

اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح، قربانگاہ) بتایا گیا ہے، اور دوسرا

بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی نسل مین اس قسم کی قربانگاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ مین، کعبہ، مسجد حرام، اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے، بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا مین خدا کا پہلا گھر ہے،

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کے شرائط

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ مین یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآنِ پاک کے بموجب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراۃ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے، اور یہ بحث بھی وہین گذر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراۃ کے محاورہ مین یہ مقصود ہے کہ وہ خدا کی عبادتگاہ کی خدمت کے لئے نذر کر دیا جائے، وہ نذر کردہ، جانورون پر ہاتھ رکھدیتا تھا، اور وہ جانور اس کی طرف سے قربانی کئے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادتگاہ کی خدمت کے لئے نذر کئے جاتے تھے، وہ نذر کے دنون مین سر نہین منڈاتے تھے، جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تب اُن کا سر مونڈا جاتا تھا، جو قربانی یا نذر پیش کیجاتی تھی وہ پہلے قربانگاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی، اس کے بعد وہ قربانی کیجاتی یا جلائی جاتی تھی،

ملتِ ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے،

توراۃ اور قرآنِ پاک دونون سے یہ ثابت ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی، اور یہی قربانی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی، اور اسی امتحان اور آزمایش مین پورے اترنے کے سبب سے وہ اور اُن کی اولاد ہر قسم کی نعمتون اور برکتون سے مالامال کیگئی، توراۃ کی کتاب پیدایش مین ہے، (۲۲-۱۶-۱۷-۱۸)

> "خداوند فرماتا ہے، اس لئے کہ تو نے ایسا کام کیا، اور اپنا بیٹا ہان اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا مین نے اپنی قسم کھائی کہ مین برکت دیتے ہی تجھے برکت دونگا، اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستارون اور دریا کے کنارے کے ریت کے مانند بڑھاؤنگا، اور تیری نسل اپنے دشمنون کے دروازہ پر قابض ہوگی، اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائیگی، کیونکہ تو نے میری بات مانی"

قرآن پاک مین ہے،

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، (بقرہ – ۱۵)	اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتون مین اسکی آزمایش کی، پھر اس نے ان کو پورا کیا، تو خدا نے اس سے کہا، کہ مین تجھ کو لوگون کیلئے پیشوا بنانے والا ہون،
وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ. اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (بقرہ – ۱۶)	اور ہم نے ابراہیم کو دنیا مین چنا اور وہ آخرت مین یقیناً نیکون مین سے ہے، جب اس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے کو سپرد کردے، اس نے کہا مین نے اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کردیا،
یٰٓاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ، (صفت – ۳)	اے ابراہیم تونے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم یونہی اچھے کام کرنے والون کو بدلہ دیتے ہین،

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن مین پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہین،

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ	خدایا تو محمد اور محمد کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کر، جس طرح تونے ابراہیم اور ابراہیم کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کی،

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ مین تھی، یہ اپنے عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا جس کو پورا کئے بغیر دنیا کی "پیشوائی" اور آخرت کی "نیکی" نہین ملسکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کردینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشون، تمناؤن اور آرزوون کی قربانی تھی، اور خدا کے

حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا، اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس، اور اس خورشید حقیقت کا ظلِ مجاز تھا،

اسلام قربانی ہے اسلام کے لفظی معنی اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور طاعت اور بندگی کے لئے گردن جھکا دینا ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السّلام کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفۂ محمدی میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا

فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۚ

(صٰفّٰت - ۳)

جب ابراہیم اور اسمٰعیل اسلام لائے، (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسمٰعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا،

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

(بقرۃ - ۱۶)

اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کریگا، لیکن جو خود بیوقوف ہے، ہم نے اس کو دنیا میں مقبول کیا، اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا، جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا، (یا فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے کہا میں نے پروردگار عالم کی فرمانبرداری کی، (یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا)

الغرض ملتِ ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انھوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا، اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے، اور یہی ابراہیمی ملت ہے، اور اسی بارِ امانت کو اٹھانے کے لئے حضرت ابراہیمؑ بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے، کہ ان کی نسل میں اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ

مین موجود رہین، اور بالآخر ان کی نسل مین وہ امین پیدا ہو، جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا پر وقفِ عام کردے، چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی،

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا
أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا
وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو
عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ
وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ،

(بقرہ - ۱۵)

ہمارے پروردگار، ہم کو مسلمان (یا اپنا فرمانبردار) بنا، اور ہماری نسل مین سے ایک مسلمان (یا اپنی فرمانبردار) جماعت بنا، اور ہم کو مناسک (حج کے دستور) بتا، اور ہم کو معاف کر، بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار اس مین اپنا ایک رسول بھیج جو تیری آیتین ان کو پڑھ کر سنائے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے، اور ان کو پاک اور صاف کرے، تو غالب اور حکمت والا ہے،

یہ رسول محمد رسول اللہ صلعم تھے، یہ کتاب قرآنِ پاک تھی، یہ حکمت سینۂ محمدی کا خزانۂ علمی و عملی تھا، اور یہ مناسک اسلام کے ارکانِ حج تھے،

یہ قربانی کہاں ہوئی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی، توراۃ مین اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجمون نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے، اور بلوطون کے جھنڈ، یا بلند زمین اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن محتاط مترجمون نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے، جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانون کے مقابلہ سے ۱۸۹۰ء مین اوکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبع مین چھپا ہے، اس مین اس مقام کا نام "مُریّا" لکھا ہے، اور اس کے فارسی ترجمہ مین جو انہی زبانون کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کیطرف سے ۱۸۸۵ء مین لندن مین چھپا ہے، اس کا تلفظ "موریا" کیا ہے، اور

درحقیقت یہ لفظ مَروہ ہے جو مکہ مین بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے۔ اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے:

"خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم! عرض کرد لبیک، گفت کہ اکنون پسر خود را کہ یگانۂ تست و اورا دوست می داری یعنی اسحاق را بردار و بزمین موریا برو، و اورا در آن جا بر یکے از کوہ ہائیکہ بتو نشان می دہم برائے قربانی سوختنی بگذران۔ بامدادان (صبح) ابراہیم برخاستہ الاغ (گدھا) خود را بیاراست و دو نفر از نوکران خود را با پسر خویش اسحاق برداشتہ و ہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شد، و بسوئے آن مکانیکہ خدا اورا فرمودہ بود، رفت، و در روز سوم ابراہیم چشمان خود را بلند کردہ آن مکان را از دور دید، آنگاہ ابراہیم بجادمان گفت شما این جا بمانید، تا من با پسر بد انجا رویم و عبادت (دوسرے ترجمون مین سجدہ ہے) کردہ نزد شما باز آئیم۔" (پیدائش ۲۲)

اس عبارت مین اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے، اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلون سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ مین اس پر مختصر بحث گذر چکی ہے، اور ہماری جماعت مین سے، جناب مولنا حمید الدین صاحب مرحوم نے "الرای الصحیح فی من ہو الذبیح" نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل و مفصل لکھا ہے، اس لئے یہان بحث بے محل ہے، بہرحال حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے لئے جو مقام بتایا گیا تھا وہ سرزمین مروہ تھی، وہ اس مقام سے جہان وہ قیام پذیر تھے، چند روز کی مسافت پر تھی، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعتون کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گذرانی جائے وہ کوئی قربانگاہ، اور بیت اللہ ہو، خاص کر اس لئے بھی کہ وہان حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی عبادت کی، اور سجدہ کیا، اور وہ قربانگاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکرون کو یہ کہا جاسکے کہ "مین وہان جاکر عبادت کرکے واپس آتا ہون" یہ خصوصیتین کعبہ کے سوا کہین اور نہین پائی جاتین، اور نہ یہود و نصاریٰ اس کے لئے کسی دوسرے مقام کو ثابت کرسکے، اور نہ اس عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاقؑ کی نسل (بنی اسرائیل) مین موجود تھی، اور نہ ہے، اور نہ بیت المقدس یا مسیح کی

دلادتگاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا نہ اب ہے،

برخلاف اس کے بنواسمٰعیل یعنی اسماعیلی عربون مین اس قربانی اور اُس کے خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزار ہا برس سے محفوظ چلی آتی تھی، اور گو اس مین امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی، یا بعد کی گمراہیون کے سبب سے اس مین بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہوگئی تھی، تاہم اصل شئی باقی تھی، عرب مین بت پرست بھی تھے، ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، منکر بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے، اور یہودی بھی تھے، مگر عربون کے قدیم اشعار سے ثابت ہے، کہ ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکسان اعتراف تھا، یہانتک کہ عیسائی عرب بھی اسی کی قسمین کھاتے تھے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ مین جہان مشرکون کے بتون کی صفین تھین، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ، اور حضرت مریمؑ کی تصویرین بھی تھین[1]،

مکہ اور کعبہ کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ اور اُس کی رحمتون اور برکتون کا "سمت القدم" ہے، وہ ازل سے اس دنیا مین خدا کا معبد، اور خداپرستی کا مرکز تھا، سب بڑے بڑے پیغمبرون نے اس کی زیارت کی، اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتون کی سمت اس کو قرار دیا کہ

اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ . (آل عمران۔۱۰) سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگون کے لئے بنایا گیا،

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیون مین اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمتکدہ مین توحید کا چراغ پھر روشن کیا، تو حکم ہوا، کہ اس گھر کی چار دیواری بلند کر کے، دنیا مین توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق (حج ۴،۴) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ مین بھی اَلْبَیْتِ الْعَتِیْق، (پرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے مل کر اس گھر کی پرانی بنیادون کو ڈھونڈکر، پھر نئے سرے سے ان پر چار دیواری کھڑی کی، فرمایا اِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ. (ابراہیمؑ جب اس گھر کی بنیادین اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی حضرت

---

[1] اخبار مکہ للازرقی، و فتح الباری ابن حجر ذکر ہدم اصنام کعبہ، و سیرۃ ابن ہشام،

ابراہیم و اسمٰعیل نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا، حضرت ابراہیمؑ نے عراق، شام، مصر، ہر جگہ پھر کر، آخر اسی گمنام گوشہ کو منتخب کیا، جو باسطوت جبارون اور بت پرست اور ستارہ پرست قومون کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا مین ہر چار طرف سے پہاڑیون سے گھرا تھا، اس لئے قرآن پاک نے کہا،

وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا۔ (حج-۴)

اور ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا،

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی، البتہ دیوارین بے نشان تھین، تو ہم نے ابراہیم کو اسی گھر کی جگہ بتادی، اور اس کو اُن کی جاپناہ اور ٹھکانا بنا دیا، کہ بت پرستون کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کرین، توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیونکہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا، کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کیجائے وہ کوئی معبد یا قربانگاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہان حضرت ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ کو قربانی کرنے کے لئے لائے تھے، اور جس کے متعلق اپنے خادمون سے کہا تھا، کہ وہان جاکر عبادت کر کے واپس آتا ہون، ضروری ہے، کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لئے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس گھر کی ایجاد نہین بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے، وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (اور میرے گھر کو عبادتگذارون کے لئے پاک و صاف کر) اس وقت تک اس سرزمین کے لئے عرب کا لفظ بھی پیدا نہین ہوا تھا، یہ لفظ تو مجموعہ توراۃ مین حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملتا ہے، اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا، کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت مین واقع تھا، اور کبھی اسکا نام "بیابان" تھا، اور آخر یہی بیابان اس کا نام پڑگیا، لفظ عرب (عربہ) کے اصلی معنی بیابان و صحرا ہی کے ہین[1]، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت یہ فرمایا تھا،

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ۔ (ابراهیم-۶)

خداوندا مین نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی مین لاکر بسایا ہے،

---

[1] اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد مین ہے، از ۷۵ تا ۸۰ طبع اول،

تو حقیقت مین یہ بن کھیتی کی ترائی" اور "بے آب وگیاہ میدان" اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بنگئی، اور اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہان حضرت اسمٰعیلؑ کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی،

وَارْزُقْ اَھْلَہٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ، اور خداوندا یہان کے رہنے والون کو پھلون کی روزی پہنچا، (بقرہ ۱۵—۱۵)

"مکہ" قدیم زبانون کے بعض محققون کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے، جس کے اصلی معنی گھر کے ہین[1]، اس سے دو حقیقتین ظاہر ہوتی ہین، ایک تو یہ کہ یہ آبادی اُس وقت قائم ہوئی جب بابل وکلدان کے قافلے ادھر سے گذرتے تھے، اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود مین آئی، اور یہ اس خانۂ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے، مکہ کا بکہ نام حضرت داؤدؑ کی زبور مین سب سے پہلے نظر آتا ہے، پہلی جلد کے مقدمہ مین اس کا حوالہ گذرچکا ہے، یہان یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان مین "بک" کے معنی آبادی یا شہر کے ہین، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے، (یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے، اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک مین آیا ہے،

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ، (آل عمران—۱۰) پہلا گھر جو لوگون کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہ وہی ہے جو بکہ مین ہے،

کعبہ کے لغوی معنی چوکھونٹے کے ہین، چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا، اور اب بھی اسی طرح ہے، اس لئے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا،

---

[1] تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان صفحہ ۲۴۴، مصر،

یونانی تاریخون مین بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گذرا ہے، وہ عرب کے ذکر مین کہتا ہے،

"ثمودیون اور سباوالون کے درمیان ایک مشہور معبد ہے، جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہین[1]"

ثمود کا مقام شام و حجاز کے حدود مین تھا، اور سبا کا یمن مین، ظاہر ہے کہ ان دونون ملکون کے درمیان حجاز ہی ہے، اور وہان کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہون خانۂ کعبہ ہے، رومیون کی تاریخ مین بھی خانۂ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پروکوپس مؤرخ لکھتا ہے، کہ ۵۴۱ء مین رومی سپہ سالار بلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسرون کا ایک جلسۂ مشاورت کیا، اس مین شام کے دو افسرون نے اٹھ کر کہا کہ وہ آیندہ لڑائی مین شریک نہین ہو سکتے، کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دیگا، اس پر سپہ سالار نے کہا،

"تمھارا یہ خطرہ صحیح نہین ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس مین عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لئے خاص کرتے ہین، اور اس زمانہ مین ہر قسم کے ہتھیارون سے وہ پرہیز کرتے ہین[2]"

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے،

ان تمام شہادتون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسمٰعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے، اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کیساتھ باقی رکھے ہوئے تھے، جاہلیت کے اشعار مین حج اور ارکان حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے[3]، یہانتک کہ عیسائی عرب شعرا بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے، عرب کے بازارون اور میلون کی روایات کے قائم رکھنے مین بھی اس موسم حج کا اچھا خاصہ حصہ تھا[4]، اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشون مین یہانتک کہ

---

[1] گبن کی تاریخ عروج و زوال روم باب ۵۰،

[2] نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام، محمود پاشا فلکی مطبع امیریہ بولاق مصر صفحہ ۳۵ بحوالہ (فرنچ) ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۵۸ء

[3] مولٰنا حمید الدین صاحب نے اپنی تصنیف الامعان فی اقسام القرآن مین اس قسم کے اشعار جمع کر دیئے ہین،

[4] کتاب الازمنہ والامکنہ امام مرزوقی طبع حیدرآباد جلد دوم صفحہ ۱۶۱ باب ۴۰،

یمن و بحرین تک مین پہنچنے مین کامیابی ہوئی، کیونکہ حج کے موسم مین عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی مین اس پرانی رسم کو ادا کرنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے،

حج ابراہیمی یادگار ہے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا، اور اُس پر لبیک کہا تھا، اور جس کی تعمیل کے لئے وہ اس دور دراز مقام مین آئے تھے، اور عین اُسوقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ مین قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سُن گردن جھکا دی تھی، تو آواز آئی تھی،

أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا	یہ کہ اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم
إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۔۔۔۔	ایسا ہی نیکوکارون کو بدلہ دیتے ہین،۔۔۔۔
وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (صفّت - ۳)	اور ایک بڑی قربانی دیکر ہمنے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا،

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کیلئے مخصوص کر دینا، اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرۂ ارضی مین خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے،

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ	اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگون کا مرجع اور
وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ	امن بنایا، اور دکھاکہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی
مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ	جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ، اور ابراہیم و اسماعیل سے عہد
أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ	لیا کہ تم دونون میرے گھر کو طواف اور قیام اور
وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ	رکوع اور سجدہ کرنے والون کے لئے پاک کرو، اور
اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ	یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار اسکو
مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ	امن والا شہر بنا، اور اس کے بسنے والون کو کچھ
الْآخِرِ ۖ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا	پھلون کی روزی دے، جو ان میں سے خدا اور
ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ	پچھلے دن پر ایمان لائے، خدا نے کہا اور جس نے

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً
مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ
عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ
وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا
مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ
فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ
اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ
لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

(بقرہ - ۱۵ و ۱۶)

انکار کیا اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤنگا، پھر اسکو دوزخ
کے عذاب کے حوالہ کردونگا، اور وہ کتنی بری بازگشت
ہے۔ اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسمٰعیل اس گھر
کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا مانگ رہے
تھے کہ) ہمارے رب (ہماری اس تعمیر کو) ہم سے
قبول فرما، بیشک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے
اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا ایک تابعدار (مسلم)
فرقہ بنا، اور ہم کو اپنے حج کے ارکان دکھا، اور ہم پر
اپنی رحمت سے رجوع کر، (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ
قبول کرنے والا اور رحم والا ہے۔ اے ہمارے رب!
ان میں، انھیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج
جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب
حکمت کی تعلیم دے، اور ان کو پاک و صاف بنائے
بیشک تو غالب اور دانا ہے۔ اور ابراہیم کے دین سے
کون منہ پھیریگا، بجز اس کے جو اپنے آپکو نادان بنائے
حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا، اور
آخرت میں وہ نیکوکاروں میں سے ہوگا، یاد کرو
جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابعدار (مسلم)
بن جا، اس نے کہا عالم کے پروردگار کا میں تابعدار

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ
اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ
لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ
وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا
وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ
لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ
اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ
مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا
وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ثُمَّ لْيَقْضُوْا
تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا
بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ
حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ
کو ٹھکانا بنایا، کہ کسی کو میرا ساجھی نہ بنانا، اور میرے
گھر کو طواف قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں
کے لئے پاک کر، اور لوگوں میں حج کا اعلان کردے
وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی)
دُبلی سواریوں پر، ہر دور دراز راستہ سے آئیں گے
تاکہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں، اور ہم نے
ان کو جو چوپائے جانور روزی دئے ہیں، ان پر
ان (کی قربانی) پر چند جانے بوجھے دنوں میں خدا کا نام
لیں. تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر
کو کھلاؤ، اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں، اور
اپنی منتیں پوری کریں، اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں
یہ سُن چکے، اور جو کوئی اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے
تو وہ اس کے لئے اس کے رب کے پاس بہتر ہے،

(حج - ۴)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا
الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ
الْاَصْنَامَ، رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا
مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ
وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی اے میرے
پروردگار اس شہر کو امن والا بنا، اور مجھکو اور میری
اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا، میرے پروردگا
ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے، تو جو میری
پیروی کریگا، وہ مجھ سے ہوگا، اور جو میری نافرمانی

رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ
ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا
لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ
تَهۡوِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ
لَعَلَّهُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ ۔ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ تَعۡلَمُ
مَا نُخۡفِیۡ وَمَا نُعۡلِنُ ؕ وَمَا یَخۡفٰی عَلَی اللّٰهِ
مِنۡ شَیۡءٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ،

(ابراهیم - ٦)

کریگا، تو تو بخشنے والا مہربان ہے، اے ہمارے پروردگار
ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی مین
تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے
پروردگار، یہ اسلئے تاکہ یہ تیری نماز کھڑی کرین، تو کچھ
لوگون کے دلون کو ایسا بنا کہ وہ اُن کی طرف
مائل ہون، اور ان کو کچھ پھلون کی روزی دے
تاکہ یہ تیرے شکرگذار رہین، اے ہمارے پروردگار
تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائین اور جو ظاہر کرین، اور اللہ سے
زمین مین اور نہ آسمان مین کچھ چھپا ہے،

قُلۡ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ
حَنِیۡفًا ؕ وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۔ اِنَّ
اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّةَ
مُبٰرَکًا وَّهُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۔ فِیۡهِ اٰیٰتٌۢ
بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِیۡمَ ۚ وَمَنۡ دَخَلَهٗ
کَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ
مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡهِ سَبِیۡلًا ؕ وَمَنۡ
کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ،

(آلِ عمران - ١٠)

کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے دین کی پیروی
کرو، شرک سے منہ موڑ کر، اور ابراہیم مشرکون مین
نہ تھا، بیشک وہ پہلا گھر جو لوگون کے لئے بنایا گیا
وہی ہے جو بکہ مین ہے، بابرکت، اور دنیا کیلئے
راہ نما، اس مین کچھ کھلی ہوئی نشانیان ہین، ابراہیم
کے کھڑے ہونے کی جگہ، اور جو اس مین داخل ہو
وہ امن پا جائے، اور خدا کا لوگون پر اس گھر کا
قصد کرنا فرض ہے، جسکو اس کے راستہ (سفر) کی طاقت
ہو، اور جو (اس قدرت کے باوجود) اس سے باز
رہے تو خدا دنیا والون سے بے نیاز ہے،

یہ وہ آیتین ہین، جنکا تعلق اس موضوع سے ہے۔ ان مین نہایت وضاحت کیساتھ یہ بیان کیا گیا ہو کہ ہم نے ابراہیمؑ کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکون سے ہٹا کر جنمین وہ سرگردان اور آوارہ پھر رہے تھے، اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش مین تھے، تاکہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لئے ایک گھر بنائین، یہ ٹھکانا عنایت کیا۔ جو ازل سے اس کام کے لئے منتخب تھا، تاکہ وہ یہان خدا کے گھر کی منہدم چار دیواری کو کھڑی کرین، اور پھر اسکو توحید کا مرکز اور عبادت گذارون کا مسکن بنائین،

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ خداوندا! یہان تیرے مقدس گھر کے پڑوس مین اپنی کچھ اولاد بساتا ہون، اُن کو روزی پہنچانا، اور لوگون کے دلون کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہین، اور ان کو اس لئے یہان بساتا ہون تاکہ وہ اُس پاس کی بت پرست قومون کی بُت پرستی سے بچے رہین اور تیری خالص عبادت بجالائین، ان مین جو نکوکار ہون وہ میرے ہین، اور جو بدکار اور گمراہ ہون، ان کا تو مالک ہو، تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے، اور خداوندا! میری اولاد مین ایک رسول بھیجنا، جو اُن کو نیک تعلیم دے،

قرآن کا دعوی ہے کہ اس مقام اور اس گھر مین حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیان ہین، اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے، اس لئے لوگون کو چاہئے کہ دور دور سے یہان آئین اور اپنے دینی و دنیاوی فائدون کو حاصل کرین، اور اس قدیم خانۂ خدا کا طواف کرین، اور یہان اسمٰعیلؑ کی یادگار مین قربانی کرکے غریبون کو کھلائین، اپنی نذر پوری کرین، اور اس حالت مین وہ امن و سلامتی کے مجسم پیکر ہون، نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہون، نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہون، اور وہ اس حالت مین ظاہری زیبایش و آرایش اور عیش و آرام اور پرتکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہون، اور چندروز یہان ابراہیمی یادگارون پر ٹھہر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کرکے، ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کرین،

اوپر توراۃ کے حوالون سے گذر چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد کا دستور تھا، کہ وہ جہان

انھین کوئی نمایانی کرشمہ دیکھتے تھے، تمدّن کے اس ابتدائی عہد مین کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھڑے پتھر کو کھڑا کرکے خدا کا گھر بنا لیتے، وہان قربانی گذرانتے، اور خدا کی عبادت کرتے تھے، اسی قسم کا گھر یہ خانۂ کعبہ تھا، یہ بھی توراۃ کے حوالون سے گذر چکا ہے، کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لئے جو شخص نذر کیا جاتا تھا، وہ اتنے دنون تک سر نہین منڈاتا تھا، نذر پوری کرلینے کے بعد وہ سر پر استرہ لگاتا تھا، پھر جہان یہ مذکور ہے کہ "اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو"[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے، اور کمر مین تہ بند باندھتے تھے، توراۃ کے فارسی اقتباس مین جو اوپر نقل ہوا ہے مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لئے آواز دی تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب مین "لبیک" کہا اور اردو مین ہے کہ "مین حاضر ہون" کہا، یہی صدا لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ اسلامی حج مین اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے، یہ بھی گذر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے، اس کو قربانگاہ کے چارون طرف پھراتے تھے، یا نثار کرتے تھے، حج مین یہ طواف کہلاتا ہے، غرض انھین سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام مین "حج" ہے،

حج کی حقیقت ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتون اور برکتون کے مورد خاص مین حاضری، حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا، اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے، یعنی ان دو برگزیدہ بندون کی پیروی مین اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم ورضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاہدہ کو اور عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجا لانا جس طرح وہ ہزارون برس پہلے بجا لائے، اور خدا کی نوازشون اور بخششون سے مالا مال ہوئے، یہی ملتِ ابراہیمی، اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے، جس کو حاجی ان بزرگون کے مقدس اعمال اور قدیم دستورون کے مطابق حج مین اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کرکے ظاہر کرتے ہین، تمدّن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنون بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہین، وہ خود اپنے کو حضرت

[1] خروج ۲۰-۲۶،

اسماعیلؑ کی طرح خدا کے حضور مین نذر کرنے جاتے ہین، اس لئے اتنے دنون تک سر کے بال نہ منڈاتے ہین، نہ ترشواتے ہین، دنیا کے عیش ونشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہین، نہ خوشبو لگاتے ہین، نہ رنگین کپڑے پہنتے ہین، نہ سر چھپاتے ہین، اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام تین دن کے سفر کے گرد وغبار مین اٹے ہوئے، دوڑے ہوئے خدا کے گھر مین آئے تھے، آتے ہین، اور جس طرح حضرت ابراہیم نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ اُن کی زبانون پر ہوتا ہے،

لبیك اللھم لبیك، لبیك لا شریك	مین حاضر ہون اے اللہ مین حاضر ہون، مین
لك لبیك، ان الحمد والنعمة لك	حاضر ہون تیرا کوئی شریک نہین، سب خوبیان
والملك لك۔	اور سب نعمتین تیری ہی ہین، اور سلطنت تیری
(صحیح مسلم حج)	ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہین،

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ، اور یہ توحید کی صدا، ان تمام مقامات اور حدود مین بلند کرتے پھرتے ہین، جہان جہان ان دونون بزرگون کے نقشِ قدم پڑے تھے، اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربانگاہ پر نذر کرنے چلتے ہین، اسلئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چارون طرف پھرا کر تصدق کرتے ہین، پھر جہان سے جہان تک (صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیم دوڑ کر گئے تھے، کہ مروہ پر پہنچکر بیٹے کی قربانی کرینگے، وہان ہم دوڑتے ہین، اور دعا کرتے ہین، اور گناہون کی بخشائش چاہتے ہین، اور عرفات کے سب سے بڑے میدان مین جمع ہو کر، اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہون اور کوتاہیون کی معافی چاہتے ہین، خدا کے حضور مین گڑگڑاتے ہین، روتے ہین، قصور معاف کراتے ہین، اور آئندہ زندگی کے لئے، خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہین، اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے[1]، یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد، ان بزرگون کے نقشِ قدم اور

[1] ترمذی کتاب الحج باب ما جاء من ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج،

ان کی دعا، کے مقامات، اور تجلیاتِ ربّانی کے مناظر، دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد، اکثر دن کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع، اور لاکھوں بندگانِ خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس اور شکل وصورت، ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب وگیاہ اور خشک میدان، اور جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہوکر، دعا، ومغفرت کی پکار، گذشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی بدکاریوں کا اقرار، اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیمؑ خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاؑ، اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہوئے تھے، ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی، پھر اپنی نذر کے دن پورے کرکے، اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں، اور اس وقت اسی اطاعت، اسی فدویت، اسی سرفروشی، اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں، جو کبھی اسی میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت، اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعیِ توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی، اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور اُن کی زبانوں سے حضرت ابراہیمؑ ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (صحیح مسلم کتاب الحج)

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ	میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ
وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ	کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، موحد
(انعام - ۹)	بنکر اور میں اُن میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔
اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ	میری نماز اور میری قربانی، اور میرا جینا اور میرا مرنا
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ لَا شَرِیْكَ لَهٗ	سب اللہ کے لئے ہے، جو تمام دنیا کا پروردگار ہے،
وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ	اس کا کوئی شریک نہیں، اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے اور

مین سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام) کا اقرار کرتا ہون (انعام - ۲۰)

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہین،

حج کی اصلاحات حج کی فرضیت دوسرے عبادات سے بالکل مختلف تھی، عام اہل عرب نماز کے اوقات، ارکان اور خصوصیات سے عملاً نابلد تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعلیم دی، اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان مین سرے سے موجود نہ تھی، اس لئے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلین طے کرنی پڑین، روزہ نے بھی یوم عاشورا سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدلے، لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا جس کے تمام اصول وارکان پہلے سے موجود تھے، صرف ان کا محل اور طریقۂ استعمال بدل گیا تھا، یا اُن مین بعض مشرکانہ رسوم داخل ہوگئے تھے، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ یک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا،

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱- ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الٰہی، طلب مغفرت اور اعلاے کلمۃ اللہ ہے، لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنا لیا تھا، چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکتے تھے، تو تمام قبائل منیٰ مین آکر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصہ تھا، اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی موقع نہین مل سکتا تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آبا و اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۔

جس طرح اپنے باپ دادون کا ذکر کرتے ہو، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو،

(بقرہ - ۲۵)

۲- قربانی کرتے تھے، تو اس کے خون کو خانۂ کعبہ کی دیوارون پر لگاتے تھے، کہ خدا سے تقرب

حاصل ہوجائے، یہود میں بھی یہ رسم تھی، کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربانگاہ پر دیتے تھے، اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹا دی گئیں، اور یہ آیت اتری،

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ، (حج-۵)	خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے،

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کیجائے، اور اس خرچ برابر کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے،

۳- اہل یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے، تو زادِ راہ لے کر نہیں چلتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے، تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی، (بقرہ-۲۵)	زادِ راہ ساتھ لے کر چلو، کیونکہ بہترین زادِ راہ پرہیزگاری ہے،

۴- قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کرئے تھے، ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تھے، اس غرض سے خانۂ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا، جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے، ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبۃً للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا، اور مرد مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو خاص طواف کے لئے کپڑا استعار دیتی تھیں، اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے، لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے، ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا، اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا، اور یہ آیت اتری،

لہ بخاری جلد ا صفحہ ۲۰ کتاب الحج سلہ طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت حمزہ سید الشہداء سلہ بخاری جلد ا صفحہ ۲۲۶ کتاب الحج،

خُذُوا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف-۳) ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

اور ۹ھ کے موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو اس اعلان کے لئے بھیجا کہ آیندہ کوئی ننگے ہو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت سے یہ رسم[1] اٹھ گئی،

۵- قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے لیکن وہ خود حدود حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا، چنانچہ یہ آیت[2] اتری

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (بقرہ-۲۵) کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں

۶- صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے، اس سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گذرتے تھے، اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پا گئی تھی، لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا[3]، یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی،

۷- جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اُس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے، اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلوں میں ہوتا ہے، شور وغل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی، غرض فسق وفجور کا ہر تماشہ وہاں ہوتا تھا، اسلام آیا تو اس نے یکلخت ان باتوں کو بند کر دیا، اور حج کو تقدس، تورع، نیکی، اور ذکر الٰہی کا سرتاپا مرقع بنا دیا، حکم آیا،

فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا	پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج
فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا	میں عورت سے چھیڑ چھاڑ ہے، نہ فحاشی ہے، نہ لڑائی دنگا
مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (بقرہ-۲۵)	ہے اور تم جو نیکی کرو گے اللہ کو معلوم ہوگی،

[1] صحیح بخاری کتاب الحج باب لا یطوف عریان، [2] بخاری کتاب الحج جلد اول ص ۲۲۶ [3] بخاری جلد ا صفحہ ۵۴۳،

۸۔ مناسکِ حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایامِ تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گناہگار ہیں، دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا، جو دیر میں واپس ہوتے تھے، چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گنہگار نہ تھا، اس لئے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا،

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ لِمَنِ اتَّقٰی،	جو شخص عجلت کرکے ایامِ تشریق کے دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ اس نے تقویٰ اختیار کیا،
(بقرہ - ۲۵)	

۹۔ ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا، یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اُس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے، انھوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے[1]،

۱۰۔ خانۂ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے، اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڈھے کو دیکھا، کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ پا جا رہا ہے، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے، ارشاد ہوا کہ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، چنانچہ آپ نے اس کو سواری پر جانے کا حکم دیا[2]، اسی طرح عورتیں خانۂ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھیں، آپ نے ایک بار اسی قسم کی ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا اس کو سوار ہونا اور دوپٹہ اوڑھنا چاہئے[3]، اسی سبب سے قربانی کے لئے گھر سے جو جانور لاتے تھے، اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہیں ہوتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لے جا رہا ہے، فرمایا کہ اس پر سوار ہو لو، اُس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپ نے تین بار اسکو اونٹ پر سوار

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۴۱ [2] ترمذی کتاب النذور والایمان باب فی من یحلف بالمشی ولا یستطیع [3] ترمذی کتاب النذور والایمان

ہونے کی تاکید کی[1]

۱۱- انصار حج کرکے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر مین نہین داخل ہوتے تھے، بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے، اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شخص حج کرکے آیا اور دستور کے خلاف دروازے سے گھر مین گھس آیا، تو لوگون نے اس کو بڑی لعنت و ملامت کی، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا	گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہین ہے، نیکی
وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ	صرف اس کی ہے جس نے تقویٰ حاصل کیا، اور گھرون
مِنْ اَبْوَابِهَا[2] (بقرہ - ۲۴)	مین دروازے کی راہ سے آؤ،

۱۲- بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقون سے ظاہر کرتے تھے، کچھ لوگ ناک مین نکیل ڈال لیتے تھے، اور اس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا، آنحضرت صلعم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے، تو اس کی نکیل کٹوا دی[3]، اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے، اور وہ اس کو طواف کرا رہا ہے، آپ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ[4]، ایک بار آپ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی مین جڑے ہوئے ہین، وجہ پوچھی تو دونون نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کرینگے، آپ نے فرمایا کہ اس شکنجے کو دور کرو یہ نذر نہین ہے، نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو[5]،

۱۳- اہل عرب ایام حج مین عمرہ نہین کرتے تھے، کہتے تھے کہ جب سواریان حج سے واپس آجائین، اور انکی پیٹھ کے زخم اچھے ہوجائین، اس وقت عمرہ جائز ہوسکتا ہے، لیکن رسول اللہ صلعم نے خاص ایام حج مین عمرہ کیا، اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا[6]،

---

[1] بخاری جلد ا ص ۲۲۹ کتاب الحج [2] ایضاً ص ۲۴۲ [3] نسائی کتاب الحج صفحہ ۱۶۴ باب الکلام فی الطواف [4] بخاری کتاب الحج باب الکلام فی الطواف [5] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۳۰۶ [6] صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ ،

١٤- جاہلیت کے زمانہ مین کچھ لوگ تو حج کی نیت کرتے تھے، وہ ان دنون تجارت نہین کرتے تھے، اس کو طریقۂ حج کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لیے آتے تھے وہ حج مین شریک نہین ہوتے تھے، بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے، ان کو حج سے سروکار نہ تھا، وہ عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ بازارون مین جمع ہوکر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے، اسلام آیا تو یہ دونون طریقے الگ الگ جاری تھے، اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے، اور غیر حاجیون کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیون کی بھیڑ ہوتی تھی، بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے جن مین ہر قسم کی برائیان جاری ہوتی تھین، اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا، اور کہدیا کہ تجارت اور بیوپار حج کے تقدس وحرمت کے خلاف نہین، اس لئے یہ دونون فریضے ایک ساتھ ادا ہوسکتے ہین، فرمایا[1]،

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، (بقرہ - ٢٥)

تمھارے لئے یہ گناہ نہین کہ (حج کے زمانہ مین) فضل الٰہی (تجارت) کی تلاش کرو،

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا، حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا، اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہوگیا، اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہوگئی،

١٥- صفا و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہوگئے تھے، انصار مناۃ کا احرام باندھتے تھے جو مشلل مین قائم کیا گیا تھا، اور طواف نہین کرتے تھے، اُنکے علاوہ تمام عرب صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے، خدا نے جب پہلے خانہ کعبہ کے طواف کا حکم دیا اور صفا و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہین ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت صلعم سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]

[2] صحیح بخاری کتاب الحج جلد اول صفحہ ٢٢٣

[1] اس آیت کے شان نزول مین روایتین مختلف ہین، کچھ روایتون سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب حج مین تجارت کرنا برا جانتے تھے اس لئے یہ آیت اتری، دوسری روایتون مین ہے کہ اہل عرب ان دنون تجارت کرتے تھے، اسلام جب آیا تو صحابہ نے سمجھا کہ اب حج خالص خدا کے لئے ہوگیا، اسلئے اب اس مین تجارت مناسب نہین، یہ آیت اس خیال کی تردید کے لئے اتری، لیکن تمام روایتون کے جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہے جو اوپر متن کتاب مین لکھی گئی ہے، اور روایتون کے جمع کرنے سے اسکی تصدیق ہوتی ہے، (دیکھو تفسیر طبری و اسباب النزول واحدی مین آیت مذکور)

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۔ (بقرہ - ۱۹)

صفا و مروہ خدا کا شعار ہیں، پس جو شخص حج یا عمرہ کرے، اس کے لئے ان دونوں کا پھیرا لگانا گناہ نہیں ہے،

حج کے ارکان اب اس اصلاح، ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی ان کی تفصیل اور ان کی شرعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں،

احرام - تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا، نماز کے لئے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے، احرام بھی حج کی تکبیر ہے، احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آجاتا ہے، اس لئے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو دنیوی عیش و نشاط، زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں، وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کیلئے کسی جاندار کی جان لینا، بہرحال خود غرضی ہے، بی بی سے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے، سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے، لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی، اس لئے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا، اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے، ایک چادر کمر سے لپیٹ لیجائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لیجائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لئے باہر رہے، یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے، جو اس لئے اس وقت کے لئے پسند کیا گیا تاکہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل وصورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شہنشاہ عالم و عالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے، جو بالکل سادہ، بے تکلف، اور زیب و زینت سے خالی مقرر کی گئی ہے،

طواف یعنی خانۂ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کر دعائیں مانگنا، اس رسم کو ادا کرنا ہے جو

حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربانگاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کیجاتی تھی، چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے، اس لئے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے، اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جسکا ایک ضروری ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ، خداوندا ہم کو دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں نیکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا،

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ خانۂ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو[1] اور حکم ہوا کہ

وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ، (حج-۴) اور اس پرانے گھر کا طواف کریں،

حجر اسود کا استلام، حجر اسود کے لفظی معنی کالے پتھر کے ہیں، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے، جو خانۂ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے۔ خانۂ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا اور بنا، کبھی سیلاب میں بہ گیا، اور کبھی آگ میں جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی، ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا، جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے، (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لئے نکال کرلے گئے، اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے، جس کی طرف رخ کرکے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑیگا، اور اسی لئے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے، اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے، اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لئے وہ ایک نشان

---

[1] ترمذی، نسائی، دارمی ومستدرک حاکم۔

کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہین سینہ سے بھی لگا سکتے ہین، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہین، یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہین، یہ پتھر کہنے کے لئے تو ایک معمولی پتھر ہے، جس مین نہ کوئی آسمانی کرامت ہے، نہ کوئی غیبی طاقت ہے، صرف ایک یادگاری پتھر ہے، مگر ایک مشتاقِ زیارت کی نگاہ مین اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے مقدس لب، یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہین، اور پھر تمام خلفائے راشدین، صحابۂ کرام، ائمۂ اعلام، اکابرِ اسلام اور حکمائے عظام کے ہاتھون نے اس کو مس کیا ہے، اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہین، ہمارے دلون اور آنکھون مین تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے، اور بااین ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہین کہ یہ ایک پتھر ہے جس مین کوئی قدرت نہین اور جیسا کہ بادۂ توحید کے ایک ہشیار متوالے[1] نے اس کو چوم کر کہا "اے کالے پتھر مین خوب جانتا ہون کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن مین اس لئے تجھے بوسہ دیتا ہون کہ مین نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا[2]" الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہین، بلکہ اُس محبت کا نتیجہ ہے، جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی روحانی اولاد کو ہے، ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے، نہ اشارہ کرے تو بھی اس کے ادائے حج مین کوئی نقصان لازم نہین آتا،

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیان تھین، جو گو اب برائے نام رہ گئی ہین، تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہین، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جہان حضرت ابراہیم اپنی سواری کے گدھون اور نوکرون کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسمٰعیل کو لے کر آگے بڑھے تھے، اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب

[1] یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔ [2] صحیح مسلم و ترمذی و مستدرک وغیرہ باب الاستلام،

کی آواز سے رُک گئے، اور اسمٰعیلؑ کی جگہ پر مینڈھا قربانی کیا، بعض روایتون مین ہے، کہ حضرت ہاجرہ حضرت اسمٰعیلؑ کو لے کر جب یہان آئی تھین اور وہ پیاس سے بیتاب ہو گئے تھے، تو حضرت ہاجرہ صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش مین دوڑی تھین، اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ صفا و مروہ کی سعی انہین کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے، بہرحال حج مین پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منھ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہین، پھر اس سے اتر کر دعائین مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہین، وہان بھی دعائین مانگتے ہین، کہ یہ دونون وہ مقامات ہین جہان ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہؑ کو نظر آئے۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ	بیشک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہین، تو جو خانہ کعبہ
حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ	کا حج کرے یا عمرہ کرے، اس پر اس کا پھیرے لگانا
اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ (بقرہ – ۱۹)	گناہ نہین۔

وقوفِ عرفہ۔ عرفات مین نوین ذی الحجہ کو تمام حاجیون کو ٹھہرنا، اور زوال کے بعد سے غروب تک یہان دعا، اور خدا کی حمد مین مصروف رہنا پڑتا ہے، اور اصل حج اسی کا نام ہے، یہان کوسون تک جہان تک نظر کام کرتی ہے، ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس مین کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہون کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہین، یہین جبلِ رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیون کے سامنے خطبۂ عام دیتا ہے، اور اُن کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے، عرفات کے اس وقوف مین ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمایش ہوتی ہے، اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ سورۂ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے، یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مؤثر منظر دلون مین مغفرت اور رحمتِ الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے، ہر شخص کو داہنے بائین، آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے، تو وہ خود اثر مین ایسا ڈوب جاتا ہے، کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہجاتی ہے،

قیامِ مزدلفہ - حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ، اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے، عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے، اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہِ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے، اس لئے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لئے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے دیا تھا، اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعر حرام کہتے ہیں، اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا اسلئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوعِ فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا،

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ	تو جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس خدا
عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ	کو یاد کرو، اور اس کو یاد کرو جس طرح اس نے
وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝	تم کو بتایا، اور تم اس سے پہلے حق کی راہ کو بھولے
(بقرہ - ۲۵)	ہوئے تھے،

منیٰ کا قیام - یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قربان گاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں"[1]۔ رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکانی وسعت حاصل کی، اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی، اور ادھر مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا، اس لئے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لئے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے۔ یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں، یہیں قربانی کی جاتی ہے۔ باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے،

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخاری کیا کرتے تھے، جو اکثر لڑائی جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتی تھی، اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے

---

[1] موطا امام مالک۔ باب ماجاء فی النحر فی الحج،

خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے، اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کے بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف، محبت، مساوات، اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جائے، فرمایا،

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ (بقرہ ۲۵) خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو.

قربانی - یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے، جس میں لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو، اور فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائیں،

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ	اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے
عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ	جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے
فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ (حج ۴)	کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے مارے فقیر کو کھلاؤ.

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں، کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے،

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ	تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ساتھ فائدہ اٹھائے تو
مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ	جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے، جس کو یہ بھی میسر
اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ	نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں، اور سات
(بقرہ - ۲۴)	دن واپس ہو کر،

حلق راس - منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں، یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے، کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے. ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے، تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا، کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈا دیئے جاتے تھے، یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی

لہ تورات قاضی ۱۳ - و گنتی ۶ - ۵ ؎ ابن سعد جزء ثانی قسم اول ص ۳۷ و سیرۃ ابن ہشام ذکر بیر معونہ. واقعہ عمرو ابن امیہ و حجز ناصیہ و عتقہ

کا اقرار و اعتراف ہے، اس لئے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی،

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ، (فتح-۴) — اپنے سرون کو منڈا کر یا بال ترشوا کر،

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ، (بقرہ-۲۴) — اور اپنے سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے،

رمیِ جمار۔ منیٰ ہی کے میدان مین پتھر کے تین ستون کھڑے ہین، کہتے ہین کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو قربانی کے لئے لے چلے تو شیطان نے ان موقعون پر ان کے دل مین وسوسہ ڈالا، انھون نے اس کو یہان رجم کیا، جس کے لفظی معنی کنکریان مارنے کے ہین، اور جو پہلے زمانہ مین لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا، اور اسی لئے شیطان کو "رجیم" یعنی کنکری مارا گیا کہتے ہین، صاحب نظام القرآن کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی، تو چند غدار ثقفی عربون نے اس کی رہنمائی کی، باقی عربون نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا جسکا ذکر سورۂ فیل کی آیت تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ مین ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا، اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے، یہ کنکریون کا پھینکنا اسی تَرْمِیْهِمْ کی سنگ باری کی یادگار ہے، خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریون کو، ان ستونون پر پھینکتے ہین، اور شیطان کے وسوسون سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہین، چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہین ہے[1]، قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ مین اشارہ کیا ہے،

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ-۲۵) — جب سب ارکان ادا کر چکو تو اپنے باپ دادون کو جیسے یاد کرتے تھے، ویسے ہی خدا کو یاد کرو بلکہ اس سے بڑھکر

---

[1] مشکوٰۃ باب رمی جمار بحوالہ دارمی، و ترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح،

اسی رمی جمار پر مراسم حج کا خاتمہ ہوتا ہے،

ان رسوم کی غایت | اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے تاکہ انسانیت کے روحانی دورِ ترقی کا عہدِ آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے، اور ہمارے جذبات و احساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں، اور خدا کی یاد، اپنے گناہوں کی مغفرت، اور آیندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کرکے، تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے،

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا، "کہ کنکری مارنے صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانۂ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے[1]" اور قرآن پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے،

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ (حج-۴) اور تاکہ ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام یاد کرو،

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں، جہاں پہنچکر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں، اور اسی لئے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شَعَائِرُ اللّٰه اور حرمتُ اللّٰه ہے، یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں، اور انھیں شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکانِ حج ہے، سورۂ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے،

وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِندَ رَبِّهِ، (حج-۴)

اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے،

صفا و مروہ کی نسبت ہے،

---

[1] ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم کتاب الحج،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (بقرہ-۱۹) اور صفا اور مروہ خدا کا شعار ہین،

اور سورۂ حج مین فرمایا،

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ، (حج-۴) یہ ہے اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے تو یہ دلون کی پرہیزگاری ہے.

ان آیتون سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے، تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتین وابستہ ہین، اُن کی یاد قائم رہے، اور دلون مین تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا ہے،

حج کے آداب

حج کے لئے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاکبازی، اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو، وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے یہانتک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے، شکار تک اس کے لئے جائز نہین، کیونکہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آشتی اور امن و امان ہوتا ہے،

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ، (بقرہ-۲۵) تو جو ان مہینون مین حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج مین نہ عورت کے ساتھ بے پردہ ہونا اور نہ گناہ کرنا، اور نہ جھگڑا کرنا ہے، اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس کو جانتا ہے،

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (مائدہ-۱) حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت مین،

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہون، اُن کو راستہ مین تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا، کہ یہ اس خانۂ الٰہی کے پاس ادب کے خلاف ہے، تاکہ عرب جیسے بے امن ملک مین ان ڈاکوون اور رہزنون اور بدمعاشون کی وجہ سے قافلون کا آنا جانا نہ رُکے

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والون کو

مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (مائدہ ۱-۱) حلال سمجھو، جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے نکلے ہیں،

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصداً صادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے جسکا نام کفارہ ہے، یعنی اُس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی، یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا، یا اتنا ہی روزہ رکھنا، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ	اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو تو شکار کو
وَأَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا	مت مارو، اور تم میں جو جانکر اریگا تو اس کے مارے
فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ	ہوئے کے برابر بدلہ ہے مواشی میں سے، اسکا فیصلہ
ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ	تم میں سے دو بہتر آدمی کریں، کہ اس کو کعبہ تک
أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ	پہنچا کر قربانی کیجائے، یا اس کے گناہ کا اتارے
صِيَامًا لِيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ،	کچھ محتاجوں کو کھانا کھلانا، یا اسی کے برابر روزے
(مائدہ ۱۳-۱۳)	تاکہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے،

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح و سلامتی، اور امن و آشتی ہے، اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آجاتا ہے،

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے، کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے، اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے، وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لئے کسی بار کی امداد کا محتاج نہیں، بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے، نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفۂ ربانی میں مذکور ہیں،

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے خانۂ کعبہ کی تعمیر اور اسمٰعیلؑ کی نذر اور مکہ مین اُن کے قیام کے سلسلہ مین جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کو جامع ہے، آیئے ان آیتون پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لین،

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا
وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى
وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ
طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَ
الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ
رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ
اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ،

(بقرہ ٢ - ١٥)

اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگون کا مرجع
و مرکز اور امن بنایا، اور ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے
کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیمؑ اور
اسمٰعیلؑ کے یہ ذمہ کیا کہ تم دونون میرے گھر کو
طواف کرنے والون اور کھڑے ہونے والون
اور رکوع کرنے والون اور سجدہ کرنے والون
کے لئے پاک صاف کرو، اور جب ابراہیمؑ نے
کہا، میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا،
اور اس کے رہنے والون کو پھلون مین سے روزی دے

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ
مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ
اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ
اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، رَبَّنَا وَابْعَثْ
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

(بقرہ ٢ - ١٥)

اے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا تابعدار
گروہ بنا، اور ہماری اولاد مین سے کچھ کو اپنا فرمانبردار
گروہ بنا، اور ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا، اور
ہم کو معاف کر، تو بےشک معاف کرنے والا
اور رحم کرنے والا ہے اور ان مین انہین مین
سے ایک رسول بھیجا

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ
اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ

اور جب ہم نے ابراہیمؑ کو اس گھر کی جگہ ٹھکانہ دی
کہ میرا شریک نہ بنانا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والون

لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ،
وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ
عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ
لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا
اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا
رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ

کھڑے ہونے والون، رکوع کرنے والون اور
سجدہ کرنے والون کے لئے پاک وصاف کر، اور
لوگون مین حج کا اعلان کردے، وہ تیرے پاس
پیادہ اور سفر کی ماری دبلی پتلی ہو جانے والی
اونٹنیون پر سوار ہو کر، دور دراز رستہ سے
آئین گے، تاکہ فائدے کی جگہون مین آکر جمع ہون
اور چند مقررہ دنون مین اس بات پر خدا کا نام لین
کہ ہم نے ان کو جانور روزی کئے،

(حج - ۴)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا
الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ
الْاَصْنَامَ، رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا
مِّنَ النَّاسِ، فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَ
مَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، رَبَّنَآ
اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ
ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا
لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ
النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ
الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ،

(ابراہیم - ۶)

جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار اس آبادی کو
امن والی بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے
بچا کہ ہم بتون کی پوجا کرین، میرے پروردگار
ان بتون نے بہت سے لوگون کو گمراہ کیا، تو جنے
میرا کہا مانا وہ مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی
کی تو تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار
مین نے اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کی ترائی مین
تیرے مقدس گھر کے پاس آباد کی ہے، ہمارے
پروردگار، تاکہ وہ نماز کھڑی رکھین، تو لوگون کے
کچھ دلون کو ایسا بنا کہ وہ انکی طرف جھکین، اور انکو
پھلون کی روزی دے تاکہ شکر گذار ہون،

ان آیتون مین حسب ذیل باتون کی تصریح ہے،

۱- خانۂ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع، اور ملتِ ابراہیمی کا موطن و مسکن ہو،

۲- حضرت ابراہیمؑ نے یہان اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گذاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے، اور بت پرست قومون کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے، اور آخر ان مین وہ رسول مبعوث ہو جس کی صفتین ایسی ہون،

۳- یہ لوگ ایک ویرانہ مین جہین کھیتی نہین آباد ہوئے ہین، اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہین کہ تیرے گھر کو آباد رکھین، تو تو اس بے ثمر اور شور زمین مین ان کی روزی کا سامان کرنا، اور لوگون کے دلون کو ان کی طرف جھکانا، کہ وہ ان سے محبت کرین،

۴- حکم ہوا کہ لوگون مین اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستہ سے لوگ لبیک کہین گے تاکہ یہان آکر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کرین، اور چند مقررہ ایام مین خدا کا نام لین،

۵- جو لوگ یہان عبادت اور حج کی نیت سے آئین، خداوندا! تو ان کے گناہ معاف کر، تو بڑا مہربان اور رحیم ہے،

۶- خداوندا! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستہ پر چلے، اس لئے تمام وہ لوگ جو ملتِ ابراہیمی کے پابند ہون، آلِ ابراہیمؑ ہین، اور وہی حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤن اور برکتون کے مستحق ہین،

الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہین جن مین سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہین،

مرکزیت - خانۂ کعبہ اس دنیا مین عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتون اور برکتون کا نقطۂ قدم ہے، یہ وہ آئینہ ہے جس مین اس کی رحمت و غفاری کی صفتین اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعون سے منور کرتی ہین، یہ وہ منبع ہے جہان سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا، اور اُس نے تمام دنیا کو سیراب کیا، یہ روحانی علم و

معرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنون نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشان کیا، یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے، جسمین ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہین، جو مختلف ملکون اور اقلیمون مین بستے ہین، مختلف زبانین بولتے ہین، مختلف لباس پہنتے ہین، مختلف تمدنون مین زندگی بسر کرتے ہین، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات، اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہین، اور ایک ہی قبلہ کو، یا مرکز سمجھتے ہین، اور ایک ہی مقام کو اُمّ القریٰ مان کر، وطنیت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آلِ ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملتِ ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) مین متحد ہو جاتے ہین، اور یہ وہ برادری ہے جس مین دنیا کی تمام قومین اور مختلف ملکون کے بسنے والے، جو وطنیت اور قومیت کی لعنتون مین گرفتار ہین، ایک لمحہ ادھر آن مین، داخل ہوتے ہین جس سے انسانون کی بنائی ہوئی تمام زنجیرین اور قیدین اور بیڑیان کٹ جاتی ہین، اور تھوڑے دن کے لئے عرصۂ حج مین تمام قومین ایک ملک مین، ایک لباسِ احرام مین، ایک وضع مین، دوش بدوش، ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہین، اور ایک ہی بولی مین خدا سے باتین کرتی ہین، یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے، جو انسانون مین جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہین، اس لئے یہ حرمِ ربانی نہ صرف اسی معنی مین امن کا گھر ہے، کہ یہان ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قومون کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہین مٹا دیتا ہے،

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہین کہ قومیت و وطنیت کی تنگنائیون سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد مین داخل ہون، مگر ملتِ ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملتِ محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑون ہزارون برس پہلے اس خواب کو دیکھا، اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لئے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد کی کوشش مین مصروف ہین، مگر خانۂ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آلِ ابراہیم

کے لئے مدت درازسے اس مشکل کو حل کر دیا ہے، لوگ آج دنیا کی قومون مین اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہین، لیکن جہانتک مسلمانون کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا مین قائم ہے، اور اسلام کے علم، تمدّن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے، آج دنیا کی قومین "ہیگ" (ہولینڈ) مین اقوامِ عالم کی مشترکہ عدالتگاہ کی بنیاد ڈالتی ہین، لیکن اس کے فیصلون کو کسی طاقت سے منوا نہین سکتین لیکن مسلمان اقوامِ عالم کے لئے یہ مشترکہ عدالتگاہ ہمیشہ سے قائم ہے، جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے، جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہین

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظمِ حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے، یہ حج کا موسم اُن کی سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا، یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس مین امورِ خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے، اسپین سے لیکر سندھ تک مختلف ملکون کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے، اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے، اور طریقِ عمل طے کرتے تھے، اور مختلف ملکون کی رعایا آکر، اگر اپنے والیون اور حاکمون سے کچھ شکایتین ہوتی تھین، تو ان کو خلیفہ کی عدالت مین پیش کرتی تھی، اور انصاف پاتی تھی،

غالبًا یہی وجہ ہے کہ مسائلِ حج کے فورًا ہی بعد، اللہ تعالیٰ نے ملک مین فساد اور بے امنی کی برائی کی، اور فرمایا

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ، وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ،	بعضے آدمی ایسے ہین کہ اُن کی بات دنیا کی زندگی مین بھلی معلوم ہوتی ہے، اور جو اس کے دل مین ہے اسپر وہ خدا کو گواہ بناتے ہین، حالانکہ وہ پرلے درجہ کے جھگڑالو ہین، اور جب پیٹھ پھیرین تو ملک مین دوڑتے پھرتے ہین، کہ اُسمین بے امنی برپا ہو، اور تاکہ کھیتیان اور جانین تلف ہون، اور اللہ فساد پیدا کرنے کو...
(بقرہ ۲۵-۲۵)	

پھر دو آیتوں کے بعد فرمایا،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ	اے ایمان والو تم سب کے سب امن میں داخل ہو جاؤ
کَآفَّةً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ	اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، کہ وہ تمہارا
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ. (بقرہ-۲۵)	کھلا دشمن ہے،

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بسال دور دراز اقلیموں، ملکوں، اور شہروں میں اُس وقت پھیل سکے، جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا، اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے، اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکہ و تنہا رہا، ۲۲ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیکدفعہ خطاب کیا اور سب نے سمعاً و طاعۃً کہا، آپ کے بعد خلفائے راشدین اور دوسرے خلفائے زمانہ صحابۂ کرامؓ اور ائمۂ اعلام نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے، اور پہنچتے رہتے ہیں،

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ اور عالم، محدث، مفسر، اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نو آبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر آکر یہاں سمٹ جاتے تھے، اور تمام دنیا کے گوشوں سے آکر حرم ابراہیم میں جمع ہو جاتے تھے، اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا میں متفرق و پراگندہ تھا، ابراہیمی درسگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے، یہیں آکر بخارا کا باشندہ، اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے، شامی، عراقی اور مصری حجازی سے، بصری کوفی سے کوفی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے اندلسی، سندھی، (ہندوستان) سے رومی یمنی سے فیض پاتا تھا، اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں، اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی، مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں، اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام

مین پہنچ جاتا تھا، ابن مسعودؓ کے شاگرد ابن عمرؓ اور عائشہؓ کے تلامذہ سے، اور ابن عباسؓ کے مسترشد ابوہریرہؓ کے مستفیدون سے، اور انسؓ کے حلقہ کے فیضیاب علیؓ کے شاگردون سے مستفید و سیراب ہوتے تھے، یہی وہ مرکز تھا، جہان ائمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے، اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنا پر صحابہ کرام اور اُن کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا مین پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات و مغازی اور احکام و فرائض و وصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہوگیا، اور آپ کے سیر و مغازی اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدون ہوکر ہر مسلمان کے سامنے آگئین، اور موطا صحیح بخاری صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود مین آئے، اور ائمہ مجتہدین کے لئے یہ ممکن ہوسکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے امامون کے خیالات و معلومات سے مستفید ہوکر اجماعی مسائل کو الگ کرسکین، اور اس سے پہلے کہ کتابین مدون ہون اور پھیلین ہر ملک اور ہر شہر کے علماء دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات و معلومات سے واقف ہوسکے اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے،

یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکون مین اپنے اپنے حالات مین گرفتار ہین، وہ دور دراز مسافتون کو طے کرکے اور ہر قسم کی مصیبتون کو جھیل کر، دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی، اور صحرا کو عبور کرکے یہان جمع ہوتے، ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہین جس سے ان مین باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے، یہین آکر چینی مراکشی سے، تونسی ہندی سے، تاتاری حبشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روسی الجزائری سے، افریقی یورپین سے جاوی بخاری سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہین،

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے، اتنا

کے رنگ کو پہچاننے، اور سیاسیات کی پیچیدگیون کو سمجھنے لگتا ہے، بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے، اور دنیا کے ہر اُس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے، اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیاے اسلام اور اسلامی ملکون کے حالات و واقعات کے لئے بے چین نظر آتا ہے، پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنی سے ادنی مسلمانون کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملیگی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا، اور خشکی و تری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی، دنیا کے جغرافی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے مین سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے، مسلمانون مین بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گذرے ہین، جنھون نے اصل مین حج کی نیت سے سفر کیا، اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کرلی، یاقوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ مین، مسلمانون مین جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفر حج کو قرار دیا ہے،

رزقِ ثمرات - اس مرکز کو قائم، اور آباد رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس بنجر ویرانے مین بسنے والون کے لئے رزق کا کوئی سامان کیا جاے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی، کہ خداوندا مین نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب و گیاہ سرزمین مین آباد کیا ہے، تو لوگون کے دل اُنکی طرف جھکانا، اور اُن کے رزق کا سامان کرنا، اور اُن کو پھل کی روزی دینا، اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی، کہ یہان کے بسنے والون کے لئے زکوۃ و خیرات کی کوئی رقم خاص کیجاتی، لیکن یہ اُن لوگون کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہوجاتی، وہ لوگون کی نظرون مین ذلیل و خوار ہوجاتے، جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلون مین تجارت کا شوق پیدا کیا، اور اس کو اُن کی روزی کا سامان بنا دیا، حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کا جہان کہین پرانی تاریخون مین وجود نظر آتا ہے، وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس مین ملتی ہے، حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ مین جو حضرت اسمٰعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحاقؑ

کے بیٹے تھے، بنی اسمٰعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے، (تکوین ۲۷-۲۸ سے ۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات میں عرب سوداگرون اور تاجرون کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے، خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے، جس کا ذکر سورۂ "لایلاف قریش" میں ہے، وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام و مصر و روم تک جاتے تھے۔

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنی و اعلی کی شکم سیری کے لئے کافی نہ تھی، اس لئے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا، اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا، کہ یہ دعاے ابراہیمی کا مصداق، اور اس شور و بے حاصل زمین کے بسنے والون کے لئے روزی کا سامان تھا، اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہان آنے لگے، چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہان کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کما لیتے ہین، کہ وہ سال بھر کھا پی سکین، مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے، تو پورے راستہ اور منزلون کے بدو اپنے پھل اور پیدا وارے کر آتے ہین، اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہین، کھانا، پینا، مکان، سواری اور دوسرے ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہین، اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہین، اور آخر یہی زر معاوضہ اہلِ مکہ کے قُوتِ لایموت کا ذریعہ بنتا ہے،

قربانی کی اقتصادی حیثیت اس ملک کی فطری پیداوارون مین اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانورون کی پیداوار ہے، اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہلِ عرب اور اہل بادیہ کے لئے ان جانورون سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا، ہر سال تقریبًا ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہین، جنمین سے بعض کئی کئی کرتے ہین اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانورون سے کم کی قربانی نہین ہوتی، اور عمومًا دنبہ کی قیمت آٹھ روپیے، اور بکری کی چار روپیے وہان ہوتی ہے، تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپیے ہر سال اہل بادیہ کو اپنے

لہ تفصیل اور حوالون کے لئے دیکھو میری تالیف ارض القرآن جلد دوم باب تجارات العرب قبل الاسلام، "س"

جانورون کی فروخت سے ملتے ہین، اور یہ اس بے آب وگیاہ اور ویران ملک کے باشندون کی بہت بڑی مدد ہے۔

ابراہیمی دعا کی مقبولیت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا مین خاص طور سے پھلون کا ذکر کیا تھا،

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ، اور یہان کے رہنے والون کو پھلون مین سے

(بقرہ - ۱۵) روزی دینا،

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازارون مین ہر وقت تازہ سے تازہ پھل میوے سبزی اور ترکاریان نظر آتی ہین، اور دعاے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہین کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے،

تجارت، قرآن پاک کے محاورہ مین خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ مین ہے،

وَلَا آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب والے

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا، گھر کے قصد سے جا رہے ہون اپنے پروردگار کا فضل

(مائدہ - ۱) خوشنودی تلاش کرتے ہوئے،

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہین، کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہوجائیگا، تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے اسلام کے بعد بعض صحابہؓ نے اپنے اس خالص مذہبی سفر مین تجارت وغیرہ کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہین سمجھا، اس پر آیت نازل ہوئی کہ لوگون سے بھیک مانگ مانگ کر حج کرنا اچھا نہین، کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے، بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے، فرمایا۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى اور راہ کا توشہ (خرچ) لیکر چلو کہ راستہ کا

وَاتَّقُوْنِ يَا اُولِي الْاَلْبَابِ، لَيْسَ عَلَيْكُمْ سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے،

جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ — تم پر گناہ نہین ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے) (بقرہ - ۲۵)

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر مین جائز نہین، درست نہ تھا، کہ اوّل تو طلبِ رزقِ حلال مین بجائے خود اسلام مین عبادت اور نیکی کا کام ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد مین ہے، کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی، ترقی اور بقا ممکن نہین یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانۂ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے، جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ یہ مقام گویا مسلمانون کی عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز، اور ممالکِ اسلامیہ کی صنعتون کی سالانہ نمائشگاہ ہے، جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے، وہ کونسا اسلامی ملک ہے جہان کی صنعت کا نمونہ یہان دیکھنے والے کو نظر نہین آسکتا، لیکن افسوس ہے کہ آجکل کے مسلمانون نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے، اور کچھ غیر مسلمانون کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہین، اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکون کا مرکزی بازار تھا یورپ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے، اس جنگِ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہین،

روحانیت - روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتین ہین جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکانِ حج کے ادا کرنے سے قلب و روح مین پیدا ہوتی ہین، اُن کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی، اور تیسری خالص روحانی ہے، وطنی ہونے کے یعنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک مین رہتے، ہر زبان بولتے، اور ہر لباس پہنتے ہین، تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہین ہون، تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے، وہی ملتِ ابراہیمی کا مقام، اسلام کا مولد، اور قرآن کا مہبط ہے، اس لئے دور دراز مسافتون سے ولولہ اور شوق کے بازوون سے اڑ کر جب لوگ یہان پہنچتے ہین، تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے، اور اُن کے دل مین اسلام کے

وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، مسلمان جس ملک مین بھی ہے، اس کو وہان اسلام اپنے خالص وطن مین نظر نہین آتا، ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومین بھی نظر آتی ہین، اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہین، اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنون کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے، لیکن یہان اسلام اُس کو اپنے خالص رنگ مین جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گرد و پیش آگے پیچھے، داہنے بائین، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے، اور اس وقت سرزمین حجاز اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ مین ایسا نظر آتا ہے، جس طرح نو آبادیون کے [illegible] کی نگاہ مین اپنی مادر وطن (مدرلینڈ) کی حیثیت، آج انگریز، ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطارق، نیوزیلینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زنجبار، اور افریقہ اور کنیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکون مین آباد ہین، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ اُن کی نگاہ مین اس وسیع برطانی مملکت کا جس مین آفتاب نہین غروب ہوتا مرکز ہے، وہ اُن کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر ہر چیز مین اپنے اس آبائی وطن و مسکن کی پیروی کرتے ہین، جب ان کی آنکھین اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہین تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب، اخلاق، اور تمدن کے ملک کو دیکھکر مسرت اور خوشی سے روشن ہوجاتی ہین، وہ اس کے ایک ایک در و دیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہین، اس وقت انکے دل مین وہ احساسات پیدا ہوتے ہین، جو دوسرے ملکون، قومون، اور تمدنون مین رہنے کی وجہ سے انکی فرسودہ اور پژمردہ ہوجانے والی فکر اور عمل کی قوتون کو بیدار کردیتے ہین، اور وہ یہان آکر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمۂ حیات مین نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہوجاتے ہین، بلا تشبیہ اسی قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانون کی ہے جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا، اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہین، ان مین سے جب کسی کو اس ملک، اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے، تو اُس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامنِ دل سے لپٹ جاتا ہے، اور وہ چلا اٹھتا ہے:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم،
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک مین اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے، اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائین، تاکہ یہان اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک وصاف، اور کفر و شرک کی ہر قسم کی نجاستون سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہان آکر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل، اور روحِ ایمانی کو تازہ کر سکین۔ قرآنِ پاک نے مکۂ معظمہ کو "ام القریٰ" یعنی آبادیون کی مان" کہا ہے۔ اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیون کی مان اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیون کی مان اور اصل، و مرجع اور ماویٰ تو ضرور ہے۔

تاریخیت ۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے، آدمؑ سے لے کر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لیکر محمد رسول اللہؐ تک جو کچھ ہوا ہے، اس کا تمامتر تعلق ارضِ حرم کے کوہ وصحرا اور در و دیوار سے ہے۔ یہین حضرت آدمؑ نے سکونت کی۔ اور عرش کے سایہ مین خدا کا گھر بنایا، یہین حواؑ نے آکر اُن سے ملاقات کی، یہین نوحؑ کی کشتی نے آکر دم لیا، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے یہان پناہ لی، حضرت ابراہیمؑ نے یہان ہجرت کی، حضرت اسمٰعیلؑ نے یہین سکونت اختیار کی، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہان ولادت پائی، یہین وہ پہاڑی ہے (صفا) جہان حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ اپنے گدھے چھوڑ کر اُترے، یہین وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی۔ یہین وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہؑ کو پیاس کے عالم مین نظر آیا، یہین وہ خانۂ خدا ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیمؑ و اسمٰعیل علیہما السلام نے بلند کیا، یہین وہ مقام ہے جہان کھڑے ہو کر انھون نے خدا کے آگے سر جھکائے۔ اسی کے قریب منیٰ، مشعر حرام، اور عرفات ہین، جو شعائر اللہ ہین،

یہین وہ پتھر (حجر اسود) ہے، جو ابراہیم و اسمٰعیل اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھون سے مس ہوا، یہی وہ سرزمین ہے، جہان ملت ابراہیمی کی بنیاد پڑی، یہی وہ آبادی ہے، جہان اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، یہین وہ گلیان اور راستے ہین، جو جبریل امین کے گذرگاہ تھے، یہین وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحن حرم ہے جس مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترپن سال بسر کئے، اور یہی وہ مقام ہے، جہان براق کے قدم پڑے تھے، اور یہی وہ مکانات ہین جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے، کیا قرآن پاک کا اشارہ انھین مناظر اور مشاہد کی طرف نہین، جہان اس نے کہا،

فِیۡهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِیۡمَ (آل عمران۔ ۱۰)	اس حرم مین کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہین، ابراہیم کے قیام کی جگہ،

ان مقامات اور مناظر مین کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے، تو اس کے ادب کی آنکھین نیچی ہو جاتی ہین، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے، اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ مین تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے، آنکھین اشکبار ہوتی ہین، اور زبان تسبیح و تہلیل مین مصروف ہو جاتی ہے، اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط، اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے،

وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ، (حج ۔ ۴)	اور جو خدا کی نشانیون اور یادگارون کی عظمت کرتا ہے، تو وہ دلون کے تقویٰ کے سبب سے ہے،
وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ، (حج ۔ ۴)	اور جو خدا کی حرمتون کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے لئے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے،

خالص روحانیت ۔ "حج کی حقیقت" مین گذر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی، اور اس دو دھ

کا نام نہین، یہ تو حج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے، حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات کیفیات، اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلین ہین، اسی لئے سرور کائنات علیہ الصلوٰت نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہین بلکہ "حج مبرور" رکھا ہے، یعنی وہ حج جو سراپا نیکی ہو، اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتون کا خزانہ ہے، جو عرفات کے سائلون کے لئے خاص ہے، حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت، اور گذشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آیندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے، اور اس کا اشارہ خود دعاے ابراہیمی مین مذکور ہے،

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ، (بقرہ-۱۵)	اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا، اور ہماری اولاد مین سے اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا، اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا، اور ہم پر رجوع ہو (یا ہم کو معاف کر) تو (بندون کی طرف) رجوع ہونے والا (یا ان کو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے،

حضرت ابراہیم کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤن کیطرح ضرور قبول کیگئی ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین مین حاضر ہوکر، جہان اکثر نبیون، رسولون اور برگزیدون نے حاضر ہوکر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے، اور ان مقامات مین کھڑے ہوکر، اور چل کر خدا کی بارگاہ مین اپنی سیہ کاریون سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولی کو منانا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو، کہ وہ تو اپنے تائب گنہگارون کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم وکرم، لطف وعنایت کا بحر بیکران ہے،

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حج اور عمرہ گناہون کو اس طرح صاف

کردیتے ہین جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کردیتی ہے، اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت مین گذارتا ہے، اس کا سورج جب ڈوبتا ہے تو اسکے گناہون کو لے کر ڈوبتا ہے[1]،

صحیح مسلم اور نسائی مین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہین جس مین خدا اپنے بندون کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہو، وہ اس دن اپنے بندون سے قریب ہوکر جلوہ گر ہوتا ہے، اور اپنے اُن بندون پر فرشتون کے سامنے فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ جو انھون نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا) "موطا امام مالک مین ہے کہ آپ نے یہ خوشخبری سنائی کہ "بدر کے دن کے سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا، اور غضبناک نہین ہوتا، کیونکہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہورہے ہین" اسی طرح اور بہت سی حدیثین ہین جنمین مخلصانہ حج ادا کرنے والون کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے، یہ تمام حدیثین درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا (اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا، اور ہماری توبہ قبول فرما) کی تفسیرین ہین،

ان تمام بشارتون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے۔ اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ "خداوندا مین حاضر ہون مین حاضر ہون" کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے، طواف مین، سعی مین، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات مین، مزدلفہ مین، منیٰ مین ہرجگہ جو دعائین مانگی جاتی ہین اُن کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے، اور اس بنا پر کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہین ہے، اسیلئے حج مبرور والون کے تمام پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہین،

---

[1] نسائی و ترمذی و بزار وطبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد، کتاب الحج جلد اول ص۱۷۳ میرٹھ [2] سنن ابن ماجہ، باب ذکر التوبہ،

گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہین، اس کے لئے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہین لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے گوناگون تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہان کے سوا اور کہین نہین، صدقِ توبہ کے لئے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہین، ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب مین ہے، اسکا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہان انبیاء علیہم السلام پر برکتون اور رحمتون کا نزول اور انوارِ الٰہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول، وہ فضا، وہ تمام گنہگارون کا ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعاء، وزاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ۔ وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد، جہان خدا اور اس کے برگزیدہ بندون کے بیسیون ناز و نیاز کے معاملات گذر چکے ہین، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین موقع ہین، جہان حضرت آدم و حوا نے اپنے گناہون کی معافی کی دعا کی، جہان حضرت ابراہیم ؑ نے اپنی اور اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی، جہان حضرت ہود ؑ اور حضرت صالح ؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈھی، جہان دوسرے پیغمبرون نے دعائین کین، جہان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لئے دعائین مانگین، وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاؤن کے وہی ارکان، ہم گنہگارون کی دعاے مغفرت کے لئے کس قدر موزون اور مناسب ہین کہ پتھر سے پتھر دل بھی، ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہین، اور انسان اُس ابرِ کرم کی چھینٹون سے سیراب ہو جاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہان برگزیدگانِ الٰہی پر عرشِ الٰہی سے برستا رہا ہے، اور ہنوز آن ابرِ رحمت دُرفشان است۔

انسان کی نفسیت (سائکولوجی) یہ ہے، اور روزمرہ کا تجربہ اسکا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی مین کسی بڑے اور اہم تغیر کے لئے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حدِ فاصل کی تلاش کرتا ہے، جہان پہنچکر اسکی گذشتہ اور آیندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائین، اسی لئے لوگ اپنے تغیر کے لئے جاڑا، گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہین، بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحبِ اولاد ہونے کے بعد، یا تعلیم

سے فراغت کے بعد، یا کسی نوکری کے بعد، یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد، یا کسی سے مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہین، یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہین، کیونکہ اُن کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی مین فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہین، جہان سے اِدھر یا اُدھر مڑ جانا ممکن ہو جاتا ہے، حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل کا کام دیتا ہے، اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے، یہان سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے، اُن بابرکت مقامون پر حاضر، اور وہان کھڑے ہو کر، جہان جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصانِ الٰہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے، قبلہ کے روبرو جو اس کی نمازون اور عقیدتون اور مناجاتون کی غائبانہ سمت ہے، اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیون پر ندامت اور اپنے گناہون کا اعتراف، اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف، خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے، اور زندگی کا گذشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے، بلکہ یون کہنا چاہئے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لئے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے سرورِ کائنات علیہ الصلوات نے یہ فرمایا:

من حج للّٰہِ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ امہٗ[1]	جس نے خدا کے لئے حج کیا، اور اس مین ہوس رانی نہ کی، اور نہ گناہ کیا، تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے اس دن تھا جس دن اُسکی مان نے اُسکو جنا،

یعنی ایک نئی زندگی، ایک نئی حیات، اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے جس مین دین اور دنیا دونون کی بھلائیان جمع اور دونون کی کامیابیان شامل ہونگی، یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتون کا خلاصہ ہے، جو حج کے باب مین ہین، اور جس کی آخری آیتین، طواف کی دعا، کا آخری ٹکڑہ ہین،

[1] سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتبِ صحاح کی کتاب الحج مین یہ حدیث موجود ہے،

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ
وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ،
فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ
كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ
فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي
الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا
حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا
عَذَابَ النَّارِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ
مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ،

(بقرہ ۲ - ۲۵)

پھر طواف کے لئے وہین سے چلو جہان سے لوگ
چلے، اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو بیشک
خدا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے،
اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ
کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادون
کو یاد کرتے ہو، یا اُن سے بھی زیادہ، تو بعض لوگ
(حج کی دعا مین) کہتے ہین کہ اے ہمارے پروردگار
ہم کو دنیا مین دے، اور ایسون کے لئے
آخرت مین کوئی حصہ نہین، اور بعض وہ ہین
جو کہتے ہین کہ اے ہمارے پروردگار، ہم کو دنیا
مین بھلائی دے اور آخرت مین بھی بھلائی دے
اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، یہ وہ ہین جنکو
اپنی کمائی کا حصہ ملے گا، اور اللہ تمھارے اعمال کا
تم سے جلد حساب لینے والا ہے،

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہین، مثلاً :-

۱- حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریون کا احساس کرسکتا ہے. حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل وعیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لئے آدمی حج کیلئے اُس وقت نکلتا ہے، جب اہل وعیال کی ضرورتون کا سامان کرلیتا ہے، اس لئے اس کو اہل وعیال کے مصارف کی ذمہ داریان خود بخود محسوس ہوجاتی ہین، معاملات مین قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے، اور حج وہی شخص ادا کرسکتا ہے جو اس سے

سبکدوش ہوجائے، اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے:

عام طرزِ معاشرت اور دنیوی کاموں مین آدمی اپنے سیکڑون دشمن پیدا کرلیتا ہے، لیکن جب خدا کی بارگاہ مین جانے کا ارادہ کرتا ہے توسب سے بری الذمہ ہوکے جانا چاہتا ہے، اس لئے رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض وحسد سے اپنے دل کو صاف کرلیتا ہے، لوگون سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، روٹھون کو مناتا ہے، قرضخواہون کے قرض ادا کرتا ہے، اس لحاظ سے حج معاشرتی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

۲ - اسلام آج ہر ملک مین ہے، اس لئے ہر ملک کی زبان اسکی زبان ہے، تاہم اسکی ایک عمومی زبان بھی ہے، جو اس ملک کی زبان ہے جہان دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہین، اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر مین کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہین، اسکا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو، وہ اُس ملک کی زبان سے اور زبان سے، کسی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے، اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

۳ - مساوات اسلام کا سنگِ بنیاد ہے، اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے، لیکن پوری وسعت کیساتھ اسکی اصلی نمائش حج کے زمانہ مین ہوتی ہے، جب امیر وغریب، جاہل وعالم، بادشاہ ورعایا، ایک لباس مین، ایک صورت مین، ایک میدان مین، ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہین، نہ کسی کے لئے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے، نہ آگے پیچھے کی قید،

۴ - بہت سی اخلاقی خوبیون کا سرچشمہ کسبِ حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف مین مالِ حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے اس کو خود حلال وحرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے، اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑسکتا ہے وہ ظاہر ہے،

الغرض **حج** اسلام کا صرف مذہبی رکن نہین، بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور مسلمانون کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے:

جہاد

وَجَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ، (حج - ۱۰)

عام طور سے اسلام کے سلسلۂ عبادات مین جہاد کا نام فقہا کی تحریرون مین نہین آتا، مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی مین اسکی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس فریضۂ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے، اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو بر تو پردے پڑ گئے ہین ان کو اٹھایا جائے،

"جہاد" کے معنی عموماً قتال، اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہین، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے، "جہاد" کا لفظ "جہد" سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہین، اور لغت مین اسکے معنی محنت اور کوشش کے ہین، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہین، یعنی حق کی بلندی، اور اسکی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جد و جہد، قربانی، اور ایثار گوارا کرنا، اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتون کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندون کو ملی ہین، اس راہ مین صرف کرنا، یہانتک کہ اس کے لئے اپنی، اپنے عزیز و قریب کی، اہل وعیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا، اور حق کے مخالفون اور دشمنون کی کوششون کو توڑنا، ان کی تدبیرون کو رائگان کرنا، ان کے حملون کو روکنا، اور اس کے لئے جنگ کے میدان مین اگر ان سے لڑنا پڑے، تو اس کیلئے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے، اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے،

افسوس ہے کہ مخالفون نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا مین کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، صرف "دین کے دشمنون کے ساتھ جنگ" کے تنگ میدان مین محصور کر دیا ہے،

یہ بات بار بار کہی، اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم اور شریعت کو لیکر دنیا مین آئے، وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہین، بلکہ عمل اور سرتاپا عمل ہے، آپکے مذہب مین نجات کا استحقاق، گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبۂ دھیان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہین بلکہ خدا کی توحید، رسولون اور کتابون اور فرشتون کی سچائی، قیامت اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد انھین کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جد و جہد پر مبنی ہے، اسی لئے قرآن پاک مین "جہاد" کا مقابل لفظ "قعود" (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترکِ فرض ہے، سورۂ نساء مین ہے،

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ	مسلمانون مین سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو
غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي	اور پھر بیٹھے رہین، اور وہ جو خدا کی راہ مین اپنی جان و
سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ	مال سے جہاد کر رہے ہون، برابر نہین، اللہ نے اپنی
فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ	جان و مال سے جہاد کرنے والون کو بیٹھنے والون
وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَ	پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے، اور ہر ایک سے خدا
كُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ	نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے، اور جہاد کرنے والون

الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا (نساء۔۱۲) کو بیٹھنے والون پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے،

اس "بیٹھنے" اور "جہاد کرنے" کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے، کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے،

یہان ایک شبہہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اکثر لوگ یہ سمجھتے ہین کہ "جہاد" اور "قتال" دونون ہم معنی ہین حالانکہ ایسا نہین ہے، قرآن پاک مین دونون لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہین، اسلئے "جہاد فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ مین جہاد کرنا) اور "قتال فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ مین لڑنا) ان دونون لفظون کے ایک معنی نہین ہین، بلکہ ان دونون مین عام و خاص کی نسبت ہے، یعنی ہر "جہاد" "قتال" نہین ہے، بلکہ جہاد کی مختلف قسمون مین سے ایک، قتال اور دشمنون

سے لڑنا بھی ہے، اسی لئے قرآنِ پاک مین ان دونون لفظون کے استعمال مین ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اسی سورۂ نساء کی اوپر کی آیت مین اور دوسری آیتون مین جہاد کی دو صریح قسمین بیان کی گئی ہین، جہاد بالنفس، اور جہاد بالمال یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لیے، ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے، یہانتک کہ اپنی جان تک کو جوکھون مین ڈال دینے، آگ مین جلائے جانے، سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے مین چھد جانے، اور تلوار سے کٹ جانے کے لئے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لئے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لئے تیار رہے، اسی جان اور مال کی باطل محبت شخص اور قوم دونون کی ترقی وسعادت کی راہ مین رکاوٹ ہے، اگر یہ دونون بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائین تو ہم کامل موحد ہوجائین، اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہین سکتی، جسمانی وروحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے، اس کے سوا کچھ اور نہین،

ترقی وسعادت کا یہ گُر صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصولِ ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ مین مسلمانون نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفون کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق وزنجیر کی گرانباری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچون سے علٰحدگی، مال ودولت سے دست برداری، اور گھر بار سے دوری، کوئی چیز بھی اُن کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی، اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ مین انھون نے تلوار کی چھاؤن مین جس طرح گذارے وہ دنیا کو معلوم ہے،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	مومن وہی ہین جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان
ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ	لائے، اور پھر اس مین وہ ڈگمگائے نہین، اور
وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ	خدا کے راستہ مین اپنی جان سے اور اپنے مال سے

هُمُ الصَّادِقُوْنَ ، (حجرات - ۲)

جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے لوگ ہین،

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ ۔ الآیہ

(آل عمران - ۲۰)

پھر جنھون نے اپنا گھر بار چھوڑا، اور اپنے گھرون سے نکالے گئے، اور میری راہ مین ستائے گئے، اور لڑے اور مارے گئے مین اُن کے گناہون کو اتار دونگا، اور ان کو بہشت مین داخل کرونگا،

جہاد کی قسمین ۱- جب جہاد کے معنی محنت، سعی بلیغ، اور جد وجہد کے ہین تو ہر نیک کام اس کے تحت مین داخل ہوسکتا ہے، علماے دل کی اصطلاح مین "جہاد" کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے، اور اسی کا نام اُن کے ہان "جہادِ اکبر" ہے، خطیب نے تاریخ مین حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے، کہ آپ نے اُن صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے، فرمایا "تمھارا آنا مبارک، تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو، کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہواے نفس سے لڑنا ہے؛ حدیث کی دوسری کتابون مین اس قسم کی اور بعض روایتین بھی ہین[۱]، چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابو ذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے؛ یہی روایت دیلمی مین ان الفاظ مین ہے کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو"۔ یہ تینون روایتین گو فن کے لحاظ سے چندان مستند نہین ہین، مگر یہ درحقیقت بعض صحیح حدیثون کی تائید، اور قرآنِ پاک کی اس آیت کی تفسیر ہین،

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ،

(عنکبوت - ۷)

اور جنھون نے ہمارے بارہ مین جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائینگے، اور بے شبہ خدا نیکوکارون کے ساتھ ہے،

اس پورے سورہ مین اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو حق کے لئے ہر مصیبت و تکلیف مین ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے، اور اگلے پیغمبرون کے کارنامون کو ذکر کیا ہے، کہ وہ ان مشکلات مین کیسے ثابت قدم رہے،

[۱] کنز العمال کتاب الجہاد ج ۲ ص ۲۸۵ حیدرآباد دکن

اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا، سورہ کے آغاز میں ہے،

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ، (عنکبوت - ۱)	اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہی) وہ اپنے ہی غرض کے لئے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے،

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ "ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں، یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کریگا اور محنت اٹھائیگا ہم اس کے لئے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دینگے، اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے"

یہی مجاہدہ، کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے، سورۂ حج میں ارشاد ہوا،

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ، (حج - ۱۰)	اور محنت کرو اللہ میں پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے، اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین،

یہ اللہ میں محنت اور جہاد کرنا وہی جہادِ اکبر ہے، جس پر ملتِ ابراہیمی کی بنا ہے، یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا، ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے[1]، کہ آنحضرت صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ "المجاهد من جاهد نفسه" یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے، صحیح مسلم میں ہے، ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ "تم پہلوان کس کو کہتے ہو" عرض کیا "جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں" فرمایا "نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے"[2] یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے، اور اس حریف کو زیر کر سکے، جس کا اکھاڑا خود اس کے سینہ میں ہے،

۲- جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے، دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے، اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لئے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے، تو اس کا فرض ہے کہ وہ

---

[1] بحوالہ کنز العمال، کتاب الایمان جلد ۱ ص۳۹، [2] صحیح مسلم باب من یملک نفسہ عند الغضب جلد ۲ ص۲۹۶ مصر،

اس سے دوسرے تاریک دلون کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب مین وہ طمانیت نہین پیدا ہوسکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگون کے سینون مین پیدا ہوتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوا کہ،

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (نحل - ۱۶)

تو لوگون کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتون کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دے، اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کر،

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے، جہاد کی ایک قسم ہے، اور اسی طریقۂ دعوت کا نام "جہاد بالقرآن" ہے، کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت، اور اپنے لئے آپ مناظرہ ہے، قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیماریون کی فوجون کو شکست دینے کے لئے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ مین دیگئی اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پرون کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا،

فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا کَبِیْرًا (فرقان - ۵)

تو کافرون کا کہنا مان، اور بذریعہ قرآن کے توان سے جہاد کر، بڑا جہاد،

بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعہ سے توان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر بڑا جہاد اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر مین کتنی ہے، علما نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے، اور اس کو جہاد کا اہم بالشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابو بکر رازی حنفی نے احکام القرآن مین اس پر لطیف بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونون سے بڑھ کر ہے[1]، ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لئے عقل و فہم علم اور بصیرت حاصل کرے اور اُن کو

---

[1] احکام القرآن رازی قسطنطنیہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۹،

اس راہ مین صرف کرے، اور وہ تمام علوم جو اس راہ مین کام آسکتے ہون، اُن کو اس لئے حاصل کرے کہ اُن سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائیگا، یہ علم کا جہاد ہے، جو اہلِ علم پر فرض ہے،

۴- جہاد بالمال،

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستون مین خرچ کیا جائے، یہان تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے آرام و آسایش کے لئے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لئے، دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپیے پر موقوف ہین، اس لئے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہین ہے، دوسری اجتماعی تحریکون کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدّ وجہد مین سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لئے مسلمانون کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وصحبت کی برکت سے صحابۂ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سی سخت گھڑیون مین جس طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہین، اور انھین سیرابیون سے دینِ حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھون سرسبز و شاداب ہوا اور اسی لئے اسلام مین ان بزرگون کا بہت بڑا رتبہ ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (انفال-۱۰)	بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا،

قرآنِ پاک مین مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتین ہین، بلکہ بمشکل کہین جہاد کا حکم ہوگا، جہان اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو، اور قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ ان مین سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاھِدُوْا بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ	ہلکے یا بھاری ہوکر جس طرح ہو نکلو، اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے مین جہاد کرو، یہ تمھارے

إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۔ (توبہ - ۶)

لیے بہتر ہے، اگر تم کو معلوم ہو،

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (حجرات - ۲)

مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے پھر اس میں شک نہیں کیا، اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستہ میں جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے ہیں،

فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۔ (نساء - ۱۳)

اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے،

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں،

میدانِ جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لئے ممکن نہیں لیکن مالی شرکت ہر ایک کیلئے آسان ہے،

جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہیں پیش آتی ہے لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے،

انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت، اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے،

گر جان طلبی مضائقہ نیست — گر زر طلبی سخن درین است

اس لئے مال کو جان پر مقدم رکھکر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے،

۴- جہاد کے ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے، عورتیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دیجائے، ارشاد ہوا کہ تمہارا جہاد نیک حج ہے[1]، کہ اس مقدس سفر کیلئے سفر کی تمام مصیبتوں کو برداشت کرنا صنف نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمت اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد،

تمہارے ماں باپ ہیں، عرض کی جی ہاں، فرمایا ففیھما فجاھد، توتم انہیں کی خدمت میں جہاد کرو[1] یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد ہے، آپ نے فرمایا،

انّ من اعظم الجهاد کلمة عدلٍ عند سلطانٍ جائرٍ (ترمذی ابواب الفتن)	ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہدینا ہے،

۵۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے اُن تمام اقسام کو شامل ہے، جنمیں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو، اور اسکی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے، نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آپڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تُل جائیں تو اُن کو راستہ سے ہٹانا، اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبۂ کمال ہے، ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لئے اسکو بخش دیجائے، یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کر دیجائے، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ،	جو خدا کی راہ میں مارے گئے، اُن کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمکو اس کا احساس نہیں،

(بقرہ - ۱۹)

آل عمران میں ان جانبازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کیگئی ہے،

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ	جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ گمان نہ کرو
أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ	بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس اُن کو
فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ	روزی دیجا رہی ہے، خدا نے اُن کو اپنی جو مہربانی

[1] ابوداؤد و ترمذی کتاب الجہاد،

بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (آل عمران - ۱۷)	عطا کی ہے، اس پر وہ خوش ہیں، اور جو ابتک ان سے اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں اُن کو خوشخبری دیتے ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہے نہ وہ غم ہیں

ان جان نثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں شہید ہے، یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندۂ جاوید ہیں،

ہرگز نہ مرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گلگون پیراہن میں قیامت کے دن اٹھینگے[1]، اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی میں انھوں نے ادا کی تھی، اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے. وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (آل عمران - ۱۴)

اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گو اپنا سر ہتھیلی پر رکھکر میدان میں اترے تھے، لیکن اُن کے سر کا ہدیہ دربار الٰہی میں اسوقت اس لئے قبول نہ ہوا، کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارنامہ ختم نہیں ہوا تھا، وہ بھی اپنے حسن نیت کے بدولت رضائے الٰہی کی سند پائیں گے، اسی لئے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کے لئے "غازی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں،

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا. (نساء - ۱۰)	اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے، پھر وہ یا مارا جاتا ہے یا وہ غالب آتا ہے، تو ہم اسکو بڑا بدلہ عنایت کرینگے،
فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ، (آل عمران - ۲۰)	توجنھوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور اُن کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور وہ لڑے اور مارے گئے، ہم اُن کے گناہوں کو چھپا دینگے، اور اُن کو جنت میں داخل کرینگے جس کے نیچے نہریں بہتی ہونگی، خدا کی طرف سے اُن کو یہ بدلہ ملیگا اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے،

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد،

ان آیات کی تفسیر و تشریح مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ احادیث مین مذکور ہے جسمین شہیدون کی فضیلتین، اور اُن کی اُخروی نعمتون کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ مین ہے، اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانون مین مشکلات کے مقابلہ اور دشمنون سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کردی جسکی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانون کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کردیتا ہے، اور اس حیاتِ جاوید کی تلاش مین ہر مسلمان بیتاب نظر آتا ہے، یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کی، اور فرمایا کہ "مجھے آرزو ہے کہ مین خدا کی راہ مین مارا جاؤن، اور دوبارہ مجھے زندگی ملے، اور مین اسکو بھی قربان کردون، اور پھر تیسری زندگی ملے، اور اس کو بھی مین خدا کی راہ مین نثار کردون[1]" ذرا ان فقرون پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجئے، ان مین یہ نہین ہے کہ مین دوسرے کو مار ڈالون، بلکہ یہ ہے، کہ حق کے راستہ مین مین مارا جاؤن، اور پھر زندگی ملے، پھر مارا جاؤن، پھر زندگی ملے، اور پھر مارا جاؤن،

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را   ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

دائمی جہاد | یہ تو وہ جہاد ہے جسکا موقع ہر مسلمان کو پیش نہین آتا اور جسکو آتا بھی ہے تو عمر مین ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے، مگر حق کی راہ مین ایک جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے اسلئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اُمتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبون کی مدد، زیردستون کی امداد، سیہ کارون کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ عدل، ردِ ظلم، اور احکامِ الٰہی کی تعمیل مین ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہانتک کہ اسکی زندگی کی ہر جنبش و سکون ایک جہاد بنجائے اور اسکی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورۂ آل عمران کی جسمین جہاد کے مسلسل احکام ہین آخری آیت ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ (آل عمران - ۲۰)

اے ایمان والو! مشکلات مین ثابت قدم رہو، اور مقابلہ مین مضبوطی دکھاؤ، اور کام مین لگے رہو، اور خدا سے ڈرو، تاکہ تم مراد کو پہنچو

یہی وہ جہادِ محمدی ہے، جو مسلمانون کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے،

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد،

عبادات قلبی

یہ اسلام کے اُن عبادات کا بیان تھا، جو جسمانی و مالی کہلاتی ہین، گو کہ دل کے اخلاص کا شمول ان مین بھی ہے، لیکن اسلام مین بعض ایسی عبادات بھی ہین، جنکا تعلّق تمامتر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتون سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے، کہ اسلام مین ہر نیکی کا کام عبادت ہے، اس لئے تمام امورِ خیر خواہ وہ جسمانی، یا مالی، یا قلبی ہون عبادات کے اندر داخل ہین، فقہا نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہے، لیکن حضرات صوفیہ نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اصل یہ ہے کہ فقہا نے اپنا فرض منصب صرف جسمانی اور مالی فریضون تک محدود رکھا ہے، اور صوفیہ نے اُن سارے فریضون کو یکجا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیشِ نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے، اور نہ تصوف کی، اسکا مقصود اُن فرائض کو بتانا ہے، جنکی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے، اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام مین انکی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فرائض جنکا مرتبہ عباداتِ پنجگانہ کے بعد قرآنِ پاک مین سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہین، یہ وہ فرائض ہین، جنکا تعلق انسان کے قلب سے ہے، اور اسی لئے ان کا نام "قلبی عبادات" رکھا جا سکتا ہے، یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہین جو اسلام کی رُوح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہین، جن کے الگ کر دینے سے وہ عباداتِ پنجگانہ بھی جنپر اسلام نے اسقدر زور دیا ہے، جسدِ بے روح بنجاتے ہین، یہ بات گو یہان بے محل ہے، مگر کہنے کے قابل ہے، کہ فقہ اور تصوّف کی ایک دوسرے سے علٰحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور

دوسری طرف اعمالِ تصوّف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے،

ہر اچھے کام کے کرنے، اور برائی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل مین خیر و شر کی تمیز کیلئے خلش ہو، یہ **تقویٰ** ہے، پھر اس کام کو خدائے واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے، یہ **اِخلاص** ہے، پھر اُس کام کے کرنے مین صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے، یہ **توکّل** ہے، اُس کام مین رکاوٹین اور دقتین پیش آئین، یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے، اور خدا سے آس نہ توڑی جائے، اور اس راہ مین اپنے برا چاہنے والون کا بھی برا نہ چاہا جائے، یہ **صَبر** ہے، اور اگر کامیابی کی نعمت ملے، تو اُس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے، اور جسم و جان و زبان سے اسکا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کامون کے کرنے مین اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے یہ **شُکر** ہے،

ذیل کی سطرون مین اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے،

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے،

اگر محمد رسول اللہ صلعم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ مین کرنا چاہین تو ہم اسکو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہین، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب مین اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآنِ پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ مین یہ اعلان کیا ہے کہ اسکی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہین جو تقویٰ والے ہین۔

ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۔ (بقرہ - ۱) یہ کتاب تقویٰ والون کو راہ دکھاتی ہے،

اسلام کی ساری عبادتون کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے،

یَاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (بقرہ ۳) اے لوگو اپنے اس پروردگار کی جسنے تم کو اور تمہارے پہلون کو پیدا کیا، عبادت کرو، تاکہ تم تقویٰ پاؤ،

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ. (بقرہ-۲۳) — تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقوی حاصل کرو،

حج کا منشا بھی یہی ہے،

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ، (حج-۴) — اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے، تو یہ دلوں کے تقوی سے ہے،

قربانی بھی اسی غرض سے ہے،

لَنْ يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنْكُمْ، (حج-۵) — خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، لیکن تمہارا تقوی اس کو پہنچتا ہے،

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لئے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقوی پر ہونی چاہئے،

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللَّهِ (توبہ-۱۳) — جسنے اپنی عمارت خدا سے تقوی پر کھڑی کی،

لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى، (توبہ-۱۳) — البتہ وہ مسجد جسکی بنیاد تقوی پر قائم کیگئی،

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقوی ہے،

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى (بقرہ-۲۵) — اور سفر میں زاد راہ لیکر چلو، اور سب سے اچھا زاد راہ تقوی ہے

ہمارے زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھکر تقوی کا لباس ہے،

وَلِبَاسُ التَّقْوَى ذَلِكَ خَيْرٌ، (اعراف-۳) — اور تقوی کا لباس وہ سب سے اچھا ہے،

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقوی کی بنیاد پر قائم ہے،

وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى، (بقرہ-۳۱) — اور معاف کردینا تقوی سے قریب تر ہے،

اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى، (مائدہ-۲) — انصاف کرنا تقوی سے قریب تر ہے،

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (آل عمران - ۱۹) | اور اگر صبر کرو، اور تقوی کرو، تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے،

وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ، (بقرہ - ۲۸) | اور تقوی کرو، اور لوگون کے درمیان صلح کراو،

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا، (نساء - ۱۹) | اور اگر اچھے کام کرو، اور تقوی کرو، تو اللہ تمہارے کامون سے خبردار ہے،

اہل تقوی تمام اخروی نعمتون کے مستحق ہیں

آخرت کی ہر قسم کی نعمتین انہین تقوی والون کا حصہ ہے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ (دخان) بےشبہ تقوی والے امن وامان کی جگہ مین ہونگے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ (طور - ۱) | بے شک تقوی والے باغون مین، اور نعمت مین ہونگے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ (ذاریات - ۱) | شک نہین کہ تقوی والے باغون مین اور چشمون مین ہونگے

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ (قمر - ۱) | بلاشبہ تقوی والے باغون مین اور نہرون مین ہونگے

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ، (مرسلٰت - ۱) | بلاشک تقوی والے سایون مین اور چشمون مین ہونگے

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (ن - ۲) | یقیناً تقوی والون کے لئے اُنکے پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہین

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا، (نباء - ۲) | بے شبہ تقوی والون کے لئے کامیابی ہے،

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ، (ص - ۴) | لاریب تقوی والون کیلئے بازگشت کی اچھائی ہے،

کامیابی اہل تقوی کیلئے ہے،

گو بظاہر ابتدا مین اہل تقوی کو کسی قدر مصیبتین اور بلائین پیش آئین، یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزون سے محروم ہونا پڑے، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششون اور ناروا راستون سے پرہیز کرنا پڑے، اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ اُن کو مال و دولت عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی، لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہین، اور یہ خیال کرتے ہین کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمرون کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجون کا فیصلہ

کرلینا چاہئے، حالانکہ جو جتنا دور بین ہے، اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے حقیقی دور بین اور عاقبت اندیش وہ ہیں، جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ آخرت کے دائمی، اور دیر پا فائدہ کی بنا پر کرتے ہیں، اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمرون پر رہتی ہے، تو دنیا بھی اُن کی بنجاتی ہے، اور یہان اور وہان دونون جگہ کامیابی اور فوز و فلاح انھین کی قسمت مین ہوئی ہے، فرمایا،

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ،	(اعراف-۱۵)	اور آخری انجام تقویٰ والون کے لئے ہے،
اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ،	(ھود-۴)	بے شبہ انجام کار تقویٰ والون کیلئے ہے،
وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ،	(زخرف-۳)	اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والون کیلئے ہے،
وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ،	(طٰہٰ-۸)	اور انجام کار تقویٰ کے لئے ہے،

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہین یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہین، جب وہ ہر کام مین خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہین، اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف، یا انعام یا ہر دلعزیزی کی صورت مین نہین چاہتے، تو اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندون مین بھی اُن کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دلعزیزی پیدا ہوتی ہے:

اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ،	(انفال-۴)	تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہین،
فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ،	(آل عمران-۸)	تو اللہ بے شک تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ،	(توبہ-۱)	اللہ بلاشبہ تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،
وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ،	(جاثیہ-۲)	اور اللہ تقویٰ والون کا دوست ہے،

معیتِ الٰہی سے سرفراز ہین یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اسکی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہین، اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دیسکتا ہے،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ. (بقرہ-۲۴) اور جان لو کہ بے شبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ. (توبہ-۵) اور یقین مانو کہ لاریب اللہ تقویٰ والوں کیساتھ ہے،

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے ایک کام ہزاروں اغراض، اور سیکڑوں مقاصد کو سامنے رکھکر کیا جاسکتا ہے. مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف انھیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں، فرمایا،

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ. (مائدہ-۵) اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے،

اسی لئے انھیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے، اور آخرت میں بھی،

تقویٰ والے کون ہیں یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت، اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے، اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لئے ہیں، یہ جاننا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دیدیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے، جو سورہ زمر میں ہے،

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اور جو سچائی لے کر آیا، اور اس کو سچ مانا، وہی لوگ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ. لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ ہیں تقویٰ والے، ان کے لئے ان کے رب کے پاس
عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ. (زمر-۴) وہ ہے، جو وہ چاہیں، یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا،

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ، اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے، اور اس اپنی سچائی کو سچ مانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت، اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں، بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر نہیں ہٹتا،

لیکن اہل تقویٰ کا پورا حلیہ سورہ بقرہ میں ہے،

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا، اور اپنا مال

عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ	اس کی محبت پر رشتہ دارون، یتیمون، مسکینون، مسافر اور
وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ	مانگنے والون کو اور گردنون کے آزاد کرانے مین دیا،
وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالْمُوْفُوْنَ	اور نماز کو برپا کیا، اور زکوٰۃ ادا کی، اور جو وعدہ کرکے
بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ	اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہین، اور سختی، تکلیف،
فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ	اور لڑائی مین صبر کرنے والے ہین، یہی وہ ہین، جو

اَلَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ، (بقرہ۔۲۲) سچے ٹھہرے، اور یہی تقویٰ والے ہین،

ان آیتون مین تقویٰ والون کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط وخال نمایان کر دیا گیا، اور بتا دیا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ مین سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہین،

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے، تقویٰ اصل مین وَقْوٰی ہے، عربی زبان مین اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے، اور لحاظ کرنے کے ہین، لیکن وحی محمدی کی اصطلاح مین یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا کرکے دل مین خیر وشر کی تمیز کی خلش، اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کردیتی ہے، دوسرے لفظون مین ہم یون کہہ سکتے ہین کہ وہ ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام مین خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اسکی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقویٰ اصل مین دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکانِ حج کے بیان کے موقع پر ہے،

وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ	اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتا ہے، تو وہ دلون کے
تَقْوَی الْقُلُوْبِ۔ (حج۔۴)	تقویٰ سے ہے،

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے، اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امور خیر کی طرف دلون مین تحریک پیدا، اور شعائر الٰہی کی تعظیم سے اُن کو معمور کرتا ہے، ایک اور آیت کریمہ مین ارشاد ہے،

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ — بیشک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دبی آواز سے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ — بولتے ہیں، وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ

لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ۔ (حجرات - ۱) — کے واسطے جانچا ہے ان کو معافی ہے اور بڑا بدلہ،

اس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے،

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا۔ (الشمس - ۱) — تو ہر نفس میں اس کا فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا،

فجور تو ظاہر ہے کہ گنہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے، اور دونوں بندہ کو فطرۃً ودیعت ہیں، اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے، مگر بہرحال یہ دونوں الہام ربانی ہیں، اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے، اس لئے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے، صحابہؓ نے کفار کے اشتعال دلانے، اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس مستحسن روش کو تقویٰ فرمایا،

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ — اور جب کفار نے اپنے دلوں میں پچ رکھی، نادانی

حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ — کی پچ تو اللہ نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں

عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ — پر اتارا، اور ان کو تقویٰ کی بات پر لگا رکھا، اور

كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا۔ (فتح - ۳) وہی تھے اس کے لائق، اور اس کے اہل،

یہاں جنگ و خونریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب، اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے، اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے۔

فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ، (توبہ-۱) | تو تم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو، خدا تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. (توبہ-۲) | تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہین، تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو، خدا تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،

جس طرح انسان کا فجور، بری تعلیم، بری صحبت اور برے کامون کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے، اسطرح اچھے کامون کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے، اور اسکی قلبی کیفیت مین ترقی ہوتی ہے،

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ، (محمد-۲) | جو لوگ راہ پر آئے، خدا نے انکی سوجھ اور بڑھائی اور ان کو ان کا تقویٰ عنایت کیا،

اس سے عیان ہے کہ "تقویٰ" ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے، اور جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ اسکو ہدایت پر ہدایت، اور فطری تقویٰ پر، مزید دولتِ تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحًا معلوم ہوتی ہے، صحابہ کے مجمع مین ارشاد فرمایا،

اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا (مسلم) | تقویٰ یہان ہے،

اور یہ کہکر دل کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے بے شک وشبہہ یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نیکیون کی محرک ہے، اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے، اور یہی سبب ہے، کہ وہ قرآن پاک کی رہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتون کا مقصد، اور تمام اخلاقی تعلیمون کا ماحصل قرار پایا،

اسلام میں برتری کا معیار اسلام مین تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اثر یہ ہے، کہ تعلیمِ محمدی نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب، نسب، غرض نوعِ انسانی کے ان صدہا خود ساختہ اعزازی مرتبون کو مٹا کر صرف ایک ہی

امتیازی معیار قائم کر دیا، جس کا نام تقویٰ ہے، اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے، اور اسلئے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بہ آواز بلند یہ اعلان کیا،

جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا — ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لئے

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ، — بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے، تم میں سے خدا کے نزدیک

(حجرات - ۲) — سب سے معزز وہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے

اس اعلان کو آنحضرت صلعم نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا، الکرمُ التقویٰ یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے، اور اسی کے لئے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ "عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتر وہ ہے، جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے"،

اخلاص

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (قرآن)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغۂ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلعم نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے،

الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب[1]	ہشیار رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے، اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، ہشیار رہو کہ وہ دل ہے،

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لئے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش، طلب منفعت، طلب شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالی کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے،

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۔ اَلَا لِلّٰهِ	تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گذاری

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب من استبرأ لدینہ وصحیح مسلم باب اخذ الحلال وترک الشبہات،

اَلدِّيْنُ الْخَالِصُ ﴿ (زمر-۱) کو اُسی کیلئے، ہشیار کہ اللہ ہی کیلئے ہے خالص اطاعت گذاری

مقصود یہ ہے، کہ خدا کی اطاعت گذاری میں، خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر یا مٹی کی مورت، یا آسمان و زمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو، اسی لئے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض و غایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا،

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ﴿ (فرقان-۴)

کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے،

چنانچہ، اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے،

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ، وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ . قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ . قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ﴿ (زمر-۲)

کہدے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گذاری کو اللہ کے لئے خالص کر کے اسکی عبادت کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار بنوں، کہدے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، بڑے دن کے عذاب سے، کہدے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، اپنی اطاعت گذاری کو اس کے لئے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جسکی عبادت چاہے کرو

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے،

مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ، اطاعت گذاری کو خدا کے لئے خالص کر کے،

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لئے ہو، یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی، اور خواہشِ نفسانی کو دخل نہ ہو، اور اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى (لیل - ۱) یعنی

خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو،

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ مین ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہین، اس سے ہم کو کوئی دنیاوی غرض، اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہین،

وَمَآ اَسۡئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ. (شعراء-۶-۷-۸-۹-۱۰) — اور مین اس پر کوئی مزدوری تم سے نہین چاہتا میری مزدوری تو اسی پر ہے، جو ساری دنیا کا پروردگار ہے،

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا،

يٰقَوۡمِ لَآ اَسۡئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًا اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ. (ھود-۳) — اے میری قوم! مین تم سے اس پر دولت کا خواہان نہین میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے،

خود ہمارے رسول صلعم کو یہ کہدینے کا فرمان ہوا، مین تم سے اپنے لئے کوئی مزد و اجرت نہین چاہتا، اگر چاہتا بھی ہون تو تمہارے ہی لئے،

قُلۡ مَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَكُمۡ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ شَهِيۡدٌ. (سبا-۶) — کہدے کہ مین نے تم سے جو اجرت چاہی تو وہ تمہارے ہی لئے، میری اجرت تو اللہ پر ہے. وہ ہر بات پر گواہ ہے،

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتون سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض، اور صرف خدا کیلئے ہے، دوسری جگہ فرمایا،

لَآ اَسۡئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی. (شوریٰ-۳) — مین اس پر تم سے کوئی مزدوری نہین چاہتا. مگر قرابتدارون مین محبت رکھنا،

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششون سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے منفعت پہنچائے ہیں کے لئے وہ تم سے کسی ذاتی کا خواہان نہین، اگر وہ اس کے معاوضہ مین کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابتدارون کا حق ادا کرو، اور آپس مین محبت رکھو،

اسی قسم کی بات ایک اور آیت مین ظاہر کیگئی ہے،

قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ	کہدے کہ مین تمھاری اس رہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ
اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۔	نہین مانگتا، مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی
(فرقان – ۵)	طرف راستہ پکڑے،

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم مین سے کچھ لوگ حق کو قبول کرلین،

دنیا مین بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے، لیکن اگر اس کی نسبت یہ معلوم ہوجائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض، یا محض دکھاوا اور نمایش تھا، تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہون سے گرجائیگی، اسی طرح روحانی عالم مین بھی خدا کی نگاہ مین اس چیز کی کوئی قدر نہین جو اسکی بارگاہِ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لئے پیش کیگئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلاخیال مزد و اجرت، اور تحسین و شہرت کی طلب سے بالاتر ہو، یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی انھین کو ادا کرتی ہے جنکی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انھون نے اپنا کام انھین شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ہم جو کام بھی کرتے ہین اسکی دو شکلین پیدا ہوتی ہین، ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضا کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی، جسکا ہیولیٰ ہمارے دل کے ارادہ و نیت، اور کام کی اندرونی غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا اور برکت دین اور دنیا دونون مین اسی روحانی پیکر کے حسن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت مین ہے، اسی لئے اس اخلاص کے بغیر اسلام مین نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے، اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہین، اسلئے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض و غایت سے بالا، اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھین، توراۃ اور قرآن دونون مین ہابیل اور قابیل آدم کے دو بیٹون کا قصہ ہے، دونون نے خدا کے حضور مین اپنی اپنی پیداوار کی قربانیان پیش کین، خدا نے اُن مین سے صرف ایک کی قربانی قبول کی، اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرما دیا،

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ، (مائدہ-۵)   خدا تو متقیون ہی سے قبول کرتا ہے،

متقی بھی وہی ہوتے ہین، جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لئے کام کرتے ہیں، انھین کا کام قبول ہوتا ہے، اور اُن کو دین و دنیا مین فوز و فلاح بخشا جاتا ہے ان کو خدا کے ہان محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے، اور دنیا مین اُن کو ہر دلعزیزی ملتی ہے، ان کے کامون کو شہرت نصیب ہوتی ہے، اور ان کے کارنامون کو زندگی بخشی جاتی ہے، وہ جماعتون اور قومون کے محسن ہوتے ہین، لوگ اُن کے ان کامون سے نسلاً بعد نسلٍ فیضیاب ہوتے ہین، اور اُن کے لئے رحمت کی دعائین مانگتے ہین، حضرت موسیٰؑ کے عہد مین فرعونیون کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہین آتا تھا، کہ ان دونون سے انھون نے عجائب و غرائب امور کا یکسان مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا ان دونون کے عجائب و غرائب مین ظاہری نہین باطنی صورت کا فرق ہے، ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازیگری ہے، اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی وروحانی زندگی کا انقلاب ہو، اسی لئے یہ فیصلہ ہو۔

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى (طٰہٰ-۳)   اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہین پائیگا،

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگرون کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بنکر رہ گئے، اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی، جو مدتون تک دنیا مین قائم رہی،

غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے، جو دل کے کارخانہ مین تیار ہوتا ہے، اسی لئے اس بات کی ضرورت ہو کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہوجائیگا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لئے ارادہ اور نیت کو کیون ضروری قرار دیا ہے۔

توکّل

فَتَوَکَّلْ عَلَى اللهِ (آل عمران - ۱۰)

توکّل قرآن پاک کی اصطلاح کا اسم لفظ ہے، عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کیجائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤن توڑے کسی حجرہ یا خانقاہ مین بیٹھ رہا جائے، اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کردیگا یعنی تقدیر مین جو کچھ ہے وہ ہو رہیگا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہین، لیکن یہ سراسر وہم ہے، اور مذہبی اپاہجون کا دلخوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہین،

توکّل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہین، اور اصطلاح مین خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہین، لیکن کس بات مین بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے مین [illegible] کرنے مین ؟ جھوٹے صوفیون نے ترک عمل، اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کرکے دوسرون کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے، حالانکہ توکّل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام مین بھلائی ہے، تو اللہ تعالیٰ اُسین ضرور ہی ہم کو کامیاب فرمائے گا،

اگر تدبیر اور جدوجہد و کوشش کا ترک ہی توکّل ہوتا، تو دنیا مین لوگون کے سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ پیغمبرون کو مبعوث نہ کرتا، اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لئے جدوجہد اور سعی و سرگرمی کی تاکید فرماتا، اور نہ اس راہ مین جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر و اُحد، اور خندق و حنین مین سوارون، تیراندازون، زرہ پوشون، اور تیغ آزماؤن کی ضرورت پڑتی، اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی،

توکل مسلمانون کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے، تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگون سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کر لو، اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو، اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کریگا، اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیت سمجھو، اور اس سے مایوس اور بودے نہ ہو، اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جد وجہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تیر فضل وکرم ہوا، اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا۔ آل عمران مین ہے،

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ. اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ،

(آل عمران – ۱۷)

اور کام (یا لڑائی) مین ان سے مشورہ لو، پھر جب پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بیشک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والون کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکے گا، اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ رکھین،

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی، کہ توکل بے دست وپائی اور ترک عمل کا نہین، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم وارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار ہے، تو کوئی ہم کو ناکام نہین کر سکتا، اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش ومدد کارآمد نہین ہوسکتی، اس لئے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام مین خدا پر بھروسہ رکھے،

منافق اسلام اور مسلمانون کے خلاف سازشین اور راتون کو جوڑ توڑ کرتے ہین، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالون کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمہارے کامون کو بنائے گا،

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔ (نساء - ۱۱)

تو ان منافقوں سے درگذر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ اور اللہ ہے کام بنانے والا،

آغازِ اسلام کے شروع میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے۔ تو مخالفوں کی کثرت، اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دیجاتی ہے، اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کئے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کرکے کام شروع کردو،

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ الَّذِىْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِى السّٰجِدِيْنَ، (شعراء - ۱۱)

اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہشیار کر، اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی کرے اس کے لئے اپنی (شفقت) کا بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کہنا نہ مانیں تو کہدے کہ میں تمہارے کاموں سے الگ ہوں، اور اُس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھکو دیکھتا ہے جب تو (رات کو) اٹھتا ہے، اور نمازیوں میں تیری آمدورفت کو ملاحظہ کرتا ہے،

دشمنوں کے نرغہ میں ہونے کے باوجود آنحضرت صلعم تنہائی میں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر عبادتگذار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے۔ یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی، مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے، احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے، وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے،

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

اے پیغمبر خدا سے ڈر، اور کافروں اور منافقوں کا کہا نہ مان، بیشک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے، اور جو تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے وحی

بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفَىٰ	کیجاتی ہے، اس کے پیچھے چل، بیشک خدا تمہارے
بِاللّٰهِ وَكِيلًا،	کاموں سے خبردار ہے، اور اللہ پر بھروسہ رکھ، اور
(احزاب - ۱)	اللہ کام بنانے کو کافی ہے،

کفار سے مسلسل لڑائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ، اور مصالحت کرلو، اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد کہیں دھوکا نہ دیں، خدا پر بھروسہ رکھو تو اُن کے فریب کا داؤ کامیاب نہ ہوگا،

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	اور اگر وہ صلح کے لئے جھکیں، تو تو بھی جھک جا، اور
إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَإِنْ يُرِيدُوا	خدا پر بھروسہ رکھ، بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا
أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ	ہے، اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں
الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ،	کہ تجھے اللہ کافی ہے، اُسی نے تجھکو اپنی اور مسلمانوں
(انفال - ۸)	کی نصرت سے تیری تائید کی،

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، ان سے بھی بے خوف و خطر ہوکر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لئے کھڑے ہوجانے کا حکم ہوتا ہے،

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ	بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر
أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ وَإِنَّهُ	کردیتا ہے جن میں وہ مختلف ہیں، اور بیشک یہ قرآن
لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ إِنَّ رَبَّكَ	مسلمانوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہے، بیشک تیرا
يَقْضِي بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ	پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کردیگا،
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ	اور وہی غالب اور جاننے والا ہے، تو تو خدا پر بھروسہ
(نمل - ۶)	رکھ بیشک تو کھلے حق پر ہے،

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلون مین بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے، کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہین، اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہین، فرمایا،

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ، (فرقان - ۵)

اور مین نے تو (اے رسول) تجھے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، کہدے کہ مین تم سے اس کے سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہین مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ قبول کرے، اور اس زندہ رہنے والے پر بھروسہ کر جس کو موت نہین،

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کئے جاؤ، مخالفین کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو، جس کے سوا کوئی دوسرا با اختیار نہین،

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۔ (توبہ - ۱۶)

تو اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانین، تو (اُن سے) کہدو کہ مجھے اللہ بس ہے، نہین کوئی معبود، لیکن وہی، اسی پر مین نے بھروسہ کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے،

آپس کے اختلافات مین اللہ کا فیصلہ چاہیئے، اس حالت مین بھی اُسی پر بھروسہ ہے،

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۔ (شوریٰ - ۲)

اور جس چیز مین تم مین رائے کا اختلاف ہے، تو اوسکا فیصلہ خدا کی طرف ہے، وہی اللہ ہے میرا پروردگار، اُسی پر مین بھروسہ کرتا ہون، اور اُسی کی طرف رجوع کرتا ہون،

رسول کو خدا کی آیتین پڑھکر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے، اور تسلی دیجاتی ہے کہ اُن کے کفر و نافرمانی کی پروا نہ کرو، اور اپنی کامیابی کے لئے خدا پر بھروسہ رکھو،

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ

ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم مین بھیجا ہے جس سے پہلے

مِنْ قَبْلِهَا اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِیْ	بہت سی قومین گذر چکین، تاکہ تو ان کو وہ پیام سنائے
اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ	جو ہم نے تجھ پر وحی کیا ہے، اور وہ رحمان کے ماننے
قُلْ هُوَ رَبِّیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ	سے انکار کرتے ہین، کہدے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی
وَاِلَيْهِ مَتَابِ ۔ (رعد - ۴)	معبود نہین لیکن وہی، اسی پر مین نے بھروسہ کیا، اور
	اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے،

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہئے، اور گمراہون کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد اُن کی شرارتون سے پراگندہ خاطر نہ ہونا چاہئے، کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہئے،

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا	کہدے وہی رحم والا ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور
فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔	اسی پر بھروسہ کیا، تو تم جان لوگے کہ کون کھلی گمراہی
(الملک - ۲)	مین ہے،

جس طرح ہمارے رسولؐ کو اور عام مسلمانون کو ہر قسم کی مصیبتون، مخالفتون، اور مشکلون مین خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے، آپ سے پہلے پیغمبرون کو بھی اس قسم کے موقعون پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے اور خود اولوالعزم رسولون کی زبانون سے عملاً اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح علیہ السلام جب تن تنہا سالہا سال تک کافرون کے نرغہ مین پھنسے رہے، تو انھون نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنون کو یہ اعلان فرمادیا،

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ	(اے پیغمبر) ان کو نوحؑ کا حال سنا جب اس نے اپنی قوم
اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِیْ وَتَذْكِيْرِیْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	سے کہا، اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیون
فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَ	کے ساتھ میرا نصیحت کرنا تم پر شاق گذرتا ہے تو اللہ پر مین نے
شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ	بھروسہ کرلیا ہے، تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شریکون کو
غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۔ (یونس)	خوب مضبوط کرلو پھر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے، پھر اسکو مجھ پر پورا

غور کیجیے کہ حضرت نوح دشمنوں کے ہر قسم کے کر وفریب، سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرمارہے ہیں، حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے، تو وہ جواب میں فرماتے ہیں،

إِنِّي أُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ	میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں، اور تم بھی گواہ رہو کہ ان سے
مِّمَّا تُشْرِكُونَ مِن دُونِهِ فَكِيدُونِي جَمِيعًا	بیزار ہوں جنکو تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو، پھر
ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ، إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ	تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کرلو، پھر مجھے مہلت نہ دو
رَبِّي وَرَبِّكُمْ (ھود - ۵)	میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفتوں کی پروا نہیں، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے، وہ کرونگا، میرا تکیہ خدا پر ہے،

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ	میں تو جب تک مجھ میں طاقت ہے، کام سدھارنا
وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ	چاہتا ہوں، میری توفیق اللہ ہی سے ہے، اسی پر میں نے
وَإِلَيْهِ أُنِيبُ، (ھود - ۸)	بھروسہ کیا ہے، اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں،

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ صلعم کو تسلی دیجاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کے مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہیے،

قُلْ لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ	کہدو ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو
إِنَّا عَامِلُونَ، وَانتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ،	ہم بھی کرتے ہیں، اور تم بھی نتیجہ کا انتظار کرو، ہم بھی
وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَ	کرتے ہیں، اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے آسمانوں کا اور
إِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ	زمین کا چھپا بھید، اور اسی کیطرف سارے کاموں کا فیصلہ
عَلَيْهِ (ھود - ۱۰)	لوٹایا جاتا ہے، پھر اسکی عبادت کر، اور اس پر بھروسہ کر

مسلمانون کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے پیرؤن کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و قریب سب کو چھوڑ کر الگ ہوگئے، اور خدا کی راہ مین کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی،

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ
وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا
مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ
وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ
وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ
لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ
مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا
وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ
(ممتحنہ - ۱)

تمھارے لئے ابراہیم اور اُن کے ساتھیون مین پیروی
کا اچھا نمونہ ہے، جب انھون نے اپنی قوم سے کہا کہ
ہم تم سے اور خدا کے سوا جنکو تم پوجتے ہو اُن سے بیزار
ہین، ہم نے تمھارے مسلک کا انکار کر دیا، اور ہم مین
اور تم مین دشمنی اور نفرت ہمیشہ کیلئے کھل گئی، جبتک
تم ایک خدا پر ایمان نہ لاؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ
سے یہ کہنا کہ مین تمھارے لئے خدا سے دعا کرونگا، اور
مجھے خدا کے کام مین کوئی اختیار نہین، اے ہمارے
پروردگار تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا، اور تیری ہی طرف
ہم نے رجوع کیا، اور تیرے ہی پاس لوٹکر جانا ہے،

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹون کو مصر بھیجتے ہین، لیکن فرطِ محبت سے ڈرتے ہین کہ یوسف کی طرح اُن کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹون کو کہتے ہین، کہ تم سب شہر کے ایک دروازہ سے نہین، بلکہ متفرق دروازون سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارسازِ حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیرون سے اس کا حکم ٹل تھوڑا ہی سکتا ہے، اسلئے بھروسہ تدبیر پر نہین، بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے،

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ
وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ
مَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِنِ الْحُكْمُ

اور (یعقوب نے) کہا، اے میرے بیٹو! ایک دروازہ
سے نہ جانا، بلکہ الگ الگ دروازون سے جانا،
اور مین تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہین سکتا، فیصلہ

إِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۔ (یوسف - ۸)

اسی کا ہے، اسی پر مین نے بھروسہ کیا، اور اسی پر چاہیے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کرین،

حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ظاہری تدبیر شانِ توکّل کے منافی نہین،

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب مین جب ان کی قوم اُن کو زبردستی بت پرست بنجانے پر مجبور کرتی ہے، ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے، تو اس کے جواب مین وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہین،

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَا أَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَا إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۔ (اعراف - ۱۱)

اگر ہم پھر تمھارے مذہب مین آجائین جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا، تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا، اور یہ ہم سے نہین ہو سکتا کہ ہم پھر اُسین لوٹ کر جائین، مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز کو سمائے ہے، ہم نے خدا پر بھروسہ کیا، اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ مین تو حق کا فیصلہ کردے، اور تو ہی سب فیصلہ کرنے والون مین سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے،

حضرت موسٰی علیہ السلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زور و قوت کے مقابلہ مین بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکّل کی تعلیم دی، فرمایا،

يٰقَوْمِ إِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا إِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۔ (یونس - ۹)

اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لاچکے ہو، تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرمانبردار ہو،

اُن کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کیساتھ جواب دیا،

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (یونس - ۹) ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا ہمارے پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لئے آزمایش نہ بنا،

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا، اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے جس طرح سرفراز کیا، اس سے ہر شخص واقف ہے، یہ سب کچھ اُن کے اسی توکّل کے صدقہ میں ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرما دیا ہے،

مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (طلاق - ۱) جو خدا پر بھروسہ کریگا تو وہ اس کو کافی ہے،

یہ آیت پاک خانگی ومعاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے، کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے، اور دونوں میں قطعی علٰحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا نہ چاہئے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا، اور ہم کہاں سے کھائیں گے؟ ع خدا خود میر سامان است ارباب توکّل را،

توکّل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں، وہ ایک ایک کرکے آپکے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالئے کہ اُن میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے جنمیں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت، اور بزدل مخالفوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استحکام، عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں،

احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں آیا، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ میں اونٹ کو یونہی چھوڑ کر خدا پر توکّل کروں (کہ میرا اونٹ مجھکو مل جائیگا) یا اس کو باندھکر، ارشاد ہوا، اسکو باندھ کر خدا پر توکل کر[1]، اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے،

ع برتوکّل زانوے اشتر بہ بند،

[1] یہ حدیث بلفظ اعقلہا وتوکل ترمذی (آخر ابواب القیامۃ ص۱۳۲) میں، اور قیّدہا وتوکل شعب الایمان بیہقی میں، اور قیدھا وتوکل خطیب کی رواۃ مالک اور ابن عساکر میں ہے (کنز العمال جلد ۲ ص۱۳۳ حیدر آباد)،

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں تاہم حقیقت کے رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشا کے مطابق ہے۔
بعض لوگ تعویذ گنڈا، غیر شرعی[1] جھاڑ پھونک، ٹوٹکے وغیرہ پر یقین رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب و
تدابیر کو چھوڑ کر ان چیزوں سے مطلب برآری کرنا ہی توکّل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے[2] لیکن
آنحضرت صلعم نے ان کے اس خیال کی تردید کر دی، اور فرمایا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص
حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیئے جائینگے، یہ وہ ہونگے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے، جو بدشگونی کے قائل نہیں،
جو داغ نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے پروردگار پر توکّل اور اعتماد رکھتے ہیں[3]۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو داغتا
اور تعویذ گنڈا کراتا ہے، وہ توکّل سے محروم ہے[4]۔ اس سے مقصود نفس تدبیر کی مخالفت نہیں، بلکہ باطل اوہام کی بیخ کنی
ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا
جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں، اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں[5]۔ اس حدیث سے بھی مقصود
ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں، کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بٹھا کر روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ انکو
بھی اڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ
جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں وہ روزی کے لئے دلتنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں، اور اس کے حصول
کے لئے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، حالانکہ نہیں، اگر یہ یقین ہو کہ

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ۔ (ھود۔ ۱)　　زمین میں کوئی چلنے والا نہیں لیکن اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے،

تو وہ اس کے لئے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی، اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے، اور نہ ان کو دلتنگی اور

---

[1] شرعی کلمات حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں ہیں، اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے، لیکن آیات اور دعاؤں کا لکھ کر بدن میں لٹکانا یا گھول کر پینا، یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا ثابت نہیں۔ [2] صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یرق، و کتاب الرقاق و صحیح مسلم کتاب الایمان، جاہلیت میں اکثر بیماریوں کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے۔ [3] جامع ترمذی باب ما جاء فی کراہیۃ الرقی، اصل الفاظ یہ ہیں" من اکتوی او استرقی فقد برئ من التوکل، [4] جامع ترمذی ابواب الزہد ص۲۸۳ و حاکم،

مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے۔ ان حدیثون کا یہی مفہوم ہے جو قرآن پاک کی اس آیت مین ادا ہوا ہے،

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ	اور جو کوئی اللہ سے ڈرے، وہ اس کے لئے مشکل سے
مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ	نکلنے کا راستہ کردیگا، اور اس کو وہان سے روزی
عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ	دیگا جہان سے اسکو گمان نہ ہوگا، اور جو اللہ پر بھروسہ کریگا
قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔	تو وہ اس کو بس ہے، بیشک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچکر
(طلاق-۱)	رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کردیا ہے

اوپر کی تفصیلون سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آجکل کے اخلاقیات مین "خود اعتمادی" کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہین جنمین یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہین، اس لئے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے "خدا اعتمادی" کا نظریہ پیش کیا ہے، جو ان خطرون سے محفوظ ہے،

صبر

فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف-۴)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو بر تو پردے ڈال رکھے ہین، وہ اُن کے نزدیک بے بسی وبیکسی کی تصویر ہے، اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہین، لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی، صبر کے لغوی معنی "روکنے" اور "سہارنے" کے ہین، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اسکو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا، اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہین، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہین، حضرت موسیٰ اور خضرؑ کے قصہ مین ایک ہی آیت مین تین جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہین، حضرت خضرؑ کہتے ہین

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا۔ وَكَيْفَ	تم میرے ساتھ صبر نہ کرسکو گے، اور کیسے اُس بات پر
تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا، (کہف-۹)	صبر کرسکتے ہو جسکا علم تمہین نہین،

حضرت موسیٰؑ جواب مین فرماتے ہین،

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا، (کہف-۹)	اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائین گے،

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت مین غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل مین اضطراب اور بےچینی کا پیدا نہ ہونا ہے،

کفار اپنے پیغمبرون کے سمجھانے بجھانے کے باوجود، پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم

رہتے ہین، تو اسکی حکایت اُن کی زبان سے قرآن یون کرتا ہے،

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ — یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤن (بتوں)

صَبَرْنَا عَلَيْهَا، (فرقان - ۴) — سے ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم اُن پر صابر (ثابت) نہ رہتے

یعنی اگر ہم اپنے مذہب پر مضبوط اور ثابت قدم نہ رہتے، یہی مفہوم ایک اور آیت مین ہے، کفار آپس مین کہتے ہین

اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ (ص-۱) — کہ چلو اور اپنے خداؤن پر صبر کرو، (یعنی مضبوطی کیساتھ قائم رہو)

عرب گنوار آنحضرت صلعم کے حجرہ کے سامنے آکر بدتمیزی سے آپ کو پکارتے تھے، ان سے کہا گیا کہ اتنی گھبراہٹ کیا تھی، ذرا ٹھہر جاتے،

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ — اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے) یہانتک

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ، — کہ تم (اے رسول) نکل کر اُنکے پاس آتے تو اُن کے

(حجرات - ۱) — لئے بہتر ہوتا،

قرآن پاک مین صبر کا لفظ اسی ایک معنی مین مستعمل ہوا ہے، گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم مین کہین کہین ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، بااین ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت،

صبر کے یہ مختلف مفہوم جنمین قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہین،

وقت مناسب کا انتظار کرنا، پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا آنحضرت صلعم نے جب شروع مین لوگون کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی، تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت مین سرگرم جولان ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے، اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتین اور رکاوٹین پیش کی جانے لگین، تو اس وقت بشریت کے اقتضا سے آپ کو اضطراب ہوا، اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی، اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا، کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہین، آپ مستعدی سے اپنے کام مین لگے رہین، خدا آپ کا نگہبان ہے

خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئیگا، فرمایا،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ (طور-۲)
(اے رسول) تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے،

فَاصْبِرُوا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا۔ (اعراف-۱۱)
تو ثابت قدم رہکر منتظر رہو، یہانتک کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کردے

وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ (یونس-۱۱)
اور ثابت قدم رہکر منتظر رہ یہانتک کہ خدا فیصلہ کردے وہ سب سے فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے،

فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (ھود-۴)
ثابت قدم رہکر وقت کا منتظر رہ، بے شبہ آخر کار کامیابی پرہیزگاروں ہی کی ہے،

اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بیکسی، بیچارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو، اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش، اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہکر اس کی کامیابی کی پوری توقع رکھنی چاہیے،

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ۔ (روم-۶ مومن-۵و۸)
ثابت قدمی کیساتھ منتظر رہ، بیشک خدا کا وعدہ سچا ہے،

ایسا نہ ہو کہ وعدۂ الٰہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو، اور باطل کے گروہ میں ملجاؤ،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُوْرًا۔ (دھر-۲)
اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی سے منتظر رہ، اور ان (مخالفین میں) سے کسی گنہگار یا کافر کا کہا نہ مان لے،

آنحضرت صلعم کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا کہ ان کو خیال ہوا کہ اُن کی نافرمان قوم پر عذاب آنے میں تاخیر ہو رہی ہے، اس لئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، حالانکہ ان کی قوم دل میں مسلمان ہو چکی تھی، اسلئے وہ عذاب اس سے ٹل گیا تھا، ارشاد ہوا، کہ اے پیغمبر اس طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا سررشتہ چھوٹنے نہ پائے،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ
اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کے ساتھ

كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ، (ن - ۲) استغفار کرا اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو۔

بیقرار نہ ہونا۔ صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے، کہ مصیبتون اور مشکلون مین اضطراب اور بیقراری نہ ہو، بلکہ اُن کو خدا کا حکم، اور مصلحت سمجھکر خوشی خوشی جھیلا جائے، اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئیگا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود انکو دور فرما دیگا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگون کی مدح فرمائی،

وَالصَّابِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ ، (حج - ۵) اور جو مصیبت مین صبر کرین،

حضرت یعقوب علیہ السّلام بیٹون سے یہ جھوٹی خبر سنکر کہ بھیڑیے نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو کھا لیا، فرماتے ہین؛

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ، وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (یوسف - ۲)

بلکہ تمھارے دلون نے ایک بات گھڑ لی ہے۔ تو بہتر صبر ہے، اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے، جو تم بیان کرتے ہو،

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر مین روک لئے جانے کا حال سُنکر کہتے ہین:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ، (یوسف - ۱۰)

بلکہ تمھارے دلون نے گڑھ لیا ہے، تو بہتر صبر ہے، عنقریب خدا اُن سب کو ساتھ لائیگا،

حضرت ایوب علیہ السّلام نے جسمانی اور مالی مصیبتون کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا، اسکی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی،

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ (ص - ۴)

ہم نے بیشک ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ، وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا تھا،

حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھکر فرماتے ہین،

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ، (صافات - ۳)

اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے، وہ کر گذر، خدا نے چاہا تو تو مجھے صابرون مین سے پائیگا،

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے، کہ منزلِ مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں، دشمن تکلیفیں پہنچائیں، اور مخالفین جو طعن و طنز کریں، ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے، اور ان سے بد دل اور پست ہمت ہونے کے بجائے، اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو، بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے، مگر انھوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے، آنحضرت صلعم کو اسی لئے دوسری وحی میں جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا،

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ ...... اے چادر پوش! اٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر ....

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ. (مدثر-۱) اور اپنے پروردگار کے لئے پامردی (صبر) کر،

اس قسم کے مواقع اکثر انبیاء علیہم السلام کو پیش آئے، چنانچہ خود آنحضرت صلعم کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا،

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (اے محمدؐ!) تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پختہ ارادہ والے

وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ. (احقاف-۴) پیغمبروں نے کی، اور ان (مخالفوں) کے لئے جلدی نہ کر،

حضرت لقمانؑ کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کر، اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں اُن کا مردانہ وار مقابلہ کر،

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ اس کو برداشت کر، یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے،

عَزْمِ الْأُمُورِ. (لقمان-۲)

کفار عذابِ الٰہی کے جلد نہ آنے، یا حق کی ظاہری بیکسی و بے بسی کے سبب سے آنحضرت صلعم کو اپنے دلدوز طعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروا نہ کر، اور نہ اُن سے دل کو اداس کر، بلکہ اپنے دھن میں لگا رہ، اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا،

اصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ. (ص) اُنکے کہے پر صبر کر، اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کر،

اس قوتِ صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے، اور اسکی طاقت پر بھروسہ کیا جائے،

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ الآیہ (طٰہٰ ۔ ۸ رکوع ۔ ۳)

تو اُن کے کہنے پر صبر کر، اور صبح شام اپنے پروردگار کی حمد کر،

نہ صرف یہ کہ مخالفوں کے اس طعن وطنز کا دھیان نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جواب میں اُن سے لطف ومروت برتا جائے فرمایا،

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (مزمل ۔ ۱)

اُن کے کہے پر صبر کر، اور اُن سے خوبصورتی سے الگ ہو جا،

درگذر کرنا — صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز، اور جو بدخواہی سے پیش آئے، اور تکلیفیں دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے، یعنی تحمل، اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ، وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ (نحل ۔ ۱۶)

اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں کے لئے یہ بہتر ہے، اور تو صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہیں لیکن خدا کی مدد سے، اور اُن کا غم نہ کر، اور نہ انکی سازشوں سے دلتنگ ہو،

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے، مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے، یا کسی اور سبب سے نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے لئے ہو،

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ

اور جنھوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لیے صبر

وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ	کیا، اور نماز کھڑی کی، اور جو ہم نے اُن کو روزی دی
سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ	اس مین سے چھپے اور علانیہ (راہ خدا مین) خرچ کیا
السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ،	اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہین، ان کے لئے آخرت
فرشتے اُن کو مبارکباد دینگے اور کہین گے،	
سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی	تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا، تو آخرت کا
الدَّارِ، (رعد - ۳)	انجام کیا اچھا ہوا،

ایک خاص بات اس آیت مین خیال کرنے کے لائق ہے، کہ اس کے شروع مین چند نیکیون کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی مگر فرشتون نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہی، کیونکہ یہی اصل ہے، جس مین یہ جوہر ہوگا وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائیگا مصیبتون کو بھی جھیلے گا، اور دشمنون کی بدی کا جواب نیکی سے بھی دیگا، چنانچہ ایک اور آیت مین اس کی تشریح بھی کردی گئی ہے، کہ درگذر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس مین ہوگی جس مین صبر ہوگا،

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ	بھلائی اور برائی برابر نہین، برائی کا جواب اچھائی
بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ	سے دو، تو یکبارگی جس کے اور تمھارے درمیان
بَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ وَمَا	دشمنی ہے، وہ قریبی دوست سا ہوجائیگا، اور یہ
یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا	بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہین، اور یہ اسی کو
ذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ، (فصلت - ۵)	ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے،

جو لوگون پر ظلم کرتے پھرتے ہین، اور ملک مین ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہین، اُنپر خدا کا عذاب ہوگا، اس لئے ایک صاحب عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کرین تو بہادری سے اس کو برداشت کرے، اور معاف کردے، فرمایا،

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ	راستہ انھیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، اور ملک
وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ	میں ناحق فساد کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لئے پُردرد
لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ	عذاب ہے، اور البتہ جس نے برداشت کیا، اور بخش
إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ، (شوریٰ ۴)	دیا، بیشک یہ بڑی ہمت کا کام ہے،

ثابت قدمی صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے، قرآنِ پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے، اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے، صادق القول اور راستباز ٹھہرایا ہے، کہ انھوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، فرمایا،

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَ	اور صبر کرنے والے (ثابت قدمی دکھانے والے) مصیبت
حِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا	میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت، وہی ہیں
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۔ (بقرہ - ۲۲)	جو سچ بولے، اور وہی پرہیزگار ہیں،

اگر لڑائی آپڑے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں، خدا کی یاد، امامِ وقت کی اطاعت، آپس میں اتحاد وموافقت، اور میدانِ جنگ میں بہادرانہ صبر واستقامت،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً	اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو، تو
فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ	ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ فلاح
وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا	پاؤ، اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو،
فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا	اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تم سست ہو جاؤ گے
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ،	اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر دکھاؤ، بیشک
(انفال - ۶)	اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے،

حق کے مددگاروں کی ظاہری قلتِ تعداد کی تلافی اسی صبر وثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے، تاریخ

کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گذرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادرون نے فوج کی فوج کو شکست دیدی ہے، اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جان نثارون کو سکھادیا تھا جب ان کی تعداد تھوڑی، اور دشمنون کی بڑی تھی

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ
إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا
مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ
الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ. الْآنَ
خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا
فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ
وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ
وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ،
(انفال-۹)

اے پیغمبر! ایمان والون کو (دشمنون کی) لڑائی پر ابھار
اگر یہ بیس صبر والے (ثابت قدم) ہون تو دو سو پر غالب
ہونگے، اور اگر سو ہون تو کافرون مین سے ہزار پر غالب
ہونگے، کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہین، اب اللہ نے تم سے
تخفیف کردی، اور اس کو معلوم ہے کہ تم مین کمزوری
ہے، تو اگر سو صبر والے (ثابت قدم) ہون تو دو سو
پر غالب ہونگے، اور اگر ہزار (صبر والے) ہون تو دو ہزار
پر خدا کے حکم سے غالب ہونگے، اور اللہ صبر کرنے والون
(ثابت قدمون) کے ساتھ ہے،

میدان کارزار مین مسلمانون کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعداد کی قلت کی پروا نہ کرین، اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دوچند کا مقابلہ کرین، اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد انھین لوگون کے ساتھ ہوتی ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہین حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ مین بھی اسی نکتہ کو ان لفظون مین ادا کیا گیا ہے،

قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ
قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن
فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ
وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ. وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ
وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا

طالوت کے ساتھیون نے کہا کہ آج ہم مین جالوت
اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہین انھون نے
جن کو خیال تھا کہ خدا سے ملنا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات
تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد
کے لوگون پر غالب آئے ہین، اور خدا صبر و ثبات

وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ،

(بقرہ - ۳۳)

دکھانے والوں کے ساتھ ہے، اور جب یہ جالوت اور اسکی فوج کے مقابلہ مین آئے، تو بولے اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر بہا، اور ہم کو ثابت قدمی بخش، اور ان کافروں کے مقابلہ مین ہم کو نصرت عطا کر،

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے، اور بتادیا ہے کہ خدا انہیں کا ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں،

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْا،

(نحل - ۱۴)

پھر تیرا پروردگار اُن کے لئے ہے جنھوں نے ایذا پانے کے بعد گھر بار چھوڑا، پھر لڑتے رہے، اور صبر و ثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے،

دنیا کی سلطنت و حکومت ملنے کے لئے بھی اسی صبر و استقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آپڑا، تو حضرت موسیٰؑ نے انکو پہلا سبق یہ سکھایا،

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ.

(اعراف، ۱۵)

موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو، اور صبر و استقامت سے کام لو، بیشک زمین خدا کی ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں اس کا مالک بناتا ہے، اور انجام پرہیزگاروں کے لئے ہے،

چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قوموں سے تعداد مین بہت کم تھے لیکن جب انھوں نے ہمت دکھائی، اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کئے تو اُن کی ساری مشکلین حل ہوگئیں، اور کثیر التعداد دشمنوں کے نرغہ مین پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ

صبر میں ظاہر کیا ہے، فرمایا:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ	اور اُن لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کی
مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا	وراثت بخشی جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے، اور
فِیْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْٓ	تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق
اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ	میں اُن کے صبر و ثبات کے سبب سے پوری ہوئی
یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ	اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو
(اعراف - ۱۶)	اور تعمیروں کو برباد کر دیا،

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لئے سربلند ہوئی کہ انھوں نے صبر اور ثابت قدمی سے کام لیا، اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی،

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا	اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے اپنے پیشوا بنائے
لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ،	جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے، جب انھوں نے
(سجدہ - ۳)	صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے،

آیتِ بالا نے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہیں، ایک احکام الٰہی پر یقین، اور دوسرے ان احکام کی بجاآوری میں صبر اور ثبات قدم، یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگِ بنیاد ہیں، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا بشدت یقین، اور پھر اُن اصولوں کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا،

غزوۂ احد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوئی، بلکہ ستر مسلمان خاک و خون میں لتھڑ کر راہِ خدا میں جانیں دیتے ہیں، بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے اس حزن و ملال کے ازالہ کے لئے

پچھلے پیغمبرون کی زندگی کی روداد اُن کو سناتا ہے،

وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ، وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ،

(آل عمران - ۱۵)

اور کتنے پیغمبر ہین جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہین، پھر خدا کی راہ مین تکلیف اٹھا کر انھون نے ہمت نہین ہاری، اور نہ اُنکے دل کمزور ہوئے، اور اللہ ثابت رہنے والون (صابرین) کو دوست رکھتا ہے، اور وہ یہی کہتے رہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہون کو اور کام مین ہماری زیادتی کو معاف کر، اور ہمارے قدم ثابت رکھ، اور کافرون کے مقابلہ مین ہماری مدد فرما،

اس آیتِ پاک نے غلط فہمیون کے اُن تو بر تو پردون کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے ہین، اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بیکسی کے مجبورانہ درگذر کا نہین، بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر مین نہ لانے کا نام ہے، ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثون کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے، اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے، اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کرکے حق کے دشمنون پر کامیابی بخشے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانون کو دو باتون کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا،

دنیا کی فتحیابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جسکا نام جنت ہے انھین کے حصہ مین ہے جن کو یہ پامردی، دل کی مضبوطی، اور حق پر ثباتِ قدم کی دولت ملی، حق کی راہ مین مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اُن سے

کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے، اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ فرمایا،

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِينَ (آل عمران-۱۴)

کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے، اور ابھی اللہ نے (داغ نہ کر) ان کو الگ نہیں کر دیا جو لڑنے والے ہیں اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں۔

ضبط نفس اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے، جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں، اس وقت نفس پر قابو رکھنا، اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے، اگر یہی ضبط نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے، اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار، اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت توام ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبط نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے، یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو، اور غم و تکلیف میں وہ اداس اور بددل نہ ہو، دل کے ان دونوں عیبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبط نفس ہے، انسانی فطرت کے رازدار کا کہنا ہے،

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ، وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ (هود-۲)

اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں، پھر اس سے اس کو اتار لیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں، تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں، بیشک وہ شادان اور نازاں ہے، لیکن وہ جنھوں نے صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کئے، یہ لوگ ہیں جن کے لئے معافی اور بڑا اجر ہے۔

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے ایک معنی کر بڑھ کر وہ

صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے مذہبی فرائض واحکام کو جو بہرحال نفس پر سخت گذرتے ہیں، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری، اور عبودیت پر ثبات نفسِ انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے، اسی لئے حکم ہوا،

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ، (مریم - ۴)

آسمانوں کا پروردگار، اور زمین کا، اور جو ان دونوں کے بیچ میں ہے سب کا، تو اس کی بندگی کر، اور اسکی بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل وعیال پر بھی اسکی تاکید رکھنے کے سلسلہ میں ہے،

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طہٰ - ۸)

اور اپنے گھروالوں کو نماز کا حکم کر، اور آپ اس پر قائم رہ،

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے،

حسب ذیل آیتوں میں غالباً صبر اسی مفہوم میں ہے، وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے اللہ تعالیٰ ان کو خوشخبری سناتا ہے،

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا، وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا، (دہر - ۱)

تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے بچا لیا اور ان کو تروتازگی وشادمانی سے ملایا، اور ان کے صبر کرنے (یعنی احکامِ الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا،

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریب کے کاموں میں شریک نہ ہوں بیہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گذر جائیں، اور خدا کی باتوں کو سنکر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں، انکے

لئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کی یہ بشارت سناتا ہے،

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا (فرقان) ان کو بہشت کا جھروکہ بدلہ میں ملیگا کہ وہ صبر کرتے رہے

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو بار خاطر، خلاف طبع اور تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے، اور بری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے بچتے رہے، راتوں کو نرم بستروں سے اٹھکر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خواب سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر دوگانہ ادا کرنا، الوانِ نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا، تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر بھی سچائی سے باز نہ آنا، قبولِ حق کی راہ میں شدائد کو آرام و راحتِ جان کر جھیل لینا، سود کی دولت سے ہاتھ اٹھا لینا، حسن وجمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے، اور اسی لئے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے۔

ان آیاتِ پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے، جس میں آنحضرت صلعم نے فرمایا،

حُجبت (حفّتِ) الجنّة بالمكاره وحجبت (حفّتِ) النَّارُ بِالشَّهوات (صحیح بخاری کتاب الرقاق وصحیح مسلم، کتاب الجنة) جنت ناخوشی کے کاموں، اور دوزخ نفسانی لذتوں کے کاموں سے ڈھانپی گئی ہے،

یعنی نیکی کے ان کاموں کا کرنا جنکا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا میں نفس پر شاق گذرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے، اس وقت دنیا میں بڑے پرلطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں، اس عارضی وہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کئے بغیر احکامِ الٰہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے، کسی قارون کے خزانہ مال ودولت کی فراوانی اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر، اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھرآئے اور اس وقت بھی مالِ حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے مالِ حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کرلے، تو یہ بڑی قوت کا کام ہے، جو صرف صابروں کو ملی ہے۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ مین جو قارون تھا اس کے مال و دولت کو دیکھکر بہت سے ظاہر پرست لالچ مین پڑگئے، لیکن جنمین صبر و برداشت کا جوہر تھا اُن کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی، اور اُن کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے، خدا کی وہ دولت جونکوکارون کو بہشت مین ملیگی، وہ لازوال، غیرفانی اور جاودانی ہے۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ،

(قصص - ۸)

جو لوگ حیات دنیاوی کی آرایش کے خواہان تھے وہ بولے اے کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا، وہ بڑا خوش قسمت ہے، اور جنھین علم ملا تھا انھون نے کہا، تمھارا برا ہے، اللہ کی جزا ان کے لئے جو ایمان لایا اور نیک کام کئے سب سے اچھی چیز ہے، اور اس حقیقت کو وہی پا سکتے ہین جو صابر ہین،

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی، کیونکہ یہ اس خزانے سے ملیگی جو لازوال اور باقی ہے،

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ، وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (نحل - ۱۳)

جو تمھارے پاس ہے وہ چک جائیگا، اور جو خدا کے پاس ہے وہ رہجانے والا ہے، اور یقیناً ہم اُن کو جنھون نے صبر کیا ان کی مزدوری اُن کے بہتر کامون (کے لحاظ سے دینگے)

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازین ادا کیا کرو، کہ نیکیان بدیون کو دھو دیتی ہین، اس پیغام مین نصیحت قبول کرنے والون کے لئے نصیحت اور یاددہانی ہے، اسکے بعد ہے

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ

(ھود - ۱۰)

اور صبر کر، کہ بے شبہ اللہ نیک کام کرنے والون کی مزدوری ضائع نہین کرتا۔

صبر کے فضائل و انعامات | یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی۔

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ، (زمر - ۲) صبر کرنے والون کو توانکی مزدوری بے حساب ملیگی،

جن محاسن اور محامد صفات، اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت مین سب سے زیادہ ہے، اُن مین صبر برداشت کا بھی شمار ہے،

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ

بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتین، اور ایماندار مرد

وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَ

اور ایماندار عورتین، اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی

الصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ

کرنے والی عورتین، اور محنت سہنے والے مرد (صابرین)

وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ

اور محنت سہنے والی عورتین (صابرات) اور (خدا کے

وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصّٰٓئِمِيْنَ

سامنے) جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتین، اور

وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ

خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتین،

وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ

اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتین، اور اپنی شرمگاہون

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا،

کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی

عورتین اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد

کرنے والی عورتین، اللہ نے اُن کیلئے تیار رکھی ہے معافی اور بڑا اجر

(احزاب-۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیون کے برابر ہے، اس سے انسان کی پچھلی غلطیان حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہین اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اسکے معاوضہ مین ملتی ہے یہی بشارت ایک اور آیت مین بھی ہے،

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا

(جنت اور خدا کی خوشنودی اُنکو حاصل ہوگی) جو کہتے ہین کہ

ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اَلصّٰبِرِيْنَ

اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لاچکے، ہمارے گناہون

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَ

کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، اور صبر کرنے

الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ،

والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھا لینے والے) اور

پیچ بولنے والے اور بندگی مین لگے رہنے والے اور (خدا

(آلعمران - ۲) کی راہ مین) خرچ کرنے والے اور پچھلی راتون کو خدا سے

اپنے گناہون کی معافی مانگنے والے،

اس آیت مین ایک عجیب نکتہ ہے، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے، اور ان دونون کے بیچ مین اُن کے چار اوصاف گنائے ہین جنمین پہلا درجہ صبر یعنی سخت سہارنے تکلیف جھیلنے، اور پامردی دکھانے کا ہے، دوسرا راستی اور راست بازی کا تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا۔ اور چوتھا راہِ خدا مین خرچ کرنے کا،

فتح مشکلات کی کنجی: صبر اور دعا

بعض آیتون مین ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظون مین سمیٹ لیا گیا ہے، دعا، اور صبر، اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزین مشکلات کے طلسم کی کنجی ہین، یہود جو آنحضرت صلعم کے پیغام کو قبول نہین کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ اُن کے دلون مین گداز اور تاثر نہین رہا تھا، اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ اُن کو جو بدنی و مالی دشواریان پیش آتین، یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر اُن کو برداشت نہین کر سکتے تھے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلعم کی طب روحانی نے ان کی بیماری کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا،

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۔ (بقرہ - ۵) اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو،

دعا سے اُن کے دل مین اثر، اور طبیعت مین گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبولِ حق کی راہ کی سنگین دور ہونگی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانون کے برخلاف تلوارین اٹھائین، اور مسلمانون کے ایمان کیلئے اخلاص کی ترازو مین تلنے کا وقت آیا تو یہ آیتین نازل ہوئین،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ

اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت پکڑو، بیشک اللہ صبر والون (ثابت قدم رہنے والون) کے ساتھ ہے، اور جو خدا کی راہ مین مارے جاتے ہین

بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ
بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ
الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ
الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ
اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ
(بقرہ ۔ ۱۹)

ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ زندہ ہین، لیکن تم کو خبر نہین اور
ہم تم کو کسی قدر خطرہ، اور بھوک، اور مال وجان اُور
پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائینگے، اور صبر والون
(یعنی ثابت قدم رہنے والون) کو خوشخبری سنادو،
جن کو جب کوئی مصیبت پیش آئے تو کہین کہ ہم
اللہ کے ہین، اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے
یہ لوگ ہین، اُن پر اُن کے پروردگار کی شاباشین اور
مہربانیان ہین، اور یہی ہین ٹھیک راہ پر،

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانون کو کیونکر زندہ رہنا چاہئے، جان ومال کی جو مصیبت پیش آئے اُس کو صبر، ضبطِ نفس، اور ثابت قدمی سے برداشت کرین، اور یہ سمجھین کہ ہم خدا کے محکوم ہین، آخر بازگشت اسی کی طرف ہوگی، اس لئے حق کی راہ مین مرنے اور مال ودولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہئے، اگر اس راہ مین موت بھی آجائے تو وہ حیاتِ جاوید کی بشارت ہی ہے،

شکر

وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِيْنَ۔ (اعراف-۱۷)

لُغت مین شکر کے اصلی معنی یہ ہین کہ جانور مین تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہو، اور دودھ زیادہ دے، اس سے انسانون کے محاورہ مین یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کردے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے، یہ قدر شناسی تین طریقون سے ہوسکتی ہے، دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤن سے، یعنی دل مین اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو، زبان سے اُس کے کامون کا اقرار ہو، اور ہاتھ پانون سے اُس کے ان کامون کے جواب مین ایسے افعال صادر ہون جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کرین،

شکر کی نسبت جس طرح بندون کی طرف کیجاتی ہے، خدا نے قرآنِ پاک مین اپنی طرف بھی کی ہے، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندون کے ذرا ذرا سے نیک کامون کی پوری قدر کرتا ہے، اور ان کو اُن کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے،

شکر کا الٹا کفر ہے، اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہین، اور محاورہ مین کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اُسکے اقرار اور عمل سے اُس کے اظہار نہ کرنے کے ہین، اسی سے ہماری زبان مین کفرانِ نعمت کا لفظ استعمال مین ہے،

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کے لغت مین نہین، اللہ پاک کے احسانون اور

نعمتون کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے اُن کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا، کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے،

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ مین بدترین خصلت ہے، اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآنِ پاک مین یہ دونون لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہین،

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا، (دھر-۱)

ہم نے انسان کو راستہ بتادیا، (اب وہ) یا شکر گذار (شاکر) ہے، یا ناشکرا کافر،

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ، (ابراہیم-۲)

اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمہین بڑھائینگے، اور اگر ناشکری (کفر) کی تو بیشک میرا عذاب بہت سخت ہے،

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانون اور نعمتون کی ناقدری کرکے اس کی نافرمانی کا نام ہے، تو اس کے مقابلہ مین شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتون کی قدر جان کر اسکے احکام کی اطاعت، اور دل سے فرمانبرداری کیجائے، حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے،

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ شَاكِرًا لِأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (نحل-۱۶)

درحقیقت ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا فرمانبردار اسکو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنے والون مین سے نہ تھا، اللہ کے احسانون اور نعمتون کا شکرگذار، اللہ نے اسکو چن لیا، اور اس کو سیدھی راہ دکھائی،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتون اور احسانون کی شکرگذاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کیجائے احکامِ الٰہی کی پیروی کیجائے، اور شرک سے پرہیز کیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائیگا اور ہر علم و عمل مین ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے، یہی وہ جذبہ ہے جس کی

بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہئے، اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی وعملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (نساء-۲۱) اگر تم شکر کرو، اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دیکر کیا کریگا، اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے،

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے، شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے، اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے، ساری عبادتیں شکر ہیں، بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولتمند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے، تو یہ دولت کا شکر ہے، صاحب علم اپنے علم سے بندگانِ الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور، کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت وطاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے، الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیلیں ہیں، اسی لئے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہونگے، تو یہ کہا،

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ (اعراف-۲) تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائیگا،

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا،

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِيْنَ (آل عمران-۱۵) اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دینگے،

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے۔

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِيْنَ (زمر-۶) بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گذاروں میں سے ہو،

شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں، کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں، کبھی اُس کا بدلہ دیکر اس قرض کو اتارتے ہیں، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے، اور یہی سبب ہے کہ حمد الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے اُن صفاتِ کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں، اور اسی لئے یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورہ فاتحہ

ہے: سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر قرآنِ پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ سے، اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمد سے ہی،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، (فاتحہ-۱) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے،

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہیں سب کی پرورش، اور زندگی اور بقا اس ایک کا کام ہے، اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں، اور نکھر رہے ہیں، اس لئے حمد اسی ایک کی ہے، یہ تو دنیا کے نیرنگ قدرت کا آغاز ہے، لیکن دنیا جب اپنی تمام منازلِ حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی، اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا میں اپنی زندگی پا چکیگا، یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہلِ جنت جنت میں اور اہلِ دوزخ دوزخ میں جا چکینگے، وہ وہ وقت ہوگا جب دنیا اپنے اُس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی جس کے لئے خدا نے اس کو بنایا تھا، اس وقت عالمِ امکان کے ہر گوشہ سے یہ سریلی آواز بلند ہوگی،

وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، (زمر-۸) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے،

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے،

لَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، (روم-۲) اُسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہی،

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں،

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ جو عرش کو اٹھائے ہیں، اور جو اس کے چاروں طرف
یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّہِمْ، (مومن-۱) ہیں وہ اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح کرتے ہیں،

بلکہ عرصۂ وجود کی ہر چیز اُس کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے،

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ، اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی
(بنی اسرائیل-۵) تسبیح نہ کرتی ہو،

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے، جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے،

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ، (حجر، طٰہٰ، مومن، طور، فرقان) اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر،

آنحضرت صلعم کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائیں ہیں، مثلاً کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سو کر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد میں جانے کی، طہارت خانہ سے نکلنے کی وغیرہ وغیرہ ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اُسکا شکریہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکر دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہیئے،

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتیں عنایت فرمائی ہیں اُن کا شکریہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کو خدا کے حکموں کی تعمیل میں لگا رکھیں، اور اُن سے اُن کی خدمت کریں جو اس جسمانی نعمت کے کسی جزء سے محروم ہیں مثلاً جو اپاہج اور معذور ہوں، بیمار ہوں، کسی جسمانی قوت سے محروم ہوں یا کسی عضو سے بیکار ہوں، مالی نعمتوں کا شکریہ یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہوں، اُن کو اس سے حصہ دیا جائے، بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے پیاسوں کو پانی پلایا جائے، ننگوں کو کپڑا پہنایا جائے، بے سرمایوں کو سرمایہ دیا جائے،

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لئے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے،

تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ	بڑی برکت اسکی ہے جس نے آسمان میں برج بنائے
جَعَلَ فِیْھَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا، وَھُوَ الَّذِیْ	اور اس میں ایک چراغ اور اجالا کرنے والا چاند رکھا
جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ خِلْفَۃً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ	اور اسی نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک
یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا۔ (فرقان-۶)	آتا ہے، اس کے واسطے جو دھیان رکھنا یا شکر کرنا چاہے

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے، یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں، اور دن کی روشنی اور چاند کے اُجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرض ادا کریں

جس کے لئے یہ چیزین ہم کو بنا کر دی گئی ہین، دوسری آیتون مین ہے،

. . . الرَّحِيمُ الَّذِيٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ
خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ
ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ
مَّهِيْنٍ، ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ
وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ
قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ . (سجدہ-۱)

بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی، اور انسان
کی پیدایش ایک گارے سے شروع کی، پھر اس کی
اولاد کو بے قدر سے نچڑے ہوئے پانی سے بنایا،
پھر اس کو درست کیا، اور اس مین اپنی روح سے کچھ
پھونکا، اور تمھارے کان، اور آنکھین اور دل بنائے
تم کم شکر کرتے ہو،

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ
لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا، وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ
وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (نحل)

اور اللہ نے تم کو تمھاری ماؤن کے پیٹون سے باہر
نکالا، تم کچھ جانتے نہ تھے، اور تمھارے لئے کان اور
آنکھین اور دل بنائے،

ان آیتون مین خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان، اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے، یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریائی اور یکتائی کو تسلیم کرین، اور یہ سمجھین کہ جسنے یہ زندگی دی، اور اس زندگی مین ہم کو یون بنا دیا، وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے، اور اس مین بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے، اور پھر ہاتھ پاؤن سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کرین، بعض اور آیتون مین ہے،

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ
كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ
(حج-۵)

تو ان جانورون کے گوشت مین سے کچھ آپ کھاؤ
اور کچھ ان کو کھلاؤ جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بیقرار
ہے، اسی طرح ہم نے وہ جانور تمھارے قابو مین دیئے
ہین، تاکہ تم شکر کرو،

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ، (بقرہ - ۲۱)

اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور خدا کا شکر کرو،

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔ (نحل - ۱۵)

تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی کیں انکو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اسی کو پوجتے ہو،

یہ مالی نعمت کا بیان تھا اسکا شکریہ بھی خدا کو مانگر مال کے ذریعہ ادا کریں،

دنیا میں شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں، اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے،

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ، (قصص - ۸)

اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر،

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے، ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہیں، کہ اسکو کوئی قرضہ دے، خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورتمند بندوں کو یا قابل ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے، ارشاد ہوتا ہے،

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔

کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے،

(بقرہ - ۳۲ - وحدید - ۲)

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، (حدید - ۲ و مزمل)

اور خدا کو قرض حسنہ دو،

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، (تغابن - ۲)

اگر خدا کو قرض حسنہ دوگے

خدا کو قرض حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی، اسکی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہیے،

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمائیگا،

اے آدم کے بیٹے! مین بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہیگا، اے میرے پروردگار، تو تو جہان کا پروردگار ہے مین تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائیگا، کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلان بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی پرسش نہ کی، اور اگر کرتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر خدا فرمائیگا اے آدم کے بیٹے! مین نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے مجھے نہین کھلایا، بندہ عرض کریگا اے میرے پروردگار، تو تو سارے جہان کا رب ہے، مین تجھے کیسے کھلاتا، فرمائیگا، تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلان بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے اس کو نہین کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے! مین نے تجھسے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہین پلایا، بندہ کہے گا، اے میرے پروردگار تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے، مین تجھے کیسے پانی پلاتا، فرمائیگا، میرے فلان بندہ نے تجھسے پانی مانگا، تو نے اس کو نہین پلایا، اگر تو اس کو پلاتا، تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا"[1]

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتون کا جانی اور مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیونکر اتارنا چاہئے،

اللہ تعالی نے اپنی نعمتون کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لئے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگین کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتون کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے، حالانکہ اُن کے لئے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا، نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی پایہ، جو کچھ ملا اُسکے فضل و کرم سے ملا، اور جو کچھ ملیگا وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی، انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششون کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہین، دیکھکر اور اُن کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہین، بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے، جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت نہین، مگر خوب سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلین نکلتی ہین، اسی لئے

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض،

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے، اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ ربوبیتِ الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے اور بار آور بنائے،

دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے، اور جو اس کو ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا، یا اس کے یہ ذاتی علم و ہنر کا نتیجہ تھا، جیسا کہ قارون نے کہا تھا، یہی غرور ہے جو ترقی کرکے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کرلیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی، اور ارشاد ہوا،

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۣ ، الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ، (حدید - ۳)

(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا، اس پر اتراؤ نہیں، اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا، جو خود کنجوس ہیں، اور لوگوں کو بھی کنجوس بننے کو کہتے ہیں، اور جو (اللہ کی بات سے) منہ موڑے گا (تو اللہ کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد (یعنی حسن و خوبی) سے مالا مال ہے،

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے، کہ وہ تو غنی ہے، اور نہ ان کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے،

خدا نے انسانوں پر جو تو بر تو نعمتیں اتاری ہیں، اور اپنی لگاتار بخششوں سے ان کو جو نوازا ہے، اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانے، اس کے مرتبہ کو جانے، اس کے حق کو مانے، اور اس کی نعمت و بخشش کا مناسب شکر اپنے جان و مال و دل سے ادا کرے،

وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ، (انفال - ۳)

اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی دیں تاکہ تم شکر کرو،

وَھُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْکُلُوْا مِنْہُ

اور اسی نے سمندر کو تمھارے بس میں کر دیا کہ تم اس سے

لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا
وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا
مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔
(نحل-۲)

تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے آرائش کی چیز نکالو جس کو تم پہنتے ہو (یعنی موتی) اور تم جہازوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس میں پانی کو پھاڑتے رہتے ہیں اور تاکہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو اور تاکہ شکر کرو،

وَكَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ
(حج-۵)

اور اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم شکر کرو،

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ
لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (قصص-۷)

اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو) اسکے فضل و کرم کی تلاش کرو، اور تاکہ تم شکر کرو،

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جنہیں اللہ تعالی نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشا یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اور دل سے اس کے احسان کو مانے لیکن گنہگار انسان کا کیا حال ہے،

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۔ (یونس-۶)

اللہ نے انسانوں پر بڑے بڑے فضل کیے لیکن ان میں سے بہت کم شکر کرتے ہیں،

لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ
فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۔
(اعراف-۱)

اور ہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی، اور اس میں تمہارے لئے بسراوقات کے بہت سے ذریعے بنائے، تم بہت کم شکر کرتے ہو،

ایک موقع پر تو اللہ تعالی نے انسان کی اس ناشکری پر پُرمحبت غضب کا اظہار بھی فرمایا،

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۔ (عبس-۱)

مارے جائیو انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے،

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں، کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا،

تو مالک کا شکر ادا ہو گیا، حالانکہ یہ صحیح نہین ہے، شکر دراصل دل کے اُس لطیف احساس کا نام ہے، جسکے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہین، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہین، اور اُس کے لئے سراپا سپاس بنتے ہین، اور کوشش کرتے ہین، کہ ہم اس کو خوش رکھ سکین اور اسکی فرمایشون کو پورا کرتے رہین، اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کرین، لیکن دل مین احسانمندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو، اور اس اثر اور کیف کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو، تو ہم اس محسن کی احسانمندی کے اظہار مین جھوٹے ہین، اور وہ شکر خدا کی بارگاہ مین قبول نہین اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو اپنے پے درپے احسانات سے جس طرح نوازا، اس کے بیان کرنے کے بعد اُن کو خطاب کر کے فرماتا ہے،

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا، (سبا - ۲) اے داؤد کے گھر والو، شکر ادا کرنے کیلئے نیک عمل کرو

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہئے، اسی لئے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہین،

رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ، (نمل - ۲)

اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر کہ مین تیرے اُس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے، شکر کرون اور وہ نیک کام کرون جو تجھے پسند ہو

اس دعا مین بھی یہ اشارہ ہے کہ شکر مین، شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو دل مین یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گذار بندون کے حق مین جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائینگے، مین اُن کے لئے اپنی نعمتون کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤنگا، اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لئے اپنے عمل مین سرگرم ہوتا جاتا ہے، اس کی طرف سے شکرانہ عمل کی ہرنئی سرگرمی کے جواب مین اس کو نئی نئی نعمتین اور عنایت ہوتی جاتی ہین، اسی لئے فرمایا،

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اگر تم شکر ادا کرو گے تو مین تم کو اور بڑھاؤن گا ۔

اِنَّ عَذَابِی لَشَدِیدٌ ، (ابراھیم-۲) اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے،

كَذٰلِكَ نَجْزِی مَن شَكَرَ ، (قمر-۲) ہم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہین جس نے شکر کیا،

وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِینَ ، (آل عمران - ۱۵) اور ہم شکر کرنے والون کو جزا دینگے،

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل مین ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا مین بھلائی کے لئے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتون کی قدر جانکر اس کو مانے گا، اور اُس کے حکمون پر چلے گا اور اس کے بندون کے ساتھ شکرانہ مین بھلائی کریگا، اور خود بندون کے احسانات کے جواب مین بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کریگا، بلکہ آنحضرت صلعم نے خود آپس مین ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گذاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گذاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا مَن لَّا یَشْكُرِ النَّاسَ لَا یَشْكُرِ اللّٰهَ (ترمذی کتاب البر والصلة) یعنی جو انسانون کا شکر ادا نہ کریگا، وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کریگا، اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانون کے احسانون کا شکریہ ادا نہ کریگا، تو خدا بھی اپنے احسانون کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائیگا،

خاتمہ

کتاب کی پانچوین جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہوگئی، ان صفحات مین آنحضرت صلعم کی اُن تعلیمات کا بیان تھا جو عبادات کے باب مین آپنے فرمائی ہین، ان تعلیمات کے ایک ایک حرف پر غور کیجئے کہ انھون نے وہم پرستیون اور غلط فہمیون کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جز ہے، اسکی حقیقت کتنی واضح کر دی، عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپکو سکھائے، اور آپنے وہ انسانون کو بتائے، وہ کتنے مکمل ہین اور ان کا ایک ایک آئین آپکے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل اور دین و دنیا کی مصلحتون پر مشتمل ہے، اور آپنے اُن کے ذریعہ انسانی دلون کی کمزوریون اور روح کی بیماریون کا کس طرح علاج فرمایا ہے،

آنحضرت صلعم کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہین ہے، اور انھین مین سے ایک یہ ہے کہ آپکی تعلیم جسمین عبادت بھی داخل ہے، عملاً صاف، واضح، اور متعین ہے، اور زمانہ مابعد مین انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیون سے مبرا ہے، اور اُسکا اس طرح ہونا اسلئے ضروری تھا کہ اسپر نوع انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے، اسلئے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہئے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی امداد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا اُنپر اپنی رحمتین اور برکتین اُتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا جس سے زیادہ کا تصور نہین ہوسکتا،

صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِ وَبَرَكَاتُهُ

مغفرت کا طلبگار
سید سلیمان ندوی،

۱۲ جمادی الثانیہ
سنہ ۱۳۵۲ھ

ضمیمہ

سیرۃ النبیؐ جلد پنجم

اس جلد کے طبع سوم میں سید صاحب علیہ الرحمہ نے ایک آدھ جگہ ترمیم اور کہیں کہیں اضافے کیے تھے، ان مقامات کے مطالعہ کے وقت ان کو بھی سامنے رکھ لیں۔

ص ۵۸ سطر ۱۶ کے بعد:-

ان ارکان کی ترتیب جب کوئی حقیقت تین مرتب ارکان سے مرکب ہو اور ان میں سے ایک کا اول ہونا اور دوسرے کا سب سے موخر ہونا ثابت ہو جائے تو تیسرے کا وسط میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائیگا، چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام، رکوع اور سجود سے مرکب ہے اور قیام کا اول اور سجود کا آخر ہونا قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے ثابت ہے، تو رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائیگا

فَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ	جب تو ان میں ہے، تو ان کے لیے نماز کھڑی
الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ	کرے تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ کے
مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا	لوگ تیرے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ہتھیار
سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ	لیے رہیں، پھر جب یہ سجدہ کر لیں تو تمہارے
(نساء - ۱۵)	پیچھے چلے جائیں،

اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت میں پہلے کھڑا ہونا ہے، اور آخر میں سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوئی ہے، پس لامحالہ رکوع، قیام و سجود کے بیچ میں ہوگا، اور ہر رکعت کے ارکان سہ گانہ کی

ترتیب یہ ہوگی، اول قیام، پھر رکوع، پھر سجود،

ص ۱۶۳ سطر ۱۰ کے لفظ قیمتی پتھر[۱] پر حاشیہ :-

[۱] قیمتی پتھروں سے مراد جواہرات اور موتی وغیرہ ہیں، ان پر اس لیے زکوٰۃ نہیں ہے کہ اسلام نے ان کو صرف اسباب زینت قرار دیا ہے، فرمایا!

حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا (نحل وملائکہ) زینت جن کو تم پہنتے ہو،

یہ ایسے ہی ہیں جیسے بعض فقہا کے نزدیک سونے چاندی کے استعمالی زیوروں پر زکوٰۃ نہیں کہ یہ بھی ان کے نزدیک اسباب زینت میں ہیں، اب اگر کوئی شخص ہزاروں اور لاکھوں روپیے کے جواہرات جمع کرلے تو اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں، یا تو تجارت کے لیے ہیں، تو ان پر مال تجارت کی حیثیت سے ان کی قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی، دوسری یہ کہ کوئی بدنصیب زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اپنی دولت کو جواہرات کی صورت میں منتقل کرتا ہے، تو گو قانوناً اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کیجائے گی لیکن دیانۃً وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت گنہگار ہوگا، اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ محض سامان تعیش اور فخر و مباہات کے لیے جمع کرتا ہے، تو اس کی حالت وہی ہوگی، جو بیش قیمت لباسوں اور سامانوں کا ذخیرہ جمع کرنے والے اس کا شمار اسراف میں ہوگا، اور اس پر وعید ہے۔

اصل یہ ہے کہ جواہرات کی قیمت کی گرانی نقدین (یعنی سونے چاندی) کی طرح طبعی نہیں ہے بلکہ محض فرضی ہے، نہ وہ خود ضروریات زندگی میں ہیں، نہ ان سے ضروریاتِ زندگی کا مبادلہ یا خریداری معمولاً کیجاتی ہے، چند دولتمندوں کی طلب اور مانگ نے ان کی فرضی قیمت بنا رکھی ہے، اگر ان جواہرات کی آب جاتی رہی یا وہ ٹوٹ جائیں، یا ان میں بال پڑ جائے تو ان کی قیمت فوراً گر جائیگی بخلاف سونے چاندی کے کہ ان کی قیمت کی گرانی طبعی اسباب سے ہے، اور وہ ضروریاتِ زندگی کے لیے زرِ مبادلہ ہے، وہ بھی ٹوٹ جائے یا میلا بھی ہوجائے تو بھی اس کی قیمت ہر حال میں باقی ہے،

اور اسی لیے وہ معیار زرہیں۔

ص ۲۲۳ سطر ۱۹ کے لفظ ظرفِ زمانی کا حاشیہ :-

جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ثابت ہے،

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ — لوگ آپ سے پوچھتے ہیں، (پہلی رات کے چاند دن (ہلال) کے بارے میں، کہدیجئے کہ وہ لوگوں کو وقت اور حج کی تاریخ بتانے کے لیے ہے، (بقرہ - ۳۲) "س"

ص ۲۲۴ سطر ۱۱ سے ص ۲۲۵ سطر ۳ تک قلمزد ہے، اس کے بجائے یہ عبارت ہے:-

لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے، کہ وہاں موسم ٹھنڈا اور بارد بنایا ہے، تاکہ روزہ کی تکلیف دن کی مدت بڑھنے سے جو ہو سکتی تھی، وہ موسم کی برودت سے کم ہو جائے، چنانچہ انگلستان میں مجھے خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا اور بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

ص ۲۲۵ سطر ۳ کے بعد مستقل اضافہ :-

معذورین | جو لوگ حقیقت میں اس فریضۂ صیام کے ادا کرنے سے معذور ہوں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسانیاں رکھی ہیں، اسی لیے ارشاد ہے،

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ - ۲۳) — اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی تمہارے ساتھ نہیں چاہتا۔

۱؎ پہلے اور دوسرے اڈیشن میں اس موقع پر ان لوگوں کے لیے جو آئمہ مدت کے دن میں روزہ کے بجائے کفارہ ادا کرنے کی اجازت لکھی گئی تھی، وہ میری غلطی تھی جس سے میں رجوع کرتا ہوں۔ "س"

اس اصولی تمہید کے بعد مسافر اور بیمار کو رخصت عطا فرمائی ہے کہ رمضان کے کسی روزہ کے یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفع ہونے کے بعد قضا روزے کو پورا کرے،

بیمار کے دو معنی ہیں، یا تو وہ فعلاً بیمار ہو یا یہ کہ کسی مسلمان متقی طبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزہ رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا، یا بار بار کے تجربوں کے بعد شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے، تو اس کے لیے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضا کرے اور اس کے بجائے دوسرے مناسب موقع پر قضا رکھے۔ فرمایا

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (بقرہ-۲۳)

تو جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں روزہ کی گنتی پوری کرے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور آیت ہے جس کی تفسیر اور تاویل میں صحابہ ہی کے عہد سے اختلاف ہے، وہ آیت یہ ہے

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (بقرہ-۲۳) اور جن لوگوں کو روزہ کی طاقت ہو وہ فدیہ ادا کریں ایک مسکین کا کھانا۔

۱۔ بعض صحابہؓ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے، ان روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں، چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا ہر روزہ کی جگہ دیں، رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہو گئی،

۲۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یطیقونہ کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے، اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیۃً ادا کریں، بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے، جو رمضان کے بعد ہر مستطیع روزہ دار اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے،

(فوز الکبیر باب ناسخ و منسوخ)

۳۔ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے، اور یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جو روزوں سے معذور ہوں جیسے بڈھے اور حاملہ،

اصل یہ ہے کہ لفظ یطیقون کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ اطاقت کو وسعت کے معنی میں سمجھا گیا ہے، اور یطیقون کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ ایک مسکین کا کھانا دیدیں' تو اس ترجمہ کے مطابق یا تو نسخ ماننا پڑے گا اور یا آج کل کے بعض آزاد خیالوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں، وہ بھی روزہ کے بجائے فدیہ دے کر روزہ سے بچ سکتے ہیں؛ حالانکہ یہ صریح غلط ہے، اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ غرباء روزے رکھیں اور امراء فدیہ دے کر روزہ سے مستثنیٰ ہو جائیں، ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روا نہیں رکھی گئی ہے، اور اسلام کا تواتر عمل اسکے بالکل خلاف ہے، اور آیت مابعد کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے) کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاقت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کرسکنے کے ہیں، اس لیے یطیقون کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیدیں۔[۱]

---

[۱] اطاقہ طاقۃ کا باب افعال سے مصدر ہے، اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا، فعل بنانے کے لیے باب افعال مستعمل ہے، اور طاقۃ کے معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھے ہیں،

والطوق الطاقۃ ای اقصیٰ غایتہ وھو اسم لمقدار ما یمکن ان یفعلہ بمشقۃ منہ	طوق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی غایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی مشقت و مشکل کے ساتھ کرسکے۔

اطاقۃ کے اس معنی کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے، قرآن پاک میں ہے،

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ (بقرہ۔۴۰)	اے ہمارے پروردگار اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جسکی ہم کو طاقت نہیں۔

(باقی حاشیہ ص۳۷۴ پر)

اب روزہ کے سلسلہ میں معذوروں کی دو صورتیں ہوئیں، ایک یہ کہ یہ عذر ہنگامی اور عارضی ہو

جیسے مرض یا خوف مرض یا سفر تو ان کے لیے یہ آیت ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۳) "جس کی ہم کو طاقت نہیں" کے یہ معنی ہیں جس کی ہم کو وسعت نہیں یعنی جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے"،

کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جسکو وہ کر ہی نہیں سکتا، فرمایا،

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ - ۴۰)	اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا، لیکن اسی کا جو اسکی وسعت میں ہو۔

اس لیے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالیے جس کو ہم اٹھا ہی نہ سکتے ہوں، صحیح نہ ہوگا بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنی یہ ہوں گے جس کو ہم بہ مشکل اٹھا سکتے ہوں، اسی طرح طالوت کے لشکریوں کا یہ کہنا کہ

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ (بقرہ - ۳۳)	آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بمشکل مقابلہ کر سکتے ہیں، حدیثوں سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، ابوداؤد میں ہے:-

عن ابن جبیر عن ابن عباس "وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين" قال كانت رخصة للشيخ الكبير والمرأة الكبيرة وهما يطيقان الصيام ان يفطرا ويطعما مكان كل يوم مسكينا	ابن جبیر حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بہ مشکل رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے، فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے اجازت ہے کہ گو وہ دونوں بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلہ ایک مسکین کو

(باقی حاشیہ ص ۳۷۵ پر)

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ — تو جو تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسر

فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (بقرہ) — دنوں میں گنتی ہے۔

یعنی عذر کے وقت وہ روزہ نہ رکھے، اور اس چھوڑے ہوئے روزے کی گنتی دوسرے مناسب وقت قضا رکھ کر پوری کرلے، اسی میں حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) بھی داخل ہوگئی اگر حاملہ یا مرضعہ کو اپنی بیماری یا بچہ کی بیماری کا خوف ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھے، اور اس عذر کے دور ہونے کے بعد قضا رکھ لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائمی ہو، اور ناقابل ازالہ ہو، جیسے کوئی دائم المرض ہو، بہت ہی کمزور ہو، یا بہت بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتا ہو، تو وہ روزہ قضا کرے، اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دیدے، اس کے لیے یہ آیت ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ — اور ان پر جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۴) اس حدیث میں ظاہر ہے کہ یطیقان الصیام کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی، اسکے معنی یہی ہوں گے کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلا اڈیشن لکھتے وقت دوسرے علماء کی تائید مجھے مل نہیں سکی تھی، اب بحمد اللہ تائید بھی ہاتھ آگئی ہے، سرآمد علمائے اہل حدیث شارح عون المعبود، شرح ابی داؤد میں اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں، لکن مع شدۃ وتعب ومشقۃ عظیمۃ۔ اسی طرح محدثین حنفیہ کے سب سے وسیع النظر شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے متعدد تلامذہ نے اس کی تصدیق کی کہ شاہ صاحب کی یہی تحقیق تھی، فالحمد للہ۔

ان وجوہ سے "وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ" کا ترجمہ یہ نہ ہوگا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں، بلکہ یہ ہوگا کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

اور ظاہر ہے کہ جب بمشکل روزہ پر قادر ہو، اس کو فدیہ کی اجازت ہے، تو جو بالکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بالاولیٰ فدیہ کی اجازت ہوگی کہ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا،

ص ۲۲۸ سطر ۵ کے بعد اضافہ :-

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے اگر ان کو اپنی یا بچہ کی جان کا خطرہ ہو تو روزہ قضا کر کے دفع عذر کے بعد قضا رکھیں۔

ص ۲۸۷ سطر ۴ کے لفظ جاتے تھے[۱] پر حاشیہ :-

---

[۱] یہ تخمینہ میں نے اپنے پہلے سفر حج کے تجربہ کی بنا پر جو ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء میں کیا تھا، لگایا تھا، مگر اس کے ۲۴ برس بعد ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء میں جب دوبارہ حج کی توفیق ملی تو زمانہ کے اقتصادی تغیرات نے پچھلے تخمینہ کو یک قلم بدل دیا، اب ہر چیز کی قیمت گرانی کی طرف مائل ہے، جانوروں کی قیمت بھی چوگنی نظر آئی، بکری کی قیمت کم از کم سولہ سترہ روپئے، دنبہ کی قیمت تیس پینتیس روپئے، گائے بیل کی قیمت اسی سے سو تک، اور اونٹ کی ڈیڑھ دو سو تک نظر آئی، اب اس تخمینہ کی بنا پر ہر چیز کی قیمت چوگنی ہوگئی ہے۔

"س" ۲۰ محرم ۱۳۷۱ھ

دیگر مطبوعات دار المصنفین

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	سیرت النبی جلد اوّل	شبلی نعمانی	۲۰ روپے
۲۔	سیرت النبی جلد دوم	"	
۳۔	سیرت النبی جلد سوم	سید سلیمان ندوی	
۴۔	سیرت النبی جلد چہارم	"	
۵۔	سیرت النبی جلد پنجم	"	
۶۔	سیرت النبی جلد ششم	"	
۷۔	تاریخ فقہ اسلامی	عبد السلام ندوی	۲۸ روپے
۸۔	سیر الصحابیات	سید انصاری	۱۳ روپے
۹۔	اسوۂ صحابیات	عبد السلام ندوی	۷ روپے
۱۰۔	تاریخ اسلام اول تا چہارم	شاہ معین الدین ندوی	زیر طبع
۱۱۔	تاریخ دولتِ عثمانیہ دو جلد	ڈاکٹر محمد عظیم	"
۱۲۔	تاریخ اندلس	سید ریاست علی ندوی	"
۱۳۔	شعر العجم پانچ جلد	شبلی نعمانی	"
۱۴۔	اہل کتاب صحابہ و تابعین	حفیظ مجیب اللہ ندوی	"
۱۵۔	شعر الہند اول و دوم	عبد السلام ندوی	"
۱۶۔	اسوۂ صحابہ دو جلدیں	" "	"
۱۷۔	گل رعنا	عبد الحئی	"
۱۸۔	بزم صوفیہ	سید صباح الدین عبد الرحمن	"
۱۹۔	بزم تیموریہ	" "	"
۲۰۔	اقبال کامل	عبد السلام ندوی	"
۲۱۔	الفاروق	شبلی نعمانی	"
۲۲۔	المامون	"	"
۲۳۔	اسلام کا سیاسی نظام	اسحاق صندوسلی	"
۲۴۔	الغزالی	شبلی نعمانی	"
۲۵۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	سید صباح الدین عبد الرحمن	"
۲۶۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے	" "	"